عرب و ہند کے تعلقات

www.KitaboSunnat.com

مولانا سید سلیمان ندویؒ

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ (یوپی) ہند

بسم اللہ الرحمن الرحیم

معزز قارئین توجہ فرمائیں!

کتاب وسنت ڈاٹ کام پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب .....

- عام قاری کے مطالعے کے لیے ہیں۔
- مجلس التحقیق الاسلامی کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق واجازت کے بعد آپ لوڈ (Upload) کی جاتی ہیں۔
- دعوتی مقاصد کی خاطر ڈاؤن لوڈ، پرنٹ، فوٹو کاپی اور الیکٹرانک ذرائع سے محض مندرجات نشرواشاعت کی مکمل اجازت ہے۔

☆ تنبیہ ☆

- کسی بھی کتاب کو تجارتی یا مادی نفع کے حصول کی خاطر استعمال کرنے کی ممانعت ہے۔
- ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کے لیے استعمال کرنا اخلاقی، قانونی وشرعی جرم ہے۔

﴿اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر تبلیغ دین کی کاوشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں﴾

- نشرواشاعت، کتب کی خرید وفروخت اور کتب کے استعمال سے متعلقہ کسی بھی قسم کی معلومات کے لیے رابطہ فرمائیں۔

kitabosunnat@gmail.com
www.KitaboSunnat.com

عرب و ہند کے تعلقات

۱۹۲۹ء میں ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد
میں دیئے گئے خطبات کا مجموعہ

از

مولانا سید سلیمان ندویؒ

www.KitaboSunnat.com

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ

جملہ حقوق بحق دارالمصنّفین محفوظ

سلسلہ دارالمصنّفین: ۱۳۴

نام کتاب	:	عرب و ہند کے تعلقات
نام مصنف	:	مولانا سید سلیمان ندویؒ
صفحات	:	۲۶۸
سن اشاعت	:	۲۰۱۰ (جدید معیاری ایڈیشن)
ناشر	:	دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ
مطبع	:	معارف پریس، اعظم گڑھ
قیمت	:	۱۳۰/روپئے
باہتمام	:	عبدالمنان ہلالی

ISBN: 978-93-80104-50-8

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY

P.O.Box. No: 19 Shibli Road, Azamgarh

email: shibli_academy@rediffmail.com

email: info@shibliacademy.org

Website: www.shibliacademy.org

فہرست مضامین

مضمون	صفحہ
پہلا باب ۱۔۳۳	
تعلقات کا آغاز اور ہندوستان کے	۱
عرب سیاح	
لفظ ہند	۱۰
ہندوستان پر عربوں کے حملے	۱۱
سندھیوں کی شکست کا راز	۱۵
ہندوستان کے عرب سیاح اور جغرافیہ	۱۹
نویسی	
ابن خرداذبہ سنہ ۲۵۰ھ	//
سلیمان تاجر سنہ ۲۳۷ھ	۲۰
ابوزید حسین سیرافی سنہ ۲۶۴ھ	۲۵
ابودلف مسعر بن مہلہل ینبوعی	۲۷
سنہ ۳۳۱ھ	
مسعودی سنہ ۳۰۳ھ	۲۸
اصطخری سنہ ۳۴۰ھ	۳۰
ابن حوقل سنہ ۳۳۱ھ۔۳۵۸	۳۰
بشاری مقدسی سنہ ۳۷۵ھ	۳۱
البیرونی سنہ ۴۰۰ھ	۳۲
ابن بطوطہ سنہ ۷۷۹	//
دوسرے مؤرخین اور جغرافیہ نویس	//
دوسرا باب ۳۴۔۷۱	
تجارتی تعلقات	۳۴
بندرگاہ اُبلہ	۳۸
قیس	۴۱
ہندوستان کی بندرگاہیں	۴۲
دریائی تجارتی راستے	//
یورپ اور ہندوستان کے تجارتی راستے	۴۵
سلطنت عرب ہوکر	
روسی تاجر	۴۶
خراسان سے ہندوستان کا کارواں	//
ہندوستان کے بحری سفر کا زمانہ	۴۷
عرب میں جہاز رانی کے بعض ہندی	//
الفاظ	
ہندوستانی پیداوار اور بیوپار	۴۹

الایجی	۵۱
لغت عربی کی قدیم شہادت	۵۲
قرآن پاک میں تین ہندی لفظ	۵۴
تورات کی شہادت عربوں کی ہندوستان تجارت کی قدامت پر	۵۵
ہندوستان کی پیداوار اور بیوپار عرب سیاحوں کی نظر میں	//
ہندوستان کی بحری درآمد	۶۰
کیا اہل ہند بھی جہاز راں تھے؟	۶۱
بحر ہند کے جہازات	۶۴
بحری تجارت کی دولت	۶۵
ہندوستان کی سیاہ مرچیں اور یورپ	۶۹
ایک عرب ہندوستانی کا وطنی گیت	//
تیسرا باب ۷۱۔۱۲۶	
ماخذ	۷۱
جاحظ	//
یعقوبی	۷۲
محمد بن اسحاق معروف بہ ابن الندیم	//
ابوریحان بیرونی	//
قاضی صاعد اندلسی	۷۳
ابن ابی اصیبعہ موفق الدین	//
علامہ شبلی نعمانی	//
علمی تعلقات کا آغاز	۷۴
برامکہ	۷۴
برامکہ کون تھے	۷۵
مسعودی کا بیان	۷۹
ابن الفقیہ کا بیان	//
یاقوت کا بیان	۸۰
قزوینی کا بیان	//
وہار بودھ	۸۱
سنسکرت سے ترجمہ کا آغاز	۸۹
عربوں میں ہندوستان کی وقعت	۹۰
پنڈتوں اور ویدوں کے نام	۹۳
منکہ یا منکا	۹۴
صالح بن بہلہ	۹۴
ابن دہن	//
حساب	۹۵
نجوم اور ہیئت	۹۷
عربی میں سنسکرت اصطلاحات	۱۰۰
ہندو اور موجودہ تحقیقات	۱۰۳
طب	//
طبی کتابوں کے ترجمے	۱۰۴
بیطاری	۱۰۷
نجوم، جوتش جفر اور رمل	//
سانپوں کا علم	۱۰۹

زہروں کا علم	۱۰۹
موسیقی	۱۱۰
مہابھارت	//
سیاست جنگ اور راجنیت	۱۱۱
کیمیا	//
حدود منطق	//
معانی و بیان	۱۱۲
منتر، کرتب اور جادو	//
کہانی اور افسانے	۱۱۳
اخلاق و حکمت	۱۱۴
پروفیسر زخاؤ کی غلطی	۱۱۶
تنوخی	۱۱۸
بیرونی	۱۱۹
سنجیدہ کھیل	۱۲۴
چوتھا باب ۱۲۷_۱۶۵	
ماخذ	۱۲۷
عرب اور ترک وافغان اور مغل فاتحوں میں فرق	۱۲۸
عرب فاتحوں کے نزدیک ہندو مشابہ اہل کتاب تھے	۱۳۲
ہندو مذہب کی تحقیقات	۱۳۷
برہمن اور سمنی، براہیم اور خضر پیغمبر	۱۴۴
اسلام کا ایک ادب شناس	

ہندو راجہ	۱۴۵
سمنیہ کی تحقیق	۱۴۶
سمنیہ کے اصول	۱۴۷
بودھ مت کی وسعت	۱۵۰
بھکشو	//
جوگی	۱۵۱
سمنیہ اور حصریہ	۱۵۲
محمرہ	۱۵۴
بودھ اور بت	//
سسلی کا بت ہندوستان میں	//
عرب و ہند کا ایک متحدہ مقدس مقام	۱۵۵
ہندوستان میں اسلام	۱۵۶
پنجاب یا سرحد کے ایک راجہ کا اسلام	//
عربوں اور ہندوؤں میں مذہبی مناظرہ	۱۵۷
ایک مناظر راجہ	۱۵۸
بودھوں سے ایک اور مناظرہ	۱۵۹
ایک مسلمان کا بت پرست ہو جانا	//
قرآن پاک کا پہلا ہندی ترجمہ آج سے ایک ہزار برس پہلے	//
ایک گجراتی راجہ کا بے مثال مذہبی انصاف	۱۶۰
مسلمانوں میں وحدۃ الوجود	۱۶۳

ہندوؤں کی وحدت تنزیہی	۱۶۵
خاتمہ	//

پانچواں باب ۱۶۶۔۲۵۸

ہندوستان میں مسلمان فتوحات سے پہلے	۱۶۶
ماخذ	//
چچ نامہ	//
تاریخ معصومی	//
تاریخ طاہری	۱۶۷
بیگ قرنامہ	//
تحفہ الکرام	//
مسلمانوں کا پہلا مرکز سراندیپ	۱۷۱
دوسرا مرکز مالدیپ	۱۷۴
تیسرا مرکز ملیبار	۱۷۵
کولم	۱۷۷
چوتھا مرکز معبر یا کارومنڈل	//
ہندو راجہ کے لیے مسلمانوں کی مسلمانوں سے لڑائی	۱۸۰
الیٹ صاحب کی غلطی	۱۸۱
پانچواں مرکز گجرات	//
ہنرمند	۱۸۲
صیمور میں دس ہزار کی آبادی	۱۸۳
بیسر	۱۸۴
تھانہ میں	۱۸۴
کھمبایت میں	۱۸۵
کھمبایت سے چیمور تک چوتھی صدی میں	//
کھمبایت سے کارومنڈل تک آٹھویں صدی ہجری میں	۱۸۶
کھمبایت	//
گاوی اور گندھار	۱۸۷
بیرم	//
گوگہ	۱۸۸
چندا پور	//
ہنور	//
ملیبار	۱۸۹
ابی سرور	۱۹۰
پاکنور	//
منگلور	//
ہیلی	۱۹۱
جربٹن	//
دہ پٹن	۱۹۲
بدھ پٹن	//
پندارانی	۱۹۳
کالی کٹ	//
کولم	۱۹۴

چالیات	۱۹۵	بادشاہ کی جنگی قوت	۲۲۳
مالدیپ	//	منصورہ کی علمی اور مذہبی حالت	//
سیلون	//	زبان	۲۲۴
کالی	//	منصورہ کا خاتمہ	//
معبر (کارومنڈل)	//	کیا منصورہ والے بھی قرمطی	
دوار سمندر	۱۹۶	اسماعیلی تھے	۲۲۶
بیجانگر	//	دروزی خط	//
چھٹا مرکز سندھ	۱۹۷	ہباری خاندان کی ایک زندہ جاوید	
ملتان	۱۹۸	یادگار	۲۲۸
بنوسامہ کون تھے	۱۹۹	سندھ غزنویوں اورغوریوں اور	
بنوسامہ	۲۰۰	سلاطین دہلی کے ہاتھ میں	۲۲۹
ملتان سے قرامطہ	۲۰۴	سومری	۲۳۰
فرمانروایان ملتان کا سلسلہ	۲۱۰	سومرہ کا مذہب	۲۳۲
ملتان کا ہندی اسلامی تمدن	۲۱۳	سومرہ کی قومیت	۲۳۴
منصورہ	۲۱۵	عربی ہندی مخلوط تھے	۲۳۶
منصورہ کا بانی	۲۱۶	خالص راجپوت نہ تھے	//
بنا کا زمانہ	//	یہودی نہ تھے	۲۳۷
جائے وقوع	//	سومری بادشاہ	۲۳۸
منصورہ پایہ تخت	۲۱۷	سومروں کا خاتمہ	۲۳۹
سندھ دور خلافت عباسیہ میں	۲۱۸	نئی تحقیقات کی ضرورت	۲۴۰
سندھ کا ہباری قریشی خاندان	۲۱۹	یہ صلح کس طرح ہوئی؟	۲۴۴
شہر منصورہ کی آبادی اور وسعت	۲۲۲	سمہ بادشاہوں کے نام	//
مملکت منصور کی وسعت اور سرسبزی	//		

سمہ قوم کا مذہب	۲۴۶	ویہند	۲۵۴
شیخ الاسلام بہاء الدین زکریا اور		قنوج	۲۵۵
سید جلال الدین بخاری	۲۴۸	نیرون	۲۵۶
سندھ اور اطراف سندھ کے دوسرے		مکران	۲۵۷
شہر	۲۵۱	مشکی	//
دبیل یا ٹھٹھ	//	کشمیر	//
عسیفان	۲۵۲	خلاصہ	۲۵۸
تنبلی	//	ضمیمہ ۲۵۹_۲۶۱	
بوقان	//	سوپارہ	۲۵۹
قصدار	۲۵۳	جاٹ طیب عرب میں	۲۶۱
طوران	۲۵۴	سندھ کے شاہانہ جوتے	۲۶۱

گجرات اور سندھ کا دنیا میں سب سے پہلا نقشہ

(ابن حوقل بغدادی نے ۳۴۳ھ سنہ ۹۵۱ء میں تیار کیا)

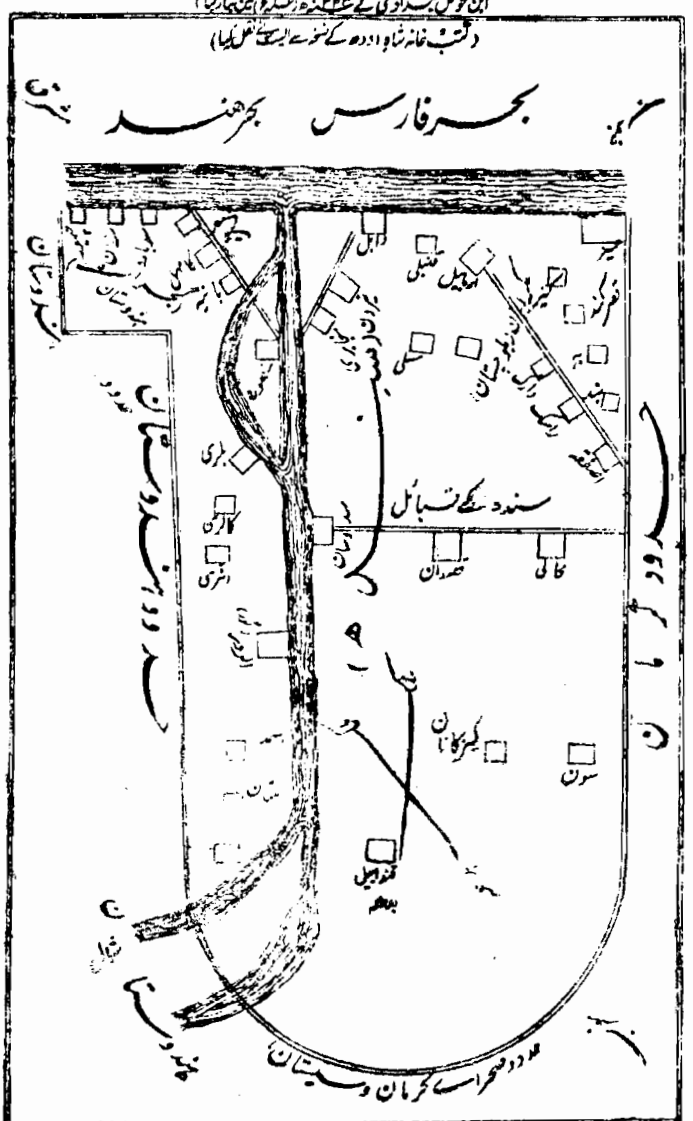

برائے کتاب عرب و ہند

پہلا باب

عرب و ہند کے تعلقات

تعلقات کا آغاز اور ہندوستان کے عرب سیاح

عرب اور ہندوستان دونوں ملک دنیا کی دو عظیم الشان قوموں کی مذہبی تیرتھ اور عبادت گاہ ہیں اور دونوں اپنی اپنی جگہ پر اپنی اپنی قوموں کے نزدیک پاک اور مقدس ہیں ۔ اس مسئلہ میں بہت سے اختلافات ہیں کہ ہندوستان کے اصلی باشندے کون ہیں؟ آریہ قوم کا دعویٰ تو آپ نے سنا ہوگا، مگر کیا عربوں کا پرانا دعویٰ بھی آپ نے سنا ہے؟ آریہ قوم اس ملک میں چند ہزار برس گذرے ہوں گے کہ ایشیائے وسطیٰ سے پنجاب میں وارد ہوئی اور پھر آگے بڑھ کر گنگا جمنا کے دوآبہ میں پھیل گئیں ۔ مگر اہل عرب کا دعویٰ یہ ہے کہ ہندوستان سے ان کا تعلق صرف چند ہزار برس کا نہیں بلکہ پیدائش کے شروع سے یہ ملک ان کا ''پدری وطن'' ہے ۔

حدیثوں اور تفسیروں میں جہاں حضرت آدمؑ کا قصہ ہے وہاں متعدد روایتوں سے یہ بیان آتا ہے کہ حضرت آدم جب آسمان کی جنت سے نکالے گئے تو اسی زمین کی ''جنت'' میں جس کا نام ''ہندوستان جنت نشان'' ہے اتارے گئے ۔ سراندیپ (لنکا) میں انہوں نے پہلا قدم رکھا جس کا نشان اس کے ایک پہاڑ پر موجود

ہے۔ابن جریر، ابن ابی حاتم اور حاکم [۱] میں ہے کہ ہندوستان کی اس سرزمین کا نام جس میں حضرت آدم اترے ''دجناء'' ہے۔ کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ ''دجناء'' ہندی کا ''دکھنا'' ہے۔ یا ''دکھن'' ہے جو ہندوستان کے جنوبی حصہ کا مشہور نام ہے؟ اور چوں کہ عرب کے ملک میں متعدد قسم کی خوشبوئیں اور مسالے اس جنوبی ہند سے جاتے تھے اور پھر عربوں کے ذریعہ وہ تمام دنیا میں پھیلتے تھے اس لئے ان کا بیان ہے کہ یہ چیزیں ان تحفوں کی یادگاریں ہیں جو حضرت آدم اپنے ساتھ جنت سے لائے تھے۔ ان تحفوں میں سے چھوہارے کے سوا دو پھل یعنی لیموں اور کیلے ہندوستان ہی میں موجود ہیں۔ ایک اور روایت میں ہے کہ امرود بھی جنت ہی کا میوہ تھا جو ہندوستان میں پایا جاتا ہے۔

ایک روایت میں ہے کہ جنت سے چار دریا نکلے ہیں، نیل، فرات جیحون اور سیحون۔ نیل تو مصر کا دریا ہے جس پر مصر کی زراعت کا دار و مدار ہے۔ اس طرح فرات کی جو اہمیت عراق کی سرسبزی و شادابی کے لئے ہے وہ ظاہر ہے۔ جیحون ترکستان کا دریا ہے اور ترکستان کے لئے اس کی وہی حیثیت ہے جو نیل و فرات کی مصر و عراق میں ہے اور سیحون کے متعلق ہے کہ ہندوستان کے دریا کا نام ہے۔ کیا جنت کے اس چوتھے دریا کو ''گنگا'' سمجھا جائے؟ بعض لوگوں نے اس کو دریائے سندھ قرار دیا ہے۔

میر آزاد بلگرامی نے سبحۃ المرجان فی آثار ہندوستان میں کئی صفحے ہندوستان کے ان فضائل کے بیان کے نذر کئے ہیں اور اس میں یہاں تک کہا کہ جب آدم سب سے پہلے ہندوستان اترے اور یہاں ان پر وحی آئی تو یہ سمجھنا چاہئے کہ یہی وہ ملک ہے

---

[۱] تفسیر درمنثور سیوطی جلد اول ص ۵۵۔ مصر میں یہ اور اس کے بعد کی روایتیں موجود ہیں ساتھ سبحۃ المرجان فی تاریخ ہندوستان کا یہ پہلا باب پڑھنا چاہئے۔

جہاں خدا کی پہلی وحی نازل ہوئی اور چوں کہ نور محمدی حضرت آدم کی پیشانی میں امانت تھا اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ کا ابتدائی ظہور اسی سرزمین میں ہوا۔ اسی لئے آپ نے فرمایا کہ ''مجھے ہندوستان کی طرف سے ربانی خوشبو آتی ہے''۔ یہ تمام روایتیں فن حدیث کے لحاظ سے بہت کم درجہ پر ہیں، تاہم ان سے اتنا ثابت ہوتا ہے کہ یہ جو عام طور سے سمجھا جاتا ہے کہ مسلمانوں کا تعلق ہندوستان سے محمود غزنوی کے فتوحات کے سلسلہ میں ہوا اور وہ اس کے بعد یہاں آکر آباد ہوئے یہ کس قدر غلط ہے۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ وہ اس ملک کو اپنا مفتوحہ ملک نہیں بلکہ اپنا موروثی پدری وطن سمجھتے ہیں اور جو نہیں سمجھتے ہیں ان کو سمجھنا چاہئے۔ خیر یہ تو تاریخ کی یاد سے پہلے کی باتیں ہیں۔ اگر تاریخی نظر سے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ وہ محمود سے سینکڑوں برس پہلے ہندوستان آچکے تھے اور جگہ جگہ ان کی نوآبادیاں قائم تھیں۔

اسلام کے بعد عربوں اور مسلمانوں میں نسبی حیثیت سے سب سے بڑا درجہ سادات یعنی سیدوں کا ہے۔ موجودہ سادات خاندانوں کا بہت بڑا حصہ حضرت امام حسین کے صاحبزادے حضرت امام زین العابدین کی نسل سے ہے۔ حضرت زین العابدین کی ماں عرب نہ تھیں۔ ایرانیوں کا دعویٰ ہے کہ وہ ایرانی تھیں اور خاندان شاہی سے تھیں۔ مگر مؤرخوں میں سے بعض نے ان کو سندھ کی بتایا ہے [۱] اگر یہ اخیر قول صحیح ہو تو اس کے ماننے میں کیا عذر ہو سکتا ہے کہ عرب و اسلام کے سب سے شریف و مقدس خاندان کے پیدا کرنے میں ہندوستان کا بھی حصہ ہے؟ اور یہ کہنا بھی صحیح ہوگا کہ اور مسلمان ہوں یا نہ ہوں مگر سادات آل زین العابدین علی ہمیشہ سے نیم ہندوستانی ہیں۔

شمالی ہندوستان میں درۂ خیبر سے آنے والے مسلمان ترکوں اور افغانوں کا

---

[۱] دیکھو کتاب المعارف ابن قتیبہ اور ابن خلکان تذکرہ علی بن حسین زین العابدین رضی اللہ عنہما (+ سنہ ۹۴ھ)

زمانہ چوتھی صدی ہجری کا آغاز ہے چنانچہ محمود نے لاہور سنہ ۴۱۸ھ میں فتح کیا۔ لیکن جنوبی ہندوستان ملیبار اور کارومنڈل سے گجرات تک کا علاقہ اس کے سیکڑوں برس بعد تک بھی مسلمانوں کے قبضہ میں نہیں آیا۔ گجرات سلطان علاؤالدین خلجی نے سنہ ۱۲۹۷ء میں فتح کر کے دلی کے مقبوضات میں شامل کیا اور مدراس کی طرف صرف ایک دفعہ سلطان علاؤالدین کی فوجوں نے اسی زمانہ میں ملیبار اور کارومنڈل کے ساحل تک عبور کیا تھا۔ لیکن وہ فتح ناپائدار تھی اور بعد کو بیجانگر کی دیوار نے صدیوں تک افغانوں اور مغلوں کو آگے بڑھنے نہیں دیا۔ دکن کی بہمنی سلطنت کی پوری زندگی بیجانگر کے ساتھ لڑائی جھگڑوں میں کٹی مگر کرشنا سے آگے وہ کسی طرح نہ بڑھ سکی۔ البتہ بہمنی سلطنت کی راکھ سے جو پانچ شعلے اٹھے انہوں نے بڑی مشکل سے سنہ ۱۵۶۵ء میں اس کو جلا کر بے نام ونشان کیا۔ پھر بھی چھوٹی چھوٹی ہندو ریاستیں عالم گیر کے زمانہ تک قائم رہیں۔ ارکات، میسور اور مدراس کے علاقوں پر انہوں نے یوں ہی اچٹتا سا قدم رکھا۔ لیکن ان میں سے کوئی بھی دیر تک وہاں جم نہ سکا۔

اس پیمایش سے میرا مقصد یہ ہے کہ میں دکھاؤں کہ ہندوستان کے کن علاقوں پر درۂ خیبر سے اٹھنے والی موجوں کا براہ راست یا بالواسطہ اثر کب پڑا اور ہمارے مضمون کا تعلق ہندوستان کے کس علاقہ سے کس وقت تک ہے۔

پنجاب	سنہ ۴۱۴ھ ۱۰۲۳ء
سندھ	سنہ ۵۸۲ھ ۱۱۸۶ء
دہلی، قنوج، اودھ، بنارس	سنہ ۵۸۹ھ ۱۱۹۳ء
بہار و بنگال	سنہ ۹۵_۵۹۳ھ ۹۹_۱۱۹۵ء
دکن (دیوگیر)	سنہ ۶۹۳ھ ۱۲۹۴ء

گجرات	سنہ ۶۹۷ھ ۱۲۹۷ء
مہاراشٹر، مدراس	سنہ ۷۱۲ھ ۱۳۱۲ء

اس لیے عربوں اور ہندوؤں کے باہمی تعلقات کی تشریح میں ہر صوبے کے متعلق اس کے خیبر سے آنے والی قوموں کے ہاتھوں سے مفتوح ہونے تک ہم اس کے حالات بیان کر سکتے ہیں۔

ہندوستان اور عرب دنیا کے وہ ملک ہیں جو ایک حیثیت سے ہمسایہ اور پڑوسی کہے جا سکتے ہیں۔ ان دونوں کے بیچ صرف سندھ حائل ہے جس کی سطح پر ایسی وسیع اور لمبی چوڑی سڑکیں نکلی ہیں جو ایک ملک کو دوسرے سے باہم ملاتی ہیں۔ یہ دونوں ملک ایک سمندر کے دو آمنے سامنے کے خشکی کے کنارے ہیں۔ اس جل تھل سمندر کا ایک ہاتھ اگر عربوں کے ارض حرم کا دامن تھامے ہے تو اس کا دوسرا ہاتھ ہندوؤں کے آریاورت کے قدم چھوتا ہے۔ دریا کنارے کے ملک فطرۃً تجارتی ہوتے ہیں۔ یہی پہلا رشتہ ہے جس نے ان دونوں قوموں کو باہم آشنا کیا۔ عرب تاجر ہزاروں برس پہلے سے ہندوستان ساحل تک آتے تھے اور یہاں کے بیوپار اور پیداوار کو مصر اور شام کے ذریعہ یورپ تک پہنچاتے تھے اور وہاں کے سامان کو ہندوستان، جزائر ہند، چین اور جاپان تک لے جاتے تھے۔

عربوں کا راستہ یہ تھا کہ وہ مصر و شام کے شہروں سے چل کر خشکی خشکی بحر احمر (ریڈ سی) کے کنارے کنارے حجاز کو طے کر کے یمن تک پہنچتے تھے اور وہاں سے بادبانی کشتیوں پر بیٹھ کر کچھ تو افریقہ اور حبشہ کو چلے جاتے تھے اور کچھ وہیں سے سمندر کے کنارے کنارے حضرت موت، عمان، بحرین اور عراق کے کناروں کو طے کر کے خلیج فارس کے ایرانی ساحلوں سے گذر کر یا تو بلوچستان کی بندرگاہ تیز میں اتر پڑتے

تھے یا پھر آگے بڑھ کر سندھ کی بندرگاہ دیبل (کراچی) میں چلے آتے تھے، اور پھر اور آگے بڑھ کر گجرات اور کٹھیاوار کی بندرگاہ تھانہ (بمبئی) کھمبایت چلے جاتے تھے، پھر آگے بڑھتے تھے اور سمندر سمندر کالی کٹ اور راس کماری پہنچتے تھے، اور پھر کبھی مدراس کے کسی کنارے پر ٹھہرتے تھے اور کبھی سراندیپ، انڈمان ہو کر پھر سیدھے مدراس کی مختلف بندرگاہوں پر چکر لگاتے ہوئے خلیج بنگال میں داخل ہو جاتے تھے اور بنگال کی ایک دو بندرگاہوں کو دیکھتے ہوئے برہما اور سیام ہو کر چین چلے جاتے تھے اور پھر اسی راستہ سے لوٹ آتے تھے۔

الغرض اس نقشہ سے معلوم ہوگا کہ ان کے جہازات ہندوستان کے تمام دریائی شہروں اور جزیروں میں برابر چکر لگایا کرتے تھے اور تاریخ کی یاد سے پہلے سے ان کی مسلسل آمد و رفت جاری تھی۔

دنیا کی پہلی دریائی تاجر قوم کا نام فنیشین ہے، یہ یونانی نام ہے، عبرانی میں ان کا نام کنعانی ہے اور آرامی بھی ان کو کہتے ہیں۔ اہل عرب ان کو آدم کہتے ہیں اور یہی نام قرآن پاک میں ہے **عاد**، **ارم ذات العماد** ''بڑے بڑے ستونوں اور عمارتوں والے **عاد ارم**'' اور اسی مناسبت سے عربی تخیل کے ذریعہ سے ''بہشت ارم'' ہماری زبان میں بھی بولتے ہیں۔

یہ کون قوم تھی؟ محققین کا بیان ہے کہ یہ عرب تھے جو ساحل بحرین کے پاس سے اٹھ کر شام کے ساحل پر جا بسے تھے۔ بحرین گویا مشرق میں مشرقی ملکوں کی بندرگاہ ان کی تھی، اور تا ئر شام میں بحر روم (میڈیٹرینین سی) کے کنارہ ان کی مغربی بندرگاہ تھی جہاں سے وہ یونان کے جزیروں میں اور یورپ کے شہروں اور شمالی افریقہ کے کناروں تک چلے جاتے تھے اور ادھر مشرق میں وہ ایران، ہندوستان اور چین تک کی

خبر لیتے تھے۔ اسی قوم کے ذریعہ سے یونان میں تہذیب وتمدن کا آغاز ہوا اور شمالی افریقہ کے کنارے کارتھج کی بنیاد پڑی۔ لیکن انکے جو اثرات مشرقی ملکوں میں پڑے ان کا پورا اندازہ نہیں لگایا گیا ہے۔ یہ سب کو معلوم ہے کہ ہندوستان کی تمام تحریریں بلکہ تمام آرین تحریریں بائیں طرف سے لکھی جاتی ہیں، لیکن اس آریاورت کی ابتدائی تحریریں حیرت سے سنا جائے گا کہ سامی طرز تحریر کی طرح داہنی طرف سے شروع ہوتی تھیں۔ علاوہ اس کے گنتی کے لکھنے کا طریقہ بھی اسی تاجر قوم سے شاید سیکھا گیا تھا۔ انسائکلو پیڈیا برٹانیکا (طبع ۱۱) کے مضمون سنسکرت کا لکھنے والا یہاں کی ابتدائی تحریر کی تاریخ ان الفاظ میں بیان کرتا ہے:

''ہندوستانی حروف کی ابتداء کا مسئلہ ابھی شکوک سے گھرا ہوا ہے، ہندوستانی تحریر کے قدیم ترین نمونے وہ کتبات ہیں جو چٹانوں پر کندہ ہیں۔ یہ پالی زبان (وہ پراکرت جو جنوبی بودھ مذہبی تحریروں کے لئے استعمال کی جاتی تھی) کے وہ مذہبی احکام ہیں جن کو سنہ ۱۔۲۵۳ ق م میں موریہ خاندان کے شہنشاہ اشوک نے کندہ کرایا تھا اور یہ شمالی ہند میں شمالی مغربی سرحد پر پشاور کے مضافات اور گجرات میں کرنار سے لے کر مشرقی ساحل پر، کٹک کے ضلع میں، جو کادہ اور دھولی تک پھیلے ہوئے ہیں، انتہائے مغرب کے وہ کتبات جو کپوردا گدھی یا شہباز گدھی اور منصورہ کے قرب و جوار میں ہیں دوسرے کتبات کے حروف تہجی سے بالکل جداگانہ حروف میں لکھے گئے ہیں۔ وہ داہنی جانب سے بائیں جانب پڑھے جاتے ہیں ان کو عموماً ''آرین پالی'' کہا جاتا ہے، یہ حروف یونانی اور ایرینیا کے ہندی ستھین حکمرانوں کے سکوں میں بھی استعمال کئے گئے ہیں،

رہے دوسرے حروف جو بائیں جانب سے داہنی جانب پڑھے جاتے ہیں ''ہندی پالی'' حروف کہلاتے ہیں ۔ مقدم الذکر نے جن کو کھورروشتی (خروشتی) یا کندھارا (لپی) حروف بھی کہا جاتا ہے اور جو بظاہر کسی سامی (اور شاید آرامی) زبان سے ماخوذ ہیں، ہندوستان کی بعد کی تحریروں میں کوئی اثر نہیں چھوڑا ہے ۔ دوسری طرف ہندی پالی (یا براہمی) حروف جن سے موجودہ ہندوستانی حروف ماخوذ ہیں بہت زیادہ مشکوک الاصل ہیں اور اگر چہ اشوک کے وقت تک اس خط نے بہت زیادہ ترقی کر لی تھی اور اس کو علمی مقاصد میں حیرت انگیز طور پر استعمال کیا جانے لگا تھا تاہم اس کے بعض حروف کا قدیم فینیقی حروف سے (جو شاید خود مصری ہیروفلیفی خط سے ماخوذ تھے) تشابہ یہ خیال پیدا کرتا ہے کہ شاید یہ بھی سامی الاصل ہوں ۔ اس کے اپنے ملک میں روشناس ہونے کے وقت اور ذریعہ کا پتہ شاید اب کبھی بھی نہ چلے ۔ بہر حال پروفیسر بولر (Prof. Buhler) نے یہ نظریہ پیش کیا ہے کہ شاید عراق کے تاجروں نے آٹھویں صدی ق م میں ان حروف کو یہاں روشناس کرایا ہو ۔ تاہم موریہ اور اندھرا کتبات میں ان حروف نے جو مکمل شکل اختیار کر لی ہے اور جس وسیع خلقہ میں وہ پھیلے ہوئے ہیں ان چیزوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس کے تسلیم کرنے میں کسی قسم کے شک و شبہہ کی گنجایش نہیں ہے کہ ہندوستان میں اشوک کے بہت پہلے فن کتابت کا مختلف اغراض و مقاصد کے لئے استعمال ورواج موجود تھا ۔ یہ واقعہ کہ اس عہد کے ادبیات میں تحریر کا کہیں بھی ذکر نہیں ہے شاید اس بنا پر ہو کہ برہمن اپنی مقاصد تصانیف کو ضبط تحریر میں لانا پسند نہیں کرتے تھے ۔

''اب رہا ہندوستان میں اعداد کا سوال تو عیسوی سنہ کے ابتدائی دور میں خورشتی کتبات میں جو طریقہ ہے وہ یہ ہے کہ ابتدائی تین عدد لکیروں کے ذریعہ سے ظاہر کئے جاتے ہیں۔۴ ایک جھکے ہوئے کراس (صلیب) کی طرح ہے، اور ۵۔۹ تک اس طرح: ۴(+)۱ وغیرہ تا ۴(+)۴(+)۱۔اس کے علاوہ ۱۰، ۲۰ اور ۱۰۰ کے لئے خاص اعداد ہیں اور باقی دہائیوں کو دس ملا کر یوں لکھا جاتا ہے۔مثلاً ۵۰(+)۲۰(+)۱۰۔اس طریقہ کے متعلق ثابت ہو چکا ہے کہ یہ سامی اور شاید ارامی ہے۔ براہمی کتبات میں چھٹی صدی عیسوی تک ایک دوسری قسم کے اعداد استعمال کئے گئے ہیں۔ایک سے ۳ تک کے لئے آڑی لکیریں ہیں پھر ۴۔۹ تک اکائیوں اور ۱۰، ۹۰، ۱۰۰ اور ۱۰۰۰ کے لئے خاص علامات ہیں۔یہ طریقہ بہت ممکن ہے کہ مصر سے ماخوذ ہو اور کسور اعشاریہ کے لئے یہ طریقہ جو سب سے پہلے گجرات کے کتبہ میں ملتا ہے شاید یہیں کے منجمین یا ریاضی دانوں کی ایجاد ہو۔''

لیکن اس سے بھی زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ مہابھارت کے زمانہ میں بھی ہندوستان میں ایسے لوگ تھے جو عربی زبان سے واقف تھے۔گو مشکل سے اس کا یقین آسکتا ہے تاہم چوں کہ ایک بڑے پنڈت نے اس کو مانا ہے۔اس لئے مجھے اس کے انکار کی جرأت نہیں، ''ستیارتھ پرکاش'' کے مصنف سوامی دیانند جی نے گیارہویں سملاس (پہلا پرواد ھیایہ للاس ۱۴۷) میں لکھا ہے کہ ''مہابھارت میں جب کوروؤں نے لاکھ کا گھر بنا کر پانڈوؤں کو اس کے اندر جلا کر پھونک دینا چاہا تو ودر جی نے یدھشٹھر کو عربی زبان میں بتایا اور یدھشٹھر جی نے اسی عربی زبان میں ان کو جواب دیا''۔اگر یہ

بیان صحیح ہے تو عربوں اور ہندوؤں کا رشتہ کتنا پرانا ثابت ہوتا ہے۔

عربوں اور ہندوؤں کے درمیان تعلقات کا ایک اور ذریعہ بھی تھا۔ اس کی صورت یہ تھی کہ شہنشاہ ایران کا قبضہ بلوچستان اور سندھ پر اکثر رہا۔ اس قبضہ کے تعلق سے سندھ کے بعض جنگجو قبیلوں کے فوجی دستے ایرانی فوج میں داخل تھے۔ ان جنگجو قبیلوں میں سے دو کا ذکر عربوں نے کیا ہے اور وہ جات (زط) اور میذ ہیں۔ یہ دونوں سندھ کی مشہور قومیں تھیں۔ ایک حدیث میں ہے کہ عبداللہ بن مسعود صحابی نے آنحضرت ﷺ کے ساتھ ایک خاص شکل وصورت کے لوگوں کو دیکھا تھا جن کی نسبت انہوں نے یہ بتایا کہ ''ان کا چہرہ جاٹوں کی طرح تھا''[1]۔ اس سے معلوم ہوگا کہ اہل عرب چھٹی صدی عیسوی میں بھی جاٹوں سے واقف تھے۔ ایرانیوں کو جب شکست ہوئی تو یہ بہادر جاٹ ہوا کا رخ دیکھ کر چند شرطوں کے ساتھ مسلمانوں کے لشکر سے آ کر مل گئے۔ سپہ سالار اسلام نے ان کی بڑی عزت کی اور ان کو اپنے قبیلے میں داخل کر لیا۔ حضرت علی نے جنگ جمل کے موقع پر بصرہ کا خزانہ انہیں جاٹوں کی نگرانی میں چھوڑا تھا [2]۔ امیر معاویہ نے ان کو رومیوں کے مقابلہ کے لئے شام کے ساحلی شہروں میں لے جا کر بسایا اور ولید بن عبدالملک نے اپنے زمانہ میں ان کو انطاکیہ میں لے جا کر آباد کیا۔ [3]

لفظ ہند

مسلمانوں کی آمد سے پہلے اس پورے ملک کا کوئی ایک نام نہ تھا۔ ہر صوبہ کا نام الگ الگ تھا۔ یا ہر ریاست کا نام اس کی راجدھانی کے نام سے مشہور تھا۔ اہل فارس نے جب ملک کے ایک صوبہ پر قبضہ کیا تو اس دریا کا نام جس کو اب

---

[1] ترمذی ابواب الشمائل ۔ [2] تاریخ طبری ۔ [3] بلاذری، ذکر اساورہ

دریائے سندھ کہتے ہیں اور جس کا نام عربوں کی زبان میں مہران ہے ہندھور کھا۔ پرانی ایرانی زبان اور سنسکرت میں س اور ہ آپس میں بدلا کرتے ہیں۔ اس کی متعدد مثالیں ہیں۔ اس لئے فارس والوں نے اس کو ہندھو کہہ کر پکارا اور اس سے اس ملک کا نام ہند پڑ گیا۔ عربوں نے جو سندھ کے علاوہ اس ملک کے دوسرے شہروں سے بھی واقف تھے انہوں نے سندھ کو سندھ ہی کہا۔ لیکن اس کے علاوہ ہندوستان کے دوسرے شہروں کو ہند قرار دیا اور آخر یہی نام تمام دنیا میں مختلف صورتوں میں پھیل گیا اور ہ کا حرف الف ہو کر فرنچ میں انداور انڈیا، اور اس کی مختلف صورتیں ہو کر تمام دنیا میں مشہور ہو گیا اور خیبر سے آنے والی قوموں نے اس کا نام ''ہندواستھان'' رکھا جو فارسی تلفظ میں ''ہندوستان'' بولا جاتا ہے۔ یہ عجیب حیرت انگیز بات ہے کہ ''ہند' کا لفظ عربوں کو ایسا پیارا معلوم ہوا کہ انہوں نے ملک کے نام پر اپنی عورتوں کا یہ نام رکھا۔ چنانچہ عربی شاعری میں یہ نام وہ حیثیت رکھتا ہے جو فارسی میں لیلی اور شیریں کی ہے۔

ہندوستان پر عربوں کے حملے

الغرض یہ دوہرے تہرے تعلقات تھے جن کے سبب سے اسلام کے بعد عربوں کو ہندوستان کی طرف توجہ ہوئی اور انہوں نے ایران کی فتح کے بعد اس کی نوآبادیات اور دوسرے مقبوضات کو اپنے تصرف میں لانا ضروری سمجھا، اور اس طرح مکران اور بلوچستان کے بعد سندھ کی سرحدان کے سامنے تھی۔ پھر ان کو اپنے تجارتی جہازوں کی حفاظت کے لئے ہندوستان کے کسی ساحلی بندرگاہ کی تلاش تھی۔ چنانچہ حضرت عمر کے زمانہ حکومت میں عرب جہازوں کے بیڑے کسی معقول بندرگاہ کے قبضہ کے لئے ہندوستان کے سواحل پر منڈلانے لگے۔ آج بمبئی کا پررونق شہر جہاں آباد ہے اسی کے قریب تھانہ (تانہ) جواب بھی موجود ہے چھوٹا سا بندر تھا۔ سب سے

پہلے سنہ ۱۵ھ (سنہ ۶۳۶ء) میں اسی بندرگاہ پر عربوں نے بحرین کے گورنر کے حکم سے پہلا حملہ کیا۔ اس کے بعد بھروچ (بروص) پر فوج کشی کی اور اسی زمانہ میں ایک دوسرے عرب مغیرہ نام نے دیبل پر جو سندھ کی بندرگاہ تھی اور جو ٹھٹھ یا موجودہ کراچی کے قریب تھا، حملہ کیا۔ اس کے چند برس کے بعد حضرت عثمان کے زمانہ میں ایک دریائی دستہ ان بندرگاہوں کی دیکھ بھال کر کے واپس چلا گیا۔ حضرت علی کے عہد میں سنہ ۳۹ھ (سنہ ۶۶۰ء) سے ایک عرب سردار باقاعدہ ان اطراف کی نگرانی کرنے لگا اور آخر وہ سنہ ۴۲ھ (سنہ ۶۶۳ء) میں مارا گیا۔ سنہ ۴۴ھ (سنہ ۶۶۵ء) میں امیر معاویہ نے مہلب نامی سردار کو سندھ کی سرحد کا نگراں بنا کر بھیجا اور اس کے بعد عربوں کی حکومت میں یہ ایک مستقل عہدہ قرار پا گیا۔

سنہ ۸۶ھ (سنہ ۷۰۵ء) میں دمشق کے تخت شاہی پر جب ولید اموی بیٹھا اور اس کی طرف سے حجاج عراق و ایران و مکران و بلوچستان یعنی حکومت کے مشرقی مقبوضات کا نائب مقرر ہوا تو اس نے ہندوستان اور ہندوستان کے جزیروں کے ساتھ اپنے تعلقات اور مضبوط کئے۔ عرب تاجر برابر آتے جاتے رہتے تھے مگر ساتھ ہی ساتھ ہندوستان کے اکثر ساحلوں سے بحری قزاق ان جہازوں پر ڈاکہ ڈالا کرتے تھے۔ چنانچہ البیرونی کے زمانہ تک (سنہ ۴۲۴ھ) سومنات اور کچھ بحری ڈاکوؤں کی سب سے بڑی جائے پناہ تھی [۱] بہر حال واقعہ یہ ہے کہ لنکا میں کچھ عرب سوداگر تجارت کرتے تھے۔ ان کا وہاں انتقال ہو گیا۔ لنکا کے راجہ نے ان کی عورتوں اور بچوں کو ایک جہاز پر سوار کر کے عراق روانہ کیا۔ راستہ میں سندھ کی بندرگاہ دیبل کے قریب ڈاکوؤں نے اس پر چھاپہ مارا اور عورتوں کو پکڑ لیا۔ ان عورتوں نے اس مصیبت کے

---

[۱] کتاب الہند ص ۱۰۲ لندن۔

وقت حجاج کی دہائی دی۔ حجاج کو جب اس کی خبر ہوئی تو اس نے سندھ کے راجہ داہر کو لکھ بھیجا کہ ان عورتوں کو حفاظت کے ساتھ میرے پاس بھجوادو۔ راجہ نے معذرت کی کہ یہ دریائی ڈاکوؤں کا کام ہے جو ہمارے قبضہ میں نہیں۔ عراق کے نائب نے اس معذرت کو قبول نہ کیا۔ اسی دوران میں یہ واقعہ بھی پیش آیا کہ مکران سے کچھ عرب مجرم اور باغی بھاگ کر سندھ میں پناہ گزیں ہوئے اور انہوں نے راجہ داہر کی ماتحتی میں اپنا ایک جتھا بنالیا۔ اس واقعہ نے بھی حجاج کو مشتعل کیا۔ چنانچہ اس نے اپنے نوجوان بھتیجے محمد بن قاسم کی سرکردگی میں شیراز سے چھ ہزار فوج سندھ روانہ کی اور کچھ فوج مع سامان کے دریائی راستہ سے سندھ کی طرف بھیجی اور اس کی کمک کے لئے ایران کے پرانے راستہ سے خشکی کی طرف سے بھی فوجیں بھیجیں۔ سنہ ۹۳ھ میں محمد بن قاسم سندھ پہنچا اور تین برس کے عرصہ میں چھوٹے کشمیر کی سرحد ملتان سے (عرب پنجاب کو چھوٹا کشمیر کہتے تھے) لے کر کچھ تک اور ادھر مالوہ کی سرحد تک قبضہ کرلیا اور پورے سندھ میں اس نے نہایت عدل وانصاف اور امن کی سلطنت قائم کردی۔ راجہ داہر کے ساتھ مل کر جن ہندی سپاہیوں نے عربوں کا سب سے زیادہ مقابلہ کیا ان کا نام بلاذری نے جس نے سنہ ۲۵۵ھ (۸۵۵ء) میں اپنی کتاب لکھی ہے ٹھاکرہ بتایا ہے جو ''ٹھاکر'' کی عربی جمع ہے۔ سنہ ۹۶ھ میں ولید نے وفات پائی اور اس کی جگہ تخت پر سلیمان بیٹھا، اس کو حجاج اور اس کے خاندان اور کارندوں کے ساتھ ذاتی عداوت تھی۔ اس لئے اس سال حجاج کے مقرر کردہ دوسرے افسروں کے ساتھ محمد بن قاسم کو بھی اس نے سندھ سے واپس بلالیا اور بالآخر اپنے ذاتی انتقام کے نشہ میں اس کو قتل کرادیا۔ اس قتل کے اسباب میں راجہ داہر کی دو بیٹیوں کا افسانہ ذکر کے قابل نہیں کہ اس کی تردید بارہا ہو چکی ہے بلکہ یہ واقعہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ جب قاسم سندھ سے واپس جانے لگا تو

سندھ کی رعایا نے اپنے نیک دل اور عادل فاتح کی جدائی میں آنسو بہائے اور اس کی یادگار میں اس کا بت بنا کر کھڑا کیا۔ [1]

بہر حال اس کے بعد مختلف گورنر یہاں مقرر ہو کر آتے رہے۔ سنہ ۱۰۷ھ میں جنید گورنر ہو کر آیا، یہ بلند حوصلہ افسر تھا۔ اس نے سندھ سے کچھ پر حملہ کیا، پہلے سرمد آیا اور یہاں سے مانذل اور پھر دھج پہنچا اور وہاں سے بھروچ کی بندرگاہ تک گیا اور اس کے ایک افسر نے اجین (مالوہ) تک دھاوا کیا اور وہاں سے پھر سیدا اور بھیل مال کو فتح کرتا ہوا گجرات پہنچا اور وہاں سے پھر سندھ واپس آ گیا مگر یہ تمام فتوحات کی حیثیت ایک گذر جانے والی آندھی سے زیادہ نہیں۔ سنہ ۱۳۳ھ (سنہ ۷۵۱ء) میں عربی حکومت کے دفتر کا ورق الٹ گیا۔ امویوں کی جگہ عباسی آئے، شام کی بجائے عراق سلطنت کا صوبہ قرار پایا اور حکومت کا مرکز دمشق سے ہٹ کر بغداد چلا گیا۔ اس انقلاب نے ہندوستان کو عرب سلطنت کے مرکز سے بہت زیادہ قریب کر دیا۔ سنہ ۱۴۰ھ (سنہ ۷۵۹ء) میں ہشام سندھ کا گورنر ہو کر آیا۔ اس نے عمر بن جمل نام ایک افسر کو جہازوں کا ایک بیڑا دے کر گجرات بھیجا۔ وہ لوٹ مار کر چند روز میں ناکام واپس آ گیا اور آخر ہشام نے خود ایک بیڑا لے کر بھروچ کے قریب کندھار پر قبضہ کیا اور یہاں اس نے اپنی فتح کی یادگار میں ایک مسجد بنوائی۔ یہ اس ملک گجرات میں اسلام کا پہلا قدم تھا اور سندھ کے علاوہ ہندوستان میں یہ پہلی مسجد تھی۔

منصور کے بعد مہدی خلیفہ ہوا، اس کے حکم سے عبدالملک نے گجرات پر پھر حملہ کیا اور سنہ ۱۶۰ھ (سنہ ۷۷۸ء) میں بارید کو جس کا ہندی نام بھار بھوت ہے اور جو بھروچ کے قریب ہے اس کو فتح کیا، لیکن فوج میں اتفاقاً وبا پھوٹ گئی جس میں ایک

---

[1] تاریخ فتوح البلدان بلاذری ۔ باب فتح سندھ

ہزار سپاہی مر گئے۔ اس سانحہ سے پریشان ہو کر عرب الٹے پاؤں پھر گئے۔

بغداد کی سلطنت معتصم باللہ عباسی تک جس کی وفات سنہ ۲۲۷ ھ میں ہوئی مضبوط رہی، اور اس کے بعد روز بروز ایسی کمزور ہوتی گئی کہ اس کا تعلق سندھ اور ہندوستان سے ٹوٹ گیا۔ کچھ دن تک عرب امراء یہاں خود مختار بنے رہے لیکن بالآخر ہندو راجاؤں نے پھر قبضہ کر لیا اور بعد کو صرف دو مشہور عرب ریاستیں یہاں قائم رہ گئیں جن میں ایک ملتان میں تھی اور دوسری سندھ کے عربی شہر منصورہ میں۔ یہاں یہ واقعہ ذکر کے قابل ہے کہ ان ہندو راجاؤں نے بھی مسلمان رعایا کے ساتھ رواداری کا برتاؤ کیا اور ان کی مسجدوں کو اسی طرح اپنی جگہ پر برقرار رہنے دیا۔[۱]

سندھیوں کی شکست کا راز

اس سے پہلے کہ آگے بڑھیں یہ معلوم کرنا ہے کہ چند ہزار عربوں کی فوج جو دور دراز راستوں سے آئی ہو ایک ہی حملہ میں اس ملک پر کیوں کر قابض ہو گئی۔ سندھیوں کی شکست بھی میرے نزدیک اسی ایک سبب کا نتیجہ ہے جس کے ذریعہ سے دنیا میں ہر قوم دوسری قوم کی محکوم بنی ہے۔ عربوں کے بیانات سے یہ قطعی طور پر ثابت ہوتا ہے کہ اس وقت یعنی پہلی صدی ہجری کے آخر اور آٹھویں صدی عیسوی کے اول میں سندھ میں بودھ مذہب کا رواج تھا۔ اہل عرب بودھوں کو سمنیہ کہتے تھے (اس لفظ پر آئندہ بحث ہوگی) تمام جغرافیہ نویسوں نے یہاں بدھ[۲] نام ایک آبادی کا ذکر کیا ہے جس کا صحیح نام پچ نامہ میں بدھیور ہے[۳] پھر یہاں نو ویہار[۴] نام پرستش گاہ کا ذکر ملتا ہے، جو خاص بودھ معبد کا نام ہے۔ ان کے پجاری کا نام سمنیہ ملتا ہے جو برہمنوں

---

[۱] یہ تمام واقعات فتوح البلدان بلاذری میں ہیں۔ [۲] بشاری مقدسی اور ابن حرقل ذکر سندھ [۳] الیٹ جلد اول ص ۱۳۸۔ [۴] ایضاً ص ۱۰۔

کے حریف تھے۔ الیٹ صاحب بھی اس دعویٰ میں کہ اس وقت سندھ کا مذہب بودھ تھا ہمارے ہم آواز ہیں، کہتے ہیں:

''چوں کہ بودھ مت سندھ میں اس وقت مسلمہ طور پر رائج تھا جب مسلمانوں کو پہلے پہل ہندوستان قوم پرستی سے سابقہ پڑا۔ اس لئے لازمی طور پر اس نام (بد) کا ماخذ بودھ ہے نہ کہ فارسی لفظ بد (بت) جو غالباً خود بھی لفظ بودھ کی منحرف شکل ہے۔ بہت سے آثار اس بات کے موجود ہیں کہ بودھ مت اس عہد میں وادی سندھ میں پھیلا تھا، نہ صرف مخصوص طور پر چینی سیاحوں کے تذکرے اور ابن خرداذبہ کا بیان اس کی تائید کرتا ہے بلکہ عرب مصنفین کے چند ضمنی اشارات و تلمیحات بھی ہیں جن میں خاص طور پر کوئی تذکرہ برہمنوں اور بودھوں کا بحیثیت ایک دوسرے کے حریف ہونے کے نہیں ہے، کیوں کہ ان دونوں کا امتیاز باہمی (خصوصاً طرز عبادت، ایصال ثواب) قصص مذہبی عام طور پر اس قدر نازک ہے کہ ناواقف اور مغرور بدیسیوں کی توجہ مشکل سے ادھر منعطف ہوسکتی تھی۔ چنانچہ جہاں کہیں بچاریوں کا تذکرہ ہے عموماً ان کو ''سمنی'' کہا گیا ہے۔ سلطنت کا ہاتھی سید ہوتا تھا جو ایک نہایت معنی خیز بات ہے، ایک ہزار برہمن (پجاری) جس نام سے کہ ان کا عربی کتابوں میں تذکرہ ہے اور جو چاہتے تھے کہ اپنے قدیم مذہبی معتقدات اور رسم و رواج کو قائم رکھیں ان کو محمد بن قاسم نے خلیفہ وقت کی اجازت سے فرمان دیا تھا کہ وہ اپنے ہاتھوں میں کچکول لے کر ہر صبح کو در بدر پھر کر اپنی روزی حاصل کریں اور یہ ایک مخصوص مذہبی رسم ہے جو بودھ پجاریوں میں جاری ہے اور سب سے آخر یہ کہ مجھ سے بتا کر یا کسی اور طور پر اپنے فاتحوں کی جسمانی یادگار قائم کرنا، یہ تمام امور

بودھوں کے خصائص طبعی کی طرف اشارہ کرتے ہیں نہ برہمنوں کی، ان اثباتی دلائل کے علاوہ صنفی شہادت بھی اس امر سے ہوتی ہے کہ کوئی تذکرہ ستی، جینو، کٹر پوجا، اشنان (یا نہان) ہون، پجاریوں کے ہتھکنڈوں اور دوسرے بیقرایاتہ تصکمات جوگیانہ نفس کشی یا دیگر رسوم واعمال، نامہ نہیں ملتا''۔

سندھ کی سب سے پہلی پرانی اسلامی تاریخ جو عام طور پر چچ نامہ کے نام سے مشہور ہے (اور جس کے دوسرے نام تاریخ الہند السند اور منہاج المسالک ہیں) کے مطالعہ سے پوری طرح واضح ہو جاتا ہے۔ سندھ میں بودھوں اور برہمنوں کے درمیان اختلاف اور مخاصمت برپا تھی اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں مذہب بعض گھرانوں میں اس طرح بھی پھیلے ہوئے تھے کہ ایک ہندو ہے تو دوسرا بودھ ہے۔ اسی بنا پر سندھ کے راجاؤں کے حالات پڑھ کر مجھے یہ فیصلہ کرنا پڑا ہے کہ راجہ چچ ہندو برہمن تھا۔ اس نے چھوٹے چھوٹے بودھ راجاؤں کو لڑ جھگڑ کر مٹا دیا یا باجگذار بنا لیا تھا[1] یہ راجہ چھٹی صدی عیسوی کے آخر میں سندھ میں فرمانروا تھا۔ اس کے بعد راجہ چندراس کا بھائی راجہ ہوا۔ یہ بودھ مت کا پرجوش پیرو تھا اور جن لوگوں نے اپنا مذہب پہلے چھوڑ دیا تھا ان کو بزور اس نے بودھ بنایا۔[2] ہندو برہمنوں نے یہ دیکھ کر سر اٹھایا۔ ناچار وہ معرکوں میں نکلا مگر کامیاب نہیں ہوا۔ اس کے بعد چچ کا بیٹا راجہ داہر اس کی جگہ بیٹھا۔ یہ مجھے ہندو برہمن معلوم ہوتا ہے۔

تاریخ قیاسات سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت جب مسلمان سندھ کی سرحد پر تھے ملک میں ان دونوں مذہبوں کے اندر جنگ برپا تھی اور بودھ برہمنوں کے مقابلہ میں اپنے کو بے دست و پا پا کر مسلمان کی طرف صلح و محبت کا ہاتھ بڑھا رہے ہیں،

---

[1] چچ نامہ الیٹ ج ۱ ص ۱۴۲ و ۱۵۲۔ [2] ایضاً ۱۵۲، ۱۵۳۔

ہم دیکھتے ہیں کہ عین اس وقت جب محمد بن قاسم کی فاتح فوج شہر نیروں میں پہنچتی ہے تو وہاں کے باشندوں نے اپنے سنیوں یعنی بودھ پجاریوں کو پیش کیا اور معلوم ہوا کہ ''انہوں نے اپنے سفراء خاص عراق حجاج کے پاس بھیج کر امان حاصل کر لی ہے'' چنانچہ نیروں کے لوگوں نے محمد کا شاندار استقبال کیا، اس کے لئے رسد کا انتظام کیا اور اس کو اپنے شہر میں داخل کیا اور صلح کی پوری پابندی کی۔ اس کے بعد جب اسلامی فوج نہر سندھ کو عبور کر کے ہندوستان پہنچتی ہے تو پھر سمنیہ بودھ لوگ صلح کے قاصد بنتے ہیں [۱]

اسی طرح سیوستان میں ہوتا ہے کہ سمنی لوگ (بودھ) بچے رائے اپنے راجہ کو چھوڑ کر بخشی مسلمانوں کا ساتھ دیتے ہیں اور ان کو بدل قبول کرتے ہیں۔ سندھ میں کاکا کوئی مشہور عقل مند اور سیاست داں تھا۔ جاٹ رؤسا اس کے پاس جا کر مشورہ کرتے ہیں کہ کیا مسلمانوں کی فوج پر شبخون مارا جائے؟ وہ جواب میں کہتا ہے، ''اگر تم ایسا کر سکو تو بہتر ہے، مگر سنو ہمارے پنڈتوں اور جوگیوں نے جنتر دیکھ کر یہ پیشین گوئی کر دی تھی کہ اس ملک کو ایک دن مسلمان فتح کر لیں گے''۔ لوگ اس کی بات نہیں مانتے اور نقصان اٹھاتے ہیں، کاکا نے کہا ''تم خوب جانتے ہو کہ میرا ارادہ اور عزم مشہور ہے لیکن بودھوں کی کتابوں میں پیشین گوئی پہلے ہی لکھی جا چکی ہے کہ ہندوستان کو مسلمان فتح کر لیں گے اور میں بھی یقین رکھتا ہوں کہ درحقیقت ایسا ہی ہونے والا ہے'' اس کے بعد کاکا محمد بن قاسم کے پاس چلا جاتا ہے اور جاٹوں کے ارادہ سے اس کو آگاہ کرتا ہے اور اپنی کتابوں کی پیشین گوئی اس کو سناتا ہے، محمد بن قاسم اس کو بہ عزت تمام لیتا ہے اور اس کو اور اس کے ساتھیوں کو انعام و اکرام اور خلعت سے سرفراز کرتا ہے۔ اسی طرح راجہ داہر کے بہت سے مخالف افسر (غالباً بودھ) خود آ کر اطاعت کرتے ہیں۔ [۲]

---

[۱] بلاذری ص ۴۳۷ و ۴۳۸ [۲] چچ نامہ الیٹ ص ۱۰۶۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سندھ کے بودھوں نے ایک طرف مسلمانوں کو اور دوسری طرف برہمنوں کو تولا تو ان کو مسلمان بہتر نظر آئے اور دوسری وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ اس سے پہلے ترکستان و افغانستان کے بودھوں کے ساتھ مسلمانوں نے جو حسن سلوک کیا اور ان لوگوں نے جس کثرت اور سرعت کے ساتھ اسلام کو اختیار کیا اس کا اثر اس ملک کے بودھوں پر بھی پڑا۔

ہندوستان کے عرب سیاح اور جغرافیہ نویسی

اس وقت عربی زبان میں جغرافیہ کی سب سے پہلی کتاب جس میں ہندوستان کا کچھ حال ملتا ہے وہ ابن خرداذبہ (سنہ ۲۵۰ھ) کی کتاب المسالک والممالک ہے۔

۱۔ابن خرداذبہ سنہ ۲۵۰ھ: یہ نویں صدی عیسوی میں معتمد خلیفہ عباسی کے زمانہ میں ڈاک اور خفیہ اطلاعات کے محکمہ کا افسر تھا۔اس لئے اس نے بغداد سے مختلف ملکوں کی مسافتوں اور آمد و رفت کے راستوں کی تشریح میں یہ کتاب لکھی ہے، اس میں اس نے ہندوستان کے بری اور بحری تجارتی راستوں کی تفصیل بیان کی ہے اور یہاں کی مختلف ذاتوں کا تذکرہ کیا ہے، یہ گو خود ہندوستان نہیں آیا مگر اس کے عام معلومات کی بنیاد بطلیموس کے جغرافیہ پر ہے اور خاص خاص معلومات اس کے محکمہ کے سرکاری اطلاعات پر مبنی ہیں اور تاجروں اور مسافروں سے اپنے عہدہ کی وجہ سے اس کی ملاقاتیں برابر ہوتی رہتی تھیں ۔ اس لئے اس کے یہ ذاتی معلومات گویا ایک ہندوستانی سیاح کے برابر تھے۔اس کی کتاب سنہ ۱۸۸۹ء میں مطبع بریل لیڈن میں دی خوی (De Goeje) نے شائع کی ہے۔

ابن خرداذبہ نے سندھ کے تحت میں جن شہروں کا ذکر کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل عرب بلوچستان کے بعد سے لے کر گجرات تک سب کو سندھ سمجھتے تھے،

چنانچہ اس نے سندھ کے یہ شہر گنائے ہیں: قیقان، بنہ، مکران، مید، قندھار، قصدار، بوقان، قندابیل، قلز پور، ارمابیل، دیبل، قنبلی، کنبایاہ، کھنبایت سہبان، سدوسان، راسک، رور، ساوندری، ملتان، منذل، بیلمان، سرشت، کیرج، سرمد، قالبی (کالپی) دھنج بروص، (بھروچ) (ص ۵۵) پھر ہندوستان کے مشہور شہروں کے نام لئے ہیں:

سامل ہورین (اجین) قالون قندھار (کندھارا) قشمیر (کشمیر) (۶۸)۔

ابن خرداز بہ کہتا ہے کہ "ہندوستان میں ۷ ذاتیں ہیں: (۱) شاکشری (چھتری)۔ یہ اس ملک کے شرفاء ہیں۔ انہیں میں سے بادشاہ ہوتے ہیں، ان کو سب سجدہ کرتے ہیں، وہ کسی کو سجدہ نہیں کرتے، (۲) براہمہ (برہمن) یہ شراب اور نشہ کی چیز نہیں پیتے۔ (۳) کستری (کھتری) یہ تین پیالوں تک پی لیتے ہیں۔ برہمن ان کی بھتی لے لیتے ہیں مگر ان کو دیتے نہیں۔ (۴) شودر۔ یہ کھیتی والے ہیں۔ (۵) بیش (ویش) یہ پیشوں والے ہیں۔ (۶) شندال (چنڈال)۔ یہ کھلاڑی اور کلاونت ہیں۔ ان کی عورتیں خوبصورت ہوتی ہیں۔ اور (۷) ذنب (ڈوم) یہ گاتے بجاتے ہیں، ہندوستان میں ۴۲ قسم کے مذہب جاری ہیں۔ کوئی خدا اور رسول دونوں کو مانتا ہے، کوئی ایک کو مانتا ہے، کوئی کسی کو نہیں مانتا ہے، ان کو اپنی جادوگری اور جنتر منتر پر پورا ناز ہے"۔ (ص ۷۱)

۲۔ سلیمان تاجر سنہ ۲۳۷ھ: یہ سب سے پہلا عرب سیاح ہے جس کا سفرنامہ ہم تک پہنچا ہے۔ سنہ ۱۸۱۱ء میں پیرس میں سلسلۃ التواریخ کے نام سے یہ چھپا ہے۔ یہ ایک سوداگر تھا جو عراق کی بندرگاہ سے چین تک سفر کیا کرتا تھا اور اس طرح یہ ہندوستان کے پورے ساحل کا چکر لگایا کرتا تھا، اس نے اپنے یہ مختصر حالات سنہ ۲۳۷ھ میں لکھے ہیں جس کو آج قریب قریب گیارہ سو برس ہوتے ہیں۔

یہ سب سے پہلا ماخذ ہے جس میں بحر ہند کا نام دریائے ہرگند ہم کو ملتا ہے اور پھر اسی نام اہل عرب نے اس کو یاد کیا ہے، ہرگند سمندر کے اس حصہ کو کہتے تھے جو جنوبی ہند کے کناروں سے بہتا ہے، سلیمان کہتا ہے کہ ''مشہور ہے کہ اس میں ۱۹ سو کے قریب جزیرے ہیں۔ ان جزیروں پر ایک عورت کی حکومت ہے۔ ان میں عنبر اور ناریل کے درختوں کی کثرت ہے۔ ایک جزیرہ دوسرے جزیرے سے دو تین فرسخ پر واقع ہے۔ یہاں کے لوگ بڑے صناع ہیں۔ یہ کرتہ دونوں آستینوں دامنوں اور گریبان کے ساتھ بن لیتے ہیں اور اسی طرح جہاز بناتے ہیں۔ سب سے آخری جزیرہ کا نام سراندیپ ہے اور ان میں سے ہر جزیرہ کا نام دیپ ہے، اسی سراندیپ میں حضرت آدمؑ کا نقش پا ہے، ان سب سے پیچھے جزیرہ انڈمان ہے۔ یہاں کے لوگ وحشی ہیں، بدصورت اور کالے ہوتے ہیں، گھونگریلے بال، ڈراونے چہرے، لمبے پاؤں، ننگ دھڑنگ، آدمی کو زندہ پکڑ کر کھا جاتے ہیں۔ خیریت ہے کہ ان کے پاس کشتیاں نہیں ہیں، ورنہ ادھر سے جہازوں کا گذرنا مشکل ہوتا'' جنوبی ہند کے بعض ساحلوں کے متعلق لکھتا ہے کہ ''وہ صرف ایک لنگوٹی باندھتے ہیں''۔

اس نے ایک عجیب بات یہ نقل کی ہے جس سے اس زمانہ کے لوگوں کی تنقیدی نظر تمام دنیا کے متعلق معلوم ہوتی ہے کہ ''اہل ہند اور اہل چین کا متفقہ بیان ہے کہ دنیا میں صرف چار بادشاہ ہیں، سب سے اول عرب کا بادشاہ، یہ شہنشاہ اور تمام بادشاہوں کا بادشاہ سب سے دولت مند ہے اور ایک بڑے مذہب کا بادشاہ ہے، پھر چین کے بادشاہ کا نمبر ہے، پھر روم کے بادشاہ کا۔ پھر ہندوستان کے راجہ بلہرا (ولبھ رائے گجرات کا راجہ) کا''۔

اس نے ہندوستان کے سواحل کے ۴ بادشاہوں کا ذکر کیا ہے جن میں پہلا

نام راجہ بلہرا کا ہے۔ ''جو سب راجاؤں کا راجہ ہے، اس کے فوجی وظیفوں کا نظام عربوں کی طرح ہے، اس کے سکے بھی ہیں، اس پر راجہ کا سنہ راجہ کی مسند نشینی سے شروع ہوتا ہے، ہندوستان کے سب راجاؤں سے زیادہ یہاں کے راجہ عربوں سے محبت رکھتے ہیں، ان کا اعتقاد ہے کہ اسی لئے ان کے راجاؤں کی عمریں بڑی ہوتی ہیں۔ ۵۰۔۵۰ برس تک وہ راج کرتے ہیں۔ ان کے ملک کا نام کمکم (کوکن) ہے'' جو سمندر کے کنارے ہے، آس پاس کے راجاؤں سے اس کی لڑائیاں رہا کرتی ہیں''۔ لفظ بلہرا کی اصلیت پر ابتدائی محققوں میں کچھ اختلافات رہے مگر اب یہ بہ تحقیق ثابت ہو گیا ہے کہ بلہرا در اصل ولبھ رائے کی خرابی ہے اور کمکم کوکن کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ ولبھ رائے کا خاندان یہاں مدتوں تک حکمراں رہا ہے۔

ولبھ رائے کے بعد جزر کے بادشاہ کا ذکر ہے، جزر اصل میں گجر ہے۔ گوجر راجہ گجرات کے راجہ تھے۔ کہتا ہے کہ ''اس راجہ کے پاس فوجیں بہت ہیں، اس کے پاس جیسے گھوڑے ہیں ویسے کسی راجہ کے پاس نہیں، لیکن یہ عربوں کا سخت دشمن ہے، اس کا ملک بھی سمندر کے دہانے پر ہے۔ اس کے پاس مویشی جانور بہت ہیں۔ ہندوستان کے تمام ملکوں میں سے سب سے زیادہ یہ ملک چوری سے محفوظ ہے''۔

''اس کے بعد طافن کا بادشاہ ہے، اس کا ملک بہت تھوڑا ہے۔ یہاں کی عورتیں بہت خوبصورت ہیں۔ یہاں کا راجہ سب سے صلح رکھتا ہے اور عربوں سے محبت رکھتا ہے''۔ لفظ طافن کی اصلیت میں یورپین محققوں کا اختلاف ہے۔ یہ لفظ طافن کے بجائے طاقن بھی بعض نسخوں میں ملا ہے۔ اس کو بعضوں نے موجودہ اورنگ آباد دکن کے قریب بتایا ہے۔ بعض اس کو کشمیر کے پاس لے گئے ہیں، لیکن میرے نزدیک یہ طافن لفظ ہے اور یہ دکھن کی خرابی ہے۔

''اس کے بعد رہمی کا راجہ ہے جس کے پاس راجہ بلہرا اور دوسرے راجاؤں سے زیادہ فوج ہے۔ اس کی فوج کے ساتھ پچاس ہزار ہاتھی ہوتے ہیں۔ اس کے ملک میں ایسے سوتی کپڑے ہوتے ہیں جو کہیں اور جگہ نہیں ہوتے'' کپڑوں کی تعریف کی بنا پر سمجھا جاتا ہے کہ ڈھاکہ کے قریب کسی رامانام راجہ کی حکومت تھی۔

اس نے ہندوستان کے بہت سے قوانین بھی لکھے ہیں۔ مثلاً یہ کہ ''جب ایک دوسرے پر کوئی دعویٰ کرتا ہے تو ملزم کے سامنے لوہا گرم کر کے رکھا جاتا ہے اور اس کے ہاتھ پر پان کے سات پتے رکھ کر لوہا رکھ دیا جاتا ہے اور وہ اس کو لے کر آگے پیچھے چلتا ہے۔ پھر وہ اس لوہے کو گرا دیتا ہے اور اس کے ہاتھ کو کھال کی ایک تھیلی میں رکھ کر بادشاہی مہر اس پر کر دی جاتی ہے۔ تین دن کے بعد دھان لا کر اس کو دیئے جاتے ہیں کہ وہ ان کو چھیل کر چاول نکالے۔ تو اگر اس کے ہاتھ پر اثر نہیں ہوتا تو وہ سچا سمجھا جاتا ہے اور مدعی پر جرمانہ کر کے خزانہ شاہی میں داخل کیا جاتا ہے۔ کبھی گرم لوہے کے بجائے لوہے یا تانبے کے برتن میں پانی گرم کیا جاتا ہے اور اس میں ایک لوہے کی انگوٹھی چھوڑ دی جاتی ہے اور اس کو کہا جاتا ہے کہ ہاتھ ڈال کر انگوٹھی اس میں سے نکال لے''۔ سلیمان کہتا ہے کہ ''میں نے بعض لوگوں کو دیکھا کہ ان کے ہاتھ بالکل صحیح وسالم نکل آئے''۔ یہ بھی کہتا ہے کہ ''یہاں مردے جلائے جاتے ہیں، صندل کافور اور زعفران اس میں ڈالتے ہیں اور راکھ ان کی ہوا میں اڑا دیتے ہیں۔ یہاں یہ بھی قاعدہ ہے کہ جب راجہ مرتا ہے تو اس کے ساتھ اس کی سب رانیاں بھی جل کر ستی ہو جاتی ہیں۔ لیکن یہ صرف خواہش پر موقوف ہے کوئی جبر نہیں ہے''۔ (۵۰)

یہ بھی وہ بیان کرتا ہے کہ ''یہاں سلطنت موروثی ہے، ان کے ولی عہد ہوتے ہیں۔ اسی طرح یہاں جو دوسرے عہدے اور پیشے ہیں وہ بھی موروثی ہیں اور یہاں

کے راجہ مل کر ایک بڑے راجہ کے ماتحت نہیں بلکہ ہر ایک کا راج علاحدہ علاحدہ ہے۔ کوئی کسی کے ماتحت نہیں، لیکن ولبھ رائے (بلہرا) سب راجاؤں میں بڑا ہے''۔(۵۱)

''یہاں شادی بیاہ سے پہلے لڑکا اور لڑکی والے پہلے پیام وسلام کرتے ہیں، پھر تحفہ تحائف بھیجتے ہیں اور شادی میں خوب ڈھول جھانجھ بجاتے ہیں اور جس قدر ممکن ہو دان دیتے ہیں''۔(۵۳) تمام ہند میں بدکاری کی سزا دونوں ملزموں کا قتل ہے، اسی طرح چوری کی سزا بھی قتل ہے۔ ہندوستان میں اس کا طریقہ یہ ہے کہ چور کو ایک نوکیلی مخروطی لکڑی پر بٹھاتے ہیں اور وہ لکڑی نیچے سے حلق تک چلی آتی ہے''۔(۵۴)

آج یہ سن کر تعجب ہوگا کہ ہندوستان میں لوگ کبھی لمبی لمبی داڑھیاں بھی رکھتے تھے۔ ہمارے سیاح کا بیان ہے کہ ''یہاں میں نے تین تین ہاتھ کی داڑھیاں دیکھیں''۔(۵۵) ''جب کوئی مرتا ہے تو اس کے عزیز داڑھی اور مونچھ کا بہدر کراتے ہیں۔ جب کوئی قید کیا جاتا ہے تو ۷ دن تک اس کو کھانا پانی نہیں دیتے۔ یہاں ہندو جج بیٹھ کر مقدمات فیصل کرتے ہیں۔ ڈاکو کی سزا بھی قتل ہے۔ جانور کو ذبح کر کے نہیں بلکہ اس کو کسی چیز سے مار کر کھاتے ہیں۔ اہل ہند دوپہر کے کھانے سے پہلے نہاتے ہیں۔ مسواک کرتے ہیں، بے مسواک کئے نہیں کھاتے''۔(۵۶) ایک عرب کے لئے سب سے تعجب کی بات ہے کہ کسی ملک میں چھوہارا نہ ہو۔ ہمارے عرب سیاح کو بھی یہی تعجب ہے، کہتا ہے کہ ''ہندوستان میں چھوہارے کا درخت نہیں اور سب پھل ہیں اور ایک پھل ایسا ان کے پاس ہے جو ہمارے یہاں نہیں''۔(۵۶) ہو نہ ہو یہ آم ہوگا، ہندوستان میں انگور بھی نہیں، انار البتہ ہیں۔ ہمارے تکلف پسند سیاح کو اس پر تعجب ہے کہ ''ہندوستان میں زمین پر فرش بچھانے کا رواج نہیں''۔(۵۴) بیوی رکھنے کی تعداد بھی یہاں مقرر نہیں، جتنی چاہے رکھے''۔ ''ان کی غذا چاول ہے''(۵۴)

''چین کے مذہب کی اصل ہندوستان ہی سے ہے، بودھوں کے مجسمے پوجتے ہیں۔طب، نجوم اور فلسفہ ہندوستان میں ہے''(۵۷) جانوروں میں یہاں گھوڑے کم ہیں''۔(۵۷)

چین ہندوستان سے زیادہ صاف ستھرا ملک ہے، دونوں ملکوں میں بڑے بڑے دریا ہیں، ہندوستان میں جنگل بہت ہیں اور چین پورا آباد ہے، اہل ہند کا لباس یہ ہے کہ ایک کپڑا کمر سے باندھتے ہیں اور دوسرا اوپر ڈال لیتے ہیں۔مرد اور عورت سب سونے اور جواہرات کے زیور پہنتے ہیں''۔

۳۔ ابوزید حسن سیرافی سنہ ۲۶۴ھ: سیراف خلیج فارس کی مشہور بندرگاہ تھی۔ابوزید یہیں کا رہنے والا تھا۔سنہ ۲۶۴ھ کا سنہ اس کی کتاب میں ملتا ہے اور مسعودی سیاح سنہ ۳۰۰ھ میں سیراف میں اس سے ملا تھا۔یہ بھی ایک عرب تاجر تھا، اس نے سلیمان تاجر کے سفرنامہ کو پڑھ کر اس کے ۲۵۔۳۰ برس کے بعد اس کا تکملہ لکھا ہے، وہ بھی سیراف اور ہندوستان اور چین کے درمیان دریائی تجارتی سفر کیا کرتا تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ 'ہمارے زمانہ میں چین کے سیاسی انقلابات کے سبب سے وہاں سے اب لوگوں کے تجارتی کاروبار بند ہوگئے ہیں''۔اس نے دعویٰ کیا ہے کہ ''میں پہلا شخص ہوں جس نے یہ دریافت کیا کہ ہندوستان اور چین کا سمندر اوپر سے بھر کر بحر متوسط (میڈیٹرین) میں مل گیا ہے''(۸۸) یہ سب سے پہلا عرب سیاح ہے جو جاوہ کے بادشاہ مہراج کا ذکر کرتا ہے اور اس کے مقابل میں ملک قمار (راس کماری) کا نام لیتا ہے اور کہتا ہے کہ یہاں کا راجہ مہراج کا ماتحت ہے اور یہاں بدکاری اور شراب دونوں منع ہیں یہاں ان کا نام ونشان نہیں۔(۹۴) ہندوستان اور چین دونوں جگہ تناسخ کا عام اعتقاد اتنا پختہ ہے کہ لوگ جان دے دینا معمولی کام سمجھتے ہیں۔(۱۰۱) اور کہتا ہے کہ ولبھ رائے اور دوسرے راجاؤں میں کوئی کوئی ایسے بھی ہوتے ہیں کہ جان بوجھ

کر اپنے کو آگ میں جلا ڈالتے ہیں۔ (۱۱۵) یہاں راجہ بناتے وقت یہ کرتے ہیں کہ راجہ کے باورچی خانہ میں چاول پکائے جاتے ہیں اور تین سو چار سو آدمی اپنی خوشی سے آتے ہیں۔ راجہ کے سامنے ایک پتے پر یہ چاول رکھ دیئے جاتے ہیں۔ راجہ اس میں سے ذرا سا اٹھا کر کھاتا ہے۔ پھر ایک ایک آدمی راجہ کے سامنے جاتا ہے۔ راجہ ان کو تھوڑے تھوڑے چاول اپنے سامنے سے دیتا جاتا ہے۔ یہ کل آدمی راجہ کے ساتھی ہوتے ہیں۔ جب راجہ مرتا ہے تو یہ سب بھی اس کے ساتھ اس دن آگ میں جل جاتے ہیں۔ اس قسم کے متعدد واقعے ہمارے سیاح نے بیان کئے ہیں۔ وہ یہ بھی کہتا ہے کہ ''یہاں بارش زیادہ ہوتی ہے اور اس پر یہاں کی کھیتی کا مدار ہے''۔ (۱۲۶) پھر وہ بھکشو یعنی بودھ فقیروں کا ذکر کرتا ہے جو ننگے بدن سر اور بدن کے بال بڑھائے اور ناخن بڑھائے گلوں میں انسانی کھوپڑیوں کا مالا پہنے دیس دیس پھرتے رہتے ہیں۔ جب ان کو بھوک لگتی ہے تو کسی کے دروازے پر کھڑے ہو جاتے ہیں'' (۱۲۹)۔ ساتھ ہی اس نے جنوبی ہند کی دیوداسیوں کا بھی تذکرہ کیا ہے (۱۲۹)۔ اس کے بعد ملتان کے مشہور بت کا حال لکھا ہے، پھر ناریل والے ملک کا ذکر کرتا ہے اور اس کی تجارت کا حال بیان کرتا ہے اور آخر میں کہتا ہے کہ ''ہندوستان کے راجہ کانوں میں سونے کے بالے جن میں بڑے بڑے قیمتی موتی ہوتے ہیں پہنتے ہیں اور گلے میں مالا پہنتے ہیں جن میں بیش قیمت جواہرات ہوتے ہیں اور یہی موتی اور جواہرات ان کی دولت اور خزانہ ہیں اور اسی طرح درجہ بدرجہ فوجوں کے سپہ سالار اور افسر بھی اسی قسم کے زیور پہنتے ہیں۔ یہاں امیر لوگ آدمی کی گردن پر سوار ہوتے ہیں۔ اس کے ہاتھ میں چترہ (چھتر) ہوتا ہے، جس میں مور کے پر لگے ہوتے ہیں''۔ (۱۴۵)

اس سیاح کو یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ یہاں دو آدمی بھی ایک ساتھ مل کر نہیں

کھاتے اور نہ ایک دسترخوان پر کھاتے ہیں اور اس کو بڑا عیب سمجھتے ہیں۔ راجاؤں اور امیروں کے یہاں یہ دستور ہے کہ ناریل کی چھال کا تھالی سا کوئی برتن روز بنتا ہے اور وہ ہر ایک کے سامنے رکھا جاتا ہے۔ کھانے کے بعد جھوٹا کھانا مع اس چھال کی تھالی کے پھینک دیا جاتا ہے''۔ (۱۶۴) وہ یہ بھی شہادت دیتا ہے کہ'' یہاں کے اکثر راجا اپنی رانیوں کو پردہ نہیں کراتے، جو بھی ان کے دربار میں جائے وہ ان کو دیکھ سکتا ہے''۔ (۱۶۷)

۴۔ ابودلف مسعر بن مہلہل ینبوعی سنہ ۳۳۱ھ: یہ بڑا عرب سیاح ہے، اس کا زمانہ سنہ ۳۳۱ھ سے سنہ ۳۷۷ھ تک یقیناً ثابت ہے۔ یہ بغداد سے ترکستان آیا اور شاہ بخارا، نصر اسمانی المتوفی سنہ ۳۳۱ھ سے ملا۔ وہاں سے ایک چینی سفیر کے ساتھ چین روانہ ہو گیا۔ پھر چین سے نکل کر ترکستان، کابل، تبت اور کشمیر ہو کر ملتان، سندھ اور ہندوستان کے جنوبی سواحل (کولم) تک پہنچا۔ اس کی کتاب کا کچھ ٹکڑا مولن میں سنہ ۱۸۴۵ء میں لاطینی ترجمہ کے ساتھ چھپا ہے مگر میری نظر سے نہیں گذرا ہے۔ البتہ کچھ اس کے خلاصے ابن ندیم نے کتاب الفہرست میں اور یاقوت نے معجم البلدان میں اور قزوینی نے آثار البلاد میں دیئے ہیں، وہ دیکھے ہیں۔ اس نے ملتان کے بت خانہ کا مفصل تذکرہ کیا ہے۔ اسی طرح مدراس کی پیداوار اور مصنوعات کا ذکر کیا ہے۔ غالباً یہ پہلا عرب سیاح ہے جو ہندوستان میں خشکی کے راستے سے داخل ہوا۔

۵۔ بزرگ بن شہریار سنہ ۳۰۰ھ: یہ ایک جہازراں تھا جو اپنے جہازات عراق کی بندرگاہ سے ہندوستان ساحلوں اور جزیروں سے لے کر چین اور جاپان تک لے جاتا اور لے آتا تھا۔ اس نے عجائب الہند کے نام سے اپنے اور اپنے دوسرے ساتھیوں کے دریائی مشاہدات عربی میں قلم بند کئے ہیں۔ جن میں جنوبی ہند

اور گجرات کے متعلق واقعات ملتے ہیں۔ ان میں سب سے اہم واقعہ ایک ہندو راجہ کا قرآن کا ہندی میں ترجمہ کرا کر سننا ہے۔ اس نے ہندوستان کے شہروں میں سے کولم، کٹہ، کشمیر زیرین (پنجاب)، میسور (جیسور)، سوبارہ، ٹھٹھہ، تھانہ، مانکیر (مہانگر ولبھ رائے کی راجدھانی) اور سیلون کا نام لیا ہے۔ یہاں کے جوگیوں اور ان کی ریاضتوں اور اپنے آپ کو مار ڈالنے اور جلا ڈالنے کے بہت سے قصے لکھے ہیں۔ اس کتاب میں عجیب بات یہ ہے کہ جا بجا تاجروں اور سوداگروں کے لئے بنیانہ کا لفظ استعمال کیا ہے جو صریحاً ہندی لفظ بنیا ہے۔ اس زمانہ میں چھوٹی کشتی کو عرب ملاح بارجہ کہتے تھے۔ یہ لفظ ہندی لفظ ''بیڑا'' ہے۔ اس کی عربی جمع بوارج ہے۔ مگر اس کتاب میں بوارج کا لفظ دریائی ڈاکوؤں کے لئے بھی بار بار بولا گیا ہے۔ ہنڈول ڈولی اور ڈولہ کے معنی میں اور بلنج بلنگ کے معنی میں اس میں استعمال ہوا ہے۔ ہندوؤں کے چھوت چھات کا بھی اس میں ذکر ہے۔ (۱۱۸)

کتاب سنہ ۱۸۸۶ء میں لندن میں چھپی ہے۔ اس کا فرنچ ترجمہ تو اسی کے ساتھ شائع ہوا ہے مگر انگریزی ابھی اسی مہینہ میں چھپ کر نکلا ہے۔

۶۔ مسعودی سنہ ۳۰۳ھ : مسعودی جس کا نام ابوالحسن علی تھا ایک بلند پایہ مؤرخ، جغرافیہ نویس اور سیاح کی حیثیت سے مشہور ہے۔ اس نے اپنی عمر کے پچیس برس سیر و سیاحت میں بسر کئے۔ اس نے اپنے وطن بغداد سے سفر شروع کیا اور عراق و شام و آرمینیا، روم (ایشیائے کوچک) افریقہ، سوڈان، زنگ کے علاوہ چین، تبت، ہندوستان اور سراندیپ کا سفر کیا اور تری میں اس نے ہندوستان چین، عرب، حبش، فارس، روم کے دریاؤں کی سیر کی۔ اس کی متعدد ضخیم کتابوں میں سے صرف دو تاریخی کتابیں موجود ہیں، ایک کتاب التنبیہ والاشراف ہے جو مختصر ہے، دوسری اس

سے بڑی ہے اس کا نام ''مروج الذہب والمعادن الجوہر'' ہے۔ یہ دوسری کتاب زیادہ پر معلومات ہے۔ یہ گویا اسلام کی تاریخ ہے۔ مگر اس کے مقدمہ میں تمام دنیا کی قوموں کی اجمالی تاریخ ہے۔ من جملہ اس کے ہندوستان بھی ہے۔ اس نے دریاؤں کے حالات بہت مفصل لکھے ہیں۔ اس کے بیان سے یہ عجیب بات معلوم ہوتی ہے کہ جس طرح آج جہازراں کمپنیوں اور ان کے جہازات کے نام ہوتے ہیں اسی طرح جہازوں کے مالکوں کی نسبت سے بھائیوں اور بہنوں اینڈ برادرس اینڈ سنز کے طریقہ سے ان جہازوں کے نام بھی رکھے جاتے تھے جو بحر ہند میں آتے جاتے تھے۔ اس نے سب سے پہلے دریائے رائد (راوی) اور گنگا اور پنجاب کے پانچوں دریاؤں کا بار بار نام لیا ہے (۳۷۲) اور یہ بتایا ہے کہ ان میں سے ہر ایک کہاں کہاں سے نکلا ہے۔ قنوج جو مشہور قنوج کے علاوہ سندھ میں واقع تھا اور جس کے راجہ بوورہ کے نام سے مشہور تھے اس کا ذکر کیا ہے اور اس کا موقع بتایا ہے۔ یہ لکھا ہے کہ ''تبت کے پہاڑوں سے زیادہ بڑے پہاڑ نہیں دیکھے''۔ (۳۸۹) ان پہاڑوں سے ظاہر ہے کہ کوہ ہمالیہ مراد ہے۔ یہ بھی لکھا ہے کہ ''ہندوستان میں بہت سی بولیاں بولی جاتی ہیں''۔ (۳۸۱۔۱۶۳) عجیب بات یہ ہے کہ اس نے قندھار کو رھبوط (راجپوتوں) کا ملک بتایا ہے (۳۷۲)۔ کھنبایت میں وہ سنہ ۳۰۳ ھ میں پہنچا تھا۔ وہ اس وقت راجہ ولبھ رائے کے ماتحت ایک برہمن بنیا (؟) کے زیر حکومت تھا۔ (۲۵۴) ملتان سنہ ۳۰۰ ھ کے بعد اپنا پہنچنا وہ ظاہر کرتا ہے اور وہاں کے مسلمان عرب بادشاہ اور وزراء کے نام بتاتا ہے۔ (۳۷۶)

مسعودی نے اپنی کتاب مورج الذہب سنہ ۳۳۲ ھ میں سیر و سیاحت ختم کرنے کے بعد لکھی ہے۔ پیرس میں نو جلدوں میں یہ کتاب فرنچ ترجمہ کے ساتھ شائع ہوئی اور مصر میں کئی دفعہ شائع ہو چکی ہے۔

۷۔اصطخری سنہ۳۴۰ھ: ابو اسحاق ابراہیم بن محمد فارسی مشہور اصطخری کے نام سے ہے۔ بغداد کے محلّہ کرخ کا رہنے والا تھا۔ بہت بڑا سیاح تھا۔ ایشیا کے اکثر ملکوں کی سیاحت کی تھی۔ جغرافیہ میں اس کی دو کتابیں ہیں کتاب الاقالیم اور کتاب مسالک الممالک۔ پہلی کتاب سنہ ۱۸۳۹ء میں گوتھا اور دوسری کتاب سنہ ۱۸۷۰ء میں لیڈن میں چھپی ہے۔ اس میں عرب اور ایران کے بعد ماوراء النہر، کابلستان، سندھ اور ہندوستان کا ذکر ہے۔ بحر ہند کا جس کو وہ بحر فارس کہتا ہے مفصل تذکرہ کیا ہے۔ وہ ہندوستان سنہ ۳۴۰ھ (سنہ ۹۵۱ء) میں آیا تھا۔ وہ اپنے ہم عصر سیاح ابن حرقل سے یہیں ملا تھا۔ اس نے بھی ولبھرائے کے شہر مہانگر کا تذکرہ کیا ہے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس سلطنت کے ٹکڑے ہو چکے تھے۔ لکھتا ہے کہ اس کے ماتحت بہت سے راجہ ہیں، اس کے علاوہ ملتان، منصورہ، سند، الور، دریائے سندھ کا ذکر کیا ہے۔ اس کا کارنامہ صرف ملکوں کا حال لکھنا نہیں بلکہ دنیا کا نقشہ تیار کرنا ہے جس میں سندھ کا نقشہ بھی ہے۔

۸۔ابن حرقل سنہ۳۳۱ھ (سنہ ۹۴۳ء) سنہ۳۵۸ھ (سنہ ۹۷۹ء): یہ بغداد کا ایک تاجر تھا۔ سنہ ۳۳۱ھ مطابق سنہ ۹۴۳ء کو اس نے بغداد چھوڑا اور یورپ، افریقہ اور ایشیا کے ملکوں کا سفر کیا۔ اسپین اور سسلی سے لے کر ہندوستان تک کی زمین اس نے چھان ماری، اس نے بھی ملکوں کے نقشے تیار کئے مگر افسوس ہے کہ اس کے مطبوعہ نسخہ میں یہ نقشے نہیں دیئے ہیں۔ مگر الیٹ صاحب نے اس کا ایک قلمی ناقص نسخہ شاہ اودھ کے کتب خانہ میں دیکھا تھا، اس نسخہ سے انہوں نے اپنی کتاب میں سندھ کا وہ نقشہ لگا دیا ہے جو ان کو ابن حرقل کے اس قلمی نسخہ میں ملا تھا۔ یہ نقشہ غلط سلط ہونے پر بھی غالباً ہندوستان کے کسی صوبہ کا پہلا جغرافی نقشہ ہے جو دنیا میں تیار ہوا۔ اس نقشہ

میں گجرات سے لے کر سیستان تک کی آبادیوں کا محل وقوع دکھایا ہے۔ یہ پہلا عرب سیاح اور جغرافیہ نویس ہے جس کی کتاب میں ہندوستان کی پوری لمبائی چوڑائی بتانے کی کوشش کی گئی ہے۔ کہتا ہے ''ہندوستان کے ملک میں سندھ، کشمیر اور تبت کا حصہ داخل ہے''۔ (۹) ''ہندوستان کی سرزمین کے یورپ فارس کا دریا ہے اور اس کے پچھم اور دکھن اسلامی ملک ہیں اور اس کے اُتر میں چین ہے'' (۱۱)۔ ''ہندوستان کی سرزمین کی لمبائی مکران سے منصورہ، بدھ اور تمام صوبہ سندھ سے لے کر یہاں تک کہ قنوج تک ختم ہو، پھر اس سے آگے بڑھ کر تبت تک چار مہینوں کا راستہ ہے، چوڑائی فارس کے دریا سے لے کر قنوج تک تین مہینوں کا راستہ ہے''۔ یہ بیان کتنا ہی ناقص ہو مگر ہندوستان کی حد بندی کی یہ پہلی کوشش ہے۔

۹۔ بشاری مقدسی سنہ ۳۷۵ھ: شمس الدین محمد بن احمد بشاری شام کے ملک میں بیت المقدس کا رہنے والا تھا۔ اس نے اپنی کتاب سنہ ۳۷۵ھ میں ختم کی ہے۔ اس نے صرف اپنے زمانہ کی دنیائے اسلام کا سفر کیا، ہندوستان بھی آیا مگر سندھ سے آگے نہیں بڑھا۔ اس کی کتاب کی خاص خصوصیت ملکوں کے نقشے تھے مگر وہ مطبوعہ کتاب میں نہیں۔ اس کی کتاب کا نام ''احسن التقاسیم فی معرفۃ الاقالیم'' ہے۔ کتاب کا آخری باب سندھ پر ہے۔ ہمارے سامنے اس کا وہ نسخہ ہے جو دوسری دفعہ سنہ ۱۹۰۶ء میں لیڈن میں چھپا ہے۔

مقدسی کی کتاب کی ایک اور خاص بات ہے کہ اس نے ملک کی تقسیم صوبوں پر اور صوبوں کی شہروں پر کی ہے۔ ہر ایک کا علاحدہ علاحدہ ذکر کیا ہے اور ہر جگہ کی تجارت، پیداوار، صنعت، مذاہب اور سکوں کا حال لکھا ہے۔ اس لئے اس کتاب کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس طرح سندھ کا حال اس نے ۱۴ صفحوں میں لکھا ہے۔

۱۰۔ البیرونی سنہ ۴۰۰ھ: کتاب الہند کے مصنف سے لوگ اس قدر واقف ہیں کہ اس کا حال بیان کرنے کی ضرورت نہیں، صرف اس قدر کہنا کافی ہے کہ البیرونی جو اصل میں خوارزم (خیرا) کا رہنے والا تھا وہ جب ہندوستان آیا تو محمود غزنوی کے حملے غالباً شروع نہیں ہوئے تھے۔ مگر اس نے اپنی کتاب محمود کے دو برس بعد لکھی ہے۔ اس نے کتاب الہند کے علاوہ اور بہت سی کتابیں لکھی ہیں جن میں سے قانون مسعودی خاص ذکر کے قابل ہے جو اب تک چھپی نہیں۔ اس میں ہندوستان کے بہت سے شہروں کے نام لکھے ہیں اور ان کا طول بلد اور عرض بلد مقرر کیا ہے۔

کتاب الہند کی اصل عربی پھر اس کا انگریزی اور ہندی ترجمہ تک شائع ہو چکا ہے۔ اس میں ہندوستان کا پورا جغرافیہ تفصیل کے ساتھ موجود ہے۔

۱۱۔ ابن بطوطہ سنہ ۷۷۹ھ (سنہ ۱۳۷۷ء): یہ سیاح مراکش کا باشندہ تھا اور محمد تغلق کے زمانہ میں ہندوستان آیا تھا اور اس کے چپہ چپہ کو اس نے دیکھا تھا۔ اس نے اپنے سفرنامہ عجائب الاسفار میں جس خوبی سے اپنے مشاہدات کا ذکر کیا ہے وہ کہانی سب کو معلوم ہے۔ ہمارے لیے اس کے بیان کا سب سے اہم حصہ جنوبی ہند کے اس وقت کے حالات ہیں جب مسلمانوں نے اس کو فتح نہیں کیا تھا۔

۱۲۔ دوسرے مؤرخین اور جغرافیہ نویس: اوپر کی سطروں میں صرف ان صاحبوں کا میں نے ذکر کیا ہے جو ہندوستان خود آئے۔ مگر ان کے علاوہ بہت سے ایسے عرب جغرافیہ نویس یا ایسے عرب مؤرخ ہیں جنہوں نے ہندوستان کا حال لکھا ہے جن میں سے ایک ابن رستہ (سنہ ۲۹۰ھ) دوسرا قدامہ بن جعفر (سنہ ۲۹۶ھ) پھر بلاذری (سنہ ۲۷۹ھ ۸۹۲ء) ہے جس کی فتوح البلدان بہت قیمتی کتاب ہے، نیز ابن ندیم بغدادی (سنہ ۳۷۰ھ) کی کتاب الفہرست۔

یہ تو شروع کے لوگ ہیں اور آخر کے لوگوں میں صوفی دمشقی (سنہ ۷۲۸ھ سنہ ۱۳۲۶ء) ہے جس کی کتاب عجائب البر والبحر ہے، سسلی کا عرب جغرافیہ نویس ادریسی (سنہ ۵۶۰ھ سنہ ۱۱۶۵ء) ہے۔ ایران کا زکریا قزوینی (سنہ ۶۸۲ھ سنہ ۱۲۸۳ء) ہے جس کی کتاب آثار البلاد ہے، ابوالفدا (سنہ ۷۳۲ھ سنہ ۱۳۳۱ء) جس کی کتاب تقویم البلدان ہے، یاقوت (سنہ ۶۲۷ھ سنہ ۱۲۲۹ء) جس کی ضخیم کتاب معجم البلدان ہے، مصر کا نویری (سنہ ۷۳۳ھ سنہ ۱۳۳۱ء) ہے جس کی کتاب نہایۃ الارب فی فنون الادب ہے، اور شہاب الدین عمری (سنہ ۷۴۸ھ سنہ ۱۳۴۶ء) جس کی کتاب کا نام مسالک البصار و مسالک المصار ہے۔

ادریسی کے مختلف ٹکڑے اور نہایۃ الارب کی ۵ جلدیں اور مسالک البصار کی صرف ایک ایک جلد مصر میں چھپی ہے۔ ان سب میں ہندوستان کا کچھ نہ کچھ حال ہے۔ اگر ان تمام کتابوں سے ہندوستان کے متعلقہ حالات و بیانات کو یکجا کر دیا جائے تو الیٹ صاحب کے ادھورے کام کی تکمیل ہو جائے اور قرون وسطیٰ کے ہندوستان کے متعلق بہت سے نئے معلومات ہمارے سامنے آجائیں۔ اس کا افسوس ہے کہ یورپین مورخین نے قدیم ہندوستان کے بیان میں یونانی بیانات کو جو اہمیت دی ہے اور اس کی بال کی کھال نکالنے اور جھوٹ کو سچ کر دکھانے اور ایک ایک نام کی تطبیق و تحقیق میں جو محنت کی ہے اگر اس کا کچھ حصہ عربوں کے بیانات پر بھی وہ صرف کرتے تو یونانی اور فارسی تاریخوں کے درمیان جو چند صدیوں کا غار رہ جاتا ہے وہ بہت کچھ پٹ جاتا۔

دوسرا باب

تجارتی تعلقات

عربوں کا ملک تین طرف سے سمندروں سے گھرا ہے۔ ملک میں آبادی کے مطابق کافی سرسبزی اور شادابی بھی نہیں۔ ایسا ملک قدرتی طور سے تجارتی ہوگا۔ پھر خوش قسمتی سے اس کی چاروں طرف دنیا کے بڑے بڑے ملک واقع ہیں۔ ایک طرف عراق، دوسری طرف شام، تیسری طرف مصر اور افریقہ، سامنے ہندوستان، ایک رخ پر ایران۔ ان تمام ملکوں سے عربوں کے براہ راست پرانے تعلقات تھے۔ یہاں ہم کو صرف ہندوستان سے بحث ہے۔ بحرین، عمان، حضرموت، یمن، حجاز، یہ مقامات ہیں جو بحر احمر، بحر ہند اور خلیج فارس پر آباد ہیں اور قدرۃً انہیں کو اس بحری تجارت کا موقع حاصل تھا۔ اس سے پہلے عربوں کی ہندوستانی بحری آمد و رفت کا نقشہ دکھایا گیا ہے کہ ہندوستان کے ساحل سے جہازات چل کر یمن کی بندرگاہ میں پہنچتے تھے اور وہاں سے ان کا سامان اونٹوں پر لد کر خشکی کے راستہ سے بحر احمر کے کنارے کنارے شام اور مصر آتا تھا، اور وہاں سے بحر روم ہو کر یورپ چلا جاتا تھا۔

ہم کو جب سے دنیا کی تجارتی حالات کا علم ہے ہم عربوں کو کاروبار میں مصروف پاتے ہیں اور اسی راستہ سے ان کے قافلوں اور کاروانوں کو شام اور مصر تک آتے جاتے دیکھتے ہیں۔ اس وقت ہمارے پاس دنیا کی بین الاقوامی تاریخ کی سب سے پرانی کتاب توراۃ ہے۔ اس میں حضرت ابراہیمؑ کی دو ہی نسل بعد حضرت یوسفؑ کے زمانے میں ہم اس تجارتی قافلہ کو اسی راستہ سے گذرتے ہوئے پاتے ہیں

اور یہ وہی کارواں ہے جو حضرت یوسف کو مصر پہنچاتا ہے۔ (پیدائش ۳۷: ۲۵) اس راستہ کا ذکر یونانی مؤرخوں نے بھی کیا ہے۔ الغرض حضرت یوسفؑ کے عہد سے لے کر مارکو پولو اور واسکوڈی گاما کے زمانہ تک ہندوستان کی تجارت کے مالک عرب ہی رہے۔[۱]

یونانیوں نے جب مصر پر قبضہ کر لیا تو انہوں نے اس تجارت کو براہ راست اپنے ہاتھ میں لے لیا، کیوں کہ مصر سے شام تک کا راستہ ان کے لیے پر امن تھا اور اس طرح عربوں کی تجارت کی وہ پہلی رونق باقی نہیں رہی۔ انسائکلو پیڈیا برٹانیکا کا ''عرب'' کا مضمون نگار لکھتا ہے:

> ''جنوبی مغربی عرب (حضرموت اور یمن) کی خیر و برکت کا سب سے بڑا سبب اس زمانہ میں یہ تھا کہ مصر اور ہندوستان کے درمیان کا تجارتی سامان پہلے سمندر کی راہ سے یہاں آتا تھا اور پھر خشکی کی راہ سے مغربی ساحل پر جاتا تھا۔ یہ تجارت اس زمانہ میں بند ہو گئیں، کیوں کہ مصر کے بطلیموس بادشاہوں نے ہندوستان سے اسکندریہ تک براہ راست ایک راستہ بنالیا۔''[۲]

معلوم ہوتا ہے کہ اس مقصد کے لیے یونانیوں نے جزیرۃ سقوطرہ پر قبضہ کر کے وہاں نو آبادی قائم کر لی تھی جس کی یادگار مسلمان عرب جہاز رانوں کو وہاں بعد کو بھی نظر آئی۔[۳]

مگر یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ تجارت بالکلیہ یونانیوں کے ہاتھوں میں نہیں چلی گئی کیوں کہ حضرت مسیحؑ سے دو صدی پہلے آگاتھرشیدس یونانی مؤرخ بیان کرتا ہے کہ

---

[۱] الفنسٹن کی تاریخ ہند کا دسواں باب (تجارت) [۲] طبع گیارہواں جلد ۲ ص ۲۶۴۔ [۳] سفرنامہ ابوزید ص ۱۲۴ طبع پیرس۔

''جہازات ہندوستان کے ساحل سے سبا (یمن) آتے ہیں اور وہاں سے مصر پہنچتے ہیں''۔ [۱]

اسی طرح آرٹی میڈروس جو مسیحؑ سے ۱۰۰ برس پہلے تھا وہ کہتا ہے ''سبا (یمن کی ایک قوم) آس پاس کے لوگوں سے تجارتی اسباب خریدتے ہیں اور وہ اپنے ہمسایوں کو دیتے ہیں اور اسی طرح دست بدست وہ اسباب شام اور جزیرہ تک پہنچ جاتا ہے۔ [۲]

اس قسم کے اور دوسرے بیانات سے بھی یہ ثابت ہے کہ عرب اس زمانہ میں بالکل مٹ نہیں گئے بلکہ یونانیوں کے ساتھ ساتھ ان کا کام بھی باقی رہا۔ [۳]

ہندوستان اور عرب کا دوسرا راستہ جو خلیج فارس کے ذریعہ تھا وہ ہمیشہ کھلا رہا اور سواحل کے پارسی اور عرب خشکی اور تری سے ہمیشہ اپنا سامان لاتے اور لے جاتے رہے۔ وہ ہندوستان کے پورے ساحلی مقامات اور بحر ہند کے ایک ایک جزیرہ کو دیکھتے بھالتے بنگال اور آسام ہو کر چین کو چلے جاتے تھے اور پھر وہاں سے اسی راستہ سے واپس آجاتے تھے۔

یورپ اور ہندوستان کا راستہ نہایت اہم تھا اور ہے اور اسی کے ذریعہ تاریخ میں بڑے بڑے انقلابات ہوئے ہیں۔ گذر چکا ہے کہ یہ راستہ پہلے خالص عربوں کے ہاتھوں میں تھا، جب یونانیوں نے حضرت مسیحؑ سے تقریباً ۳ سو برس پہلے مصر پر قبضہ کیا تو وہ اس دریائی شاہراہ پر قابض ہو گئے۔ حضرت مسیحؑ کے ۶ سو برس بعد جب اسلام آیا اور عربوں نے عروج پایا تو چھٹی صدی مسیحی میں وہ مصر سے لے کر اسپین تک

---

[۱] الفنسٹن کی تاریخ ہند جلد اول ص ۱۸۲ سنہ ۱۹۱۶ء۔ [۲] ڈنکر Duncker کی تاریخ قدیم (History of Antiquities) جلد اول ص ۳۱۰ و ۳۱۲۔ [۳] الفنسٹن صاحب کی بھی یہی تحقیق ہے، دیکھو ان کی تاریخ ہند جلد اول ص ۱۸۲ سنہ ۱۹۱۶ء۔

چھا گئے اور ساتھ ہی بحر روم پر بھی وہ قبضہ پا گئے اور بحر روم کے اہم جزیروں کویت اور سائپرس وغیرہ کو بھی انہوں نے اپنے مقبوضات میں داخل کر لیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دنیا میں تجارت اور سوداگری کی یہ سب سے بڑی سڑک عربوں کے ہاتھ میں آ گئی اور صدیوں تک وہ اس پر قابض رہے۔ چودھویں صدی عیسوی میں یورپ کی عیسائی قوموں نے عربوں کو رومی سرزمینوں سے نکالنے کی پوری کوشش کی مگر عین اس وقت جب وہ اسپین اور شمالی افریقہ میں کامیاب ہو رہے تھے اور راستہ کو صاف کر رہے تھے کہ ایشیائے کوچک سے ترکوں نے سر نکالا اور پھر بحر روم کا یہ راستہ مسلمانوں ہی کے پاس رہ گیا۔ اس وقت نے یورپ کی قوموں کو مجبور کیا کہ وہ ہندوستان کا کوئی دوسرا راستہ پیدا کریں۔ اسی کوشش کا نتیجہ ہے کہ شمالی افریقہ اور بحر روم کو چھوڑ کر جنوبی افریقہ کے راستہ سے ہندوستان کا سراغ لگایا گیا۔ اس راستہ میں ڈچ اور پرتگال اور بعد کو انگریز اور فرانسیسی بھی شریک ہو گئے اور ہندوستان کی وہ تجارت جو عربوں کے ہاتھوں میں تھی اس کو ان سے لڑ بھڑ کر چھیننے لگے۔ اس کشمکش میں اہل مغرب اور اہل مشرق کی ایک سخت دریائی جنگ بھی ہندوستان کے سواحل پر ہوئی۔ اس جنگ میں مشرق کو شکست ہوئی اور یہی شکست اہل مشرق کی تمام آئندہ شکستوں کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ اس جنگ میں مصری عربی اور دکن کی مختلف ہندو اور مسلمان سلطنتوں کے جنگی جہازوں کے بیڑے ایک ساتھ مل کر یورپین جہازراں قوموں کے جہازوں سے لڑتے تھے۔ اس شکست کا یہ نتیجہ ہوا کہ تقریباً اس زمانہ سے آج تک تمام جزائر ہند اور سواحل کی تجارت اہل یورپ کے ہاتھ میں آ گئی۔ مدراس کے عرب تاجروں کو جن کو مویلا کہتے ہیں جو اس وقت ہندوستان کے اس گوشہ اور جزیروں کی تجارت کے مالک تھے ان کے جہازوں کو ہر طرح تباہ و برباد کر دیا تھا۔

اس کے بعد بھی بحر روم کے قریب تر راستہ کی ملکیت کا خیال اہل یورپ کے دل سے دور نہیں ہوا، چنانچہ اس کو اور قریب تر کرنے کے لئے بحر احمر (ریڈ سی) اور بحر روم کے درمیان کی پتلی خشکی کھود کر نہر سویز نکالی گئی اور پھر مصر اور سویز پر قبضہ ضروری خیال کیا گیا تا کہ یورپ اور ہندوستان یہ اہم تاریخی راستہ ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو جائے۔

یہ وہ واقعات ہیں جو ہندوستان اور اس کے جزائر پر یورپین قوموں کے تاجروں کی آمد و رفت کے سلسلہ میں ہندوستان کی ہر تاریخ میں لکھے ہوئے ملتے ہیں۔ ان واقعات سے عربوں اور ہندوؤں کے تجارتی تعلقات کی تاریخ کے مختلف دور نمایاں ہوتے ہیں۔

ہندوستان اور عرب اور دوسرا تجارتی راستہ جس کا تعلق خلیج فارس سے تھا وہ بدستور عربوں کے ہاتھوں میں ہمیشہ نظر آتا رہا ہے، البتہ عمان، حضر موت اور عراق میں مختلف سلطنتوں کے ادلنے بدلنے اور بندرگاہوں کے ٹوٹنے اور بنٹنے سے تجارتی مرکز اس شہر سے اُس شہر یا اس بندرگاہ سے اُس بندرگاہ میں منتقل ہوتا رہا۔

بندرگاہ ابلہ

عربوں کے سنہ ۱۴ھ میں عراق پر قبضہ کرنے سے پہلے ایرانیوں کے زمانہ میں ہندوستان کے لئے خلیج فارس کا سب سے بڑا اور مشہور بندرگاہ اُبلہ تھا جو بصرہ کے قریب واقع تھا۔ اُبلہ سے ہندوستان کی تجارتی آمد و رفت اس کثرت سے تھی کہ اہل عرب اُبلہ کو ہندوستان ہی کا ایک ٹکڑا سمجھتے تھے۔ چین اور ہندوستان سے آنے والے جہازات یہیں ٹھہرتے تھے اور یہیں سے روانہ ہوتے تھے۔[1]

---

[1] اُبلہ کے حالات کے لئے دیکھو الاخبار الطّوال ابو حذیفہ دینوری سنہ ۲۲۸ھ صفحہ ۱۳۲ (لیڈن) و معجم البلدان یاقوت رومی ج ۱ ص ۸۸ و ج ۲ ص ۱۹۶ (مصر) و تاریخ بصرہ نعمان اعظمی (بغداد) حاشیہ ص ۱۱۔

ہندوستان کے بیوپار اور پیداوار کو عربوں کی نگاہ میں جو اہمیت حاصل تھی اس کا اندازہ اس سے ہوگا کہ حضرت عمر نے ایک عرب سیاح سے پوچھا کہ ہندوستان کے متعلق تمہاری رائے کیا ہے؟ اس نے تین مختصر فقروں میں اس بلاغت کا جواب دیا جس سے زیادہ بلیغ کوئی جواب نہیں ہوسکتا۔ اس نے کہا ''بحرہا در و جبلہا یاقوت و شجرہا عطر'' اس کے دریا موتی ہیں، اس کے پہاڑ یاقوت ہیں، اور اس کے درخت عطر ہیں [۱]

عراق کی فتح کے بعد حضرت عمر کو فکر ہوئی کہ عراق کی یہ بندرگاہ بھی عربوں کے قبضہ میں آئے، چنانچہ سنہ ۱۴ھ میں آپ نے اس پر قبضہ کرنے کا حکم دیا اور لکھا کہ ''اس کو مسلمانوں کا تجارتی شہر (قیروان یعنی کاروان) بنا دیا جائے'' [۲]۔ چنانچہ اس وقت سے لے کر سنہ ۲۵۶ھ تک یہ بندرگاہ قائم رہی [۳]۔ زنگیوں کی لڑائی میں سنہ ۲۵۶ھ میں یہ تباہ ہوگئی۔ عراق کی دوسری مشہور بندرگاہ بصرہ کے نام سے سنہ ۱۴ھ ہی میں عربوں نے بنالی تھی مگر وہ اُبلہ کی تجارتی حیثیت کو فنا نہ کرسکا اور اس کی وجہ غالباً یہ ہوئی کہ بصرہ خالص تجارتی مرکز ہونے کے بجائے عربوں کا جنگی اور سیاسی مرکز زیادہ بن گیا، مگر اس پر بھی ہندوستان، چین اور حبشہ کی تجارت کا رخ رفتہ رفتہ اُدھر مڑنے لگا اور اس نے سیاسی انقلابات کے باوجود بڑی رونق حاصل کر لی، خصوصاً پہلی صدی ہجری کے آخر میں سندھ پر عربوں کے قبضہ ہوجانے کے سبب سے یہ ہندوستان کی آمد و رفت کا مرکز بن گیا۔ کشتیوں اور جہازوں کے داخلہ کا محصول اس قدر بڑھ گیا تھا کہ وہ بغداد کی خلافت کا بڑا مالیہ ہوگیا، آخر میں سنہ ۳۰۶ھ میں مقتدر باللہ کے زمانہ میں اس کی سالانہ میزان ۲۲۵۷۵ دینار رہ گئی تھی۔

---

[۱] الاخبار الطوال دینوری ص ۳۲۶ (لیڈن) [۲] معجم البلدان یاقوت جلد ۲ ص ۱۹۶ (مصر)

[۳] تاریخ بصرہ الاعظمی (بغداد) حاشیہ ص ۱۱۔

سیراف

ہندوستان کے لئے خلیج فارس کی اس کے بعد سب سے بڑی بندرگاہ سیراف ہوئی، یہ بصرہ سے سات دن کی مسافت پر ایرانی حدود میں واقع تھی۔ تیسری صدی ہجری میں اس کے اقبال کا ستارہ طلوع ہوا، بڑے بڑے جہاز رانوں، بحری تاجروں اور دریائی سوداگروں کا مقام بن گیا، ہندوستان اور چین کو یہیں سے جہازات روانہ ہوتے تھے اور وہاں سے جو جہازات سامان لے کر آتے تھے وہ یہیں آتے تھے، تیسری صدی ہجری میں اس بندرگاہ کی جو کیفیت تھی اس کا حال ابوزید کے بیان سے معلوم ہوتا ہے، وہ کہتا ہے ''یہ فارس کی بہت بڑی بندرگاہ ہے اور یہ بہت بڑا شہر ہے، جہاں تک نظر کام کرتی ہے اس میں صرف عمارتوں کا سلسلہ نظر آتا ہے۔ اس میں کھیتی یا زراعت خود نہیں ہوتی بلکہ سب چیزیں دریا کی راہ سے باہر سے آتی ہیں'' [1]

چوتھی صدی ہجری کے بیچ میں بشاری مقدسی نے جب اس کو دیکھا ہے تو وہ اس کا یہ حال بیان کرتا ہے: ''میں نے یہاں کی عمارتوں سے زیادہ خوبصورت عمارتیں تمام اسلامی دنیا میں نہیں دیکھیں، یہ عمارتیں سال کی لکڑی اور اینٹوں کی بنی ہیں، نہایت بلند ہیں، ایک ایک گھر کی قیمت ایک ایک لاکھ درہم سے زیادہ ہے'' [2]

اسی زمانہ کے قریب اصطخری نے اس کو دیکھا تھا، کہتا ہے: ''یہ بڑائی میں شیراز کے برابر ہے، اس کی عمارت سال کی لکڑی کی ہے، یہ لکڑی زنگستان افریقہ سے دریا کی راہ سے آتی ہے، دریا کے کنارے کئی کئی منزلوں کے مکانات ہیں، یہاں کے باشندے عمارت پر بڑی رقم خرچ کرتے ہیں، یہاں تک کہ ایک ایک تاجر ۳۰، ۳۰ ہزار اشرفی ایک ایک مکان پر خرچ کرتا ہے، سامنے باغ ہوتے ہیں، پانی پہاڑ

---

[1] معجم البلدان یاقوت ج ۵ ص ۱۹۳ (مصر) [2] احسن التقاسیم (لیڈن) ص ۴۲۶۔

سے آتا ہے“۔[۱]

بشاری کا بیان ہے کہ دیلمیوں کی سلطنت کے کسی انقلاب سے اور زلزلہ کے سبب سے سنہ ۳۲۶ھ میں وہ برباد ہو گیا تھا، اس کے بعد لوگوں نے اس کو پھر آباد کرنا چاہا [۲] اور کیا بھی اور کچھ روز اس کو کامیابی حاصل بھی ہوئی، یاقوت حموی نے چھٹی صدی ہجری کے آخر میں اس کو دیکھا تھا، اس کا بیان ہے کہ ”اس زمانہ میں وہاں ٹوٹے پھوٹے پرانے نشانات کے سوا کچھ نہیں۔ کچھ غریب غربا وہاں آباد ہیں، اور اس کی بربادی کا سبب یہ ہوا کہ ابن عمیرہ نے جزیرہ قیس کو آباد کر کے اس کی اہمیت مٹا دی۔

قیس

قیس یا کیش۔ یہ خلیج فارس میں عمان کے پاس ایک جزیرہ تھا، اس نے سیراف کو مٹا کر ہندوستان اور چین کی تجارت پر قبضہ کر لیا، اس کا حاکم عمان کا بادشاہ تھا، یاقوت نے چھٹی صدی ہجری میں جب اس کو دیکھا ہے تو یہ چھوٹا سا جزیرہ ہندوستانی تجارت کی بدولت نہایت خوبصورت اور سرسبز و شاداب بن گیا تھا، ہندوستان کے تمام جہازات یہیں آ کر ٹھہرتے تھے، اس جہازی آمد و رفت کا نتیجہ یہ تھا کہ یاقوت کہتا ہے کہ ”اس چھوٹے سے جزیرہ کے عرب حاکم کی قدر و منزلت ہندوستان کے راجاؤں میں بہت بڑی ہے، کیوں کہ اس کے پاس جہاز اور کشتیاں بہت ہیں“۔[۳] قزوینی (سنہ ۶۸۶ھ) کہتا ہے کہ ”قیس ہندوستان کی تجارت کی منڈی اور اس کے جہازات بندر ہے، ہر عمدہ چیز جو ہندوستان میں ہوتی ہے وہ یہاں لائی جاتی ہے“۔[۴]

---

[۱] بحوالہ معجم البلدان یاقوت جلد ۵ ص ۱۹۳ (مصر) [۲] احسن التقاسیم ص ۴۲۶۔ معجم البلدان یاقوت جلد ۷ ص ۱۲۶ (مصر) و ج ۵ ص ۱۹۳۔ [۴] آثار البلاد قزوینی مطبوعہ یورپ صفحہ ۱۹۱۔

ہندوستان کی بندرگاہیں

ہندوستان کی بندرگاہوں کے نام ہم کو پہلی صدی ہجری سے ملنے شروع ہوتے ہیں اور تیسری صدی تک بکثرت نام بڑھ جاتے ہیں اور پھر آخر تک وہی قائم رہتے ہیں، جن میں سے عربوں کے نزدیک خلیج فارس کے بعد سب سے پہلے بلوچستان کی بندرگاہ تیز، پھر سندھ کی بندرگاہ دیبل تھا، گجرات میں تھانہ کھنبایت، سوبارہ، جیمور، مدراس میں کولم ملی، ملیبار، راس کماری (قمار) اس کے بعد یا جزائر میں چلے جاتے تھے، یا بنگال ہوکر پھر وہاں سے قامرون (قامروب یا کاروپ) یعنی آسام چلے جاتے تھے، پھر وہاں سے چین، انہیں بندرگاہوں کے نام عربی جغرافیوں میں آیا کرتے ہیں، ابن حوقل نے دسویں صدی عیسوی میں سندھ کی بندرگاہ دیبل کی نسبت لکھا ہے کہ ''یہ تجارت کی بہت بڑی منڈی ہے اور یہاں مختلف قسم کی تجارتیں ہوتی ہیں''۔ [1]

دریائی تجارتی راستے

سلیمان تاجر تیسری صدی ہجری میں ان جہازوں کے راستے اس طرح بتاتا ہے کہ ''پہلے بصرہ اور عمان سے تمام سامان سیراف آجاتا ہے، اور یہاں سیراف میں وہ جہازوں پر لادا جاتا ہے اور یہیں سے پینے کا میٹھا پانی ساتھ لے لیا جاتا ہے، یہاں سے لنگر اٹھا تو مسقط آکر لنگر ڈالتے ہیں، یہاں سے پھر پینے کا پانی لیتے ہیں، اس کے بعد یہاں سے جہاز ہندوستان کو روانہ ہوجاتے ہیں اور ایک مہینہ میں کولم ملی پہنچتے ہیں، یہاں سے چین جانے والے جہازات چین چلے جاتے ہیں، کولم ملی جہازوں کے بنانے اور درست کرنے کا کارخانہ ہے اور یہاں سے میٹھا پانی بھی لے لیتے ہیں، اس کا محصول چینی جہازوں سے ایک ہزار درہم اور دوسرے جہازوں سے دس دینار

---

[1] سفرنامہ ابن حوقل، ص ۲۳۰، یورپ۔

سے لے کر ایک دینار تک لیتے ہیں۔'' [1]

سلیمان کے ۲۵ برس کے بعد ابوزید سیرافی بیان کرتا ہے: ''ہندوستان کے داہنے ہاتھ عمان کو جہاز پہنچتا ہے، یہاں سے عدن، عدن سے جدہ، جدہ سے جار (شام کا ساحل) پھر قلزم، یہاں سمندر ختم ہو جاتا ہے، اس کے بعد بربر کے سواحل پر سمندر بھرتا ہے اور حبشہ جاتا ہے، سیراف والوں کے جہازات جب جدہ پہنچ جاتے ہیں، تو یہاں سے آگے نہیں بڑھتے، مصر جانے والے جہازات یہاں تیار رہتے ہیں، سیراف کے جہازوں سے سامان اتار کر مصری جہازوں میں لاد دے جاتے ہیں، اور وہ ان کو قلزم لے جاتے ہیں، سیراف والے ہندوستان اور چین کے سمندروں سے زیادہ واقف ہیں، اس کے علاوہ ہندوستان اور چین کی بحری تجارت میں جو نفع ہے وہ دریائے قلزم کی تجارت میں نہیں'' [2]

ابن خرداذبہ جو تیسری صدی کے شروع میں تھا، جدہ کی تجارتی تعریف میں کہتا ہے کہ ''یہاں سندھ ہندوستان زنجبار، حبشہ اور فارس کی چیزیں ملتی ہیں'' [3] ساتھ ہی وہ بصرہ سے ہندوستان کے راستہ اور مسافروں کی تفصیل اس طرح کرتا ہے۔

بصرہ سے جزیرہ خارک	۵۰	فرسنگ
جزیرہ خارک سے جزیرہ تولن	۸۰	//
جزیرہ الوان سے جزیرہ ایرون	۷	//
جزیرہ ایرون سے جزیرہ خین	۷	//
جزیرہ خین سے جزیرہ کیش	۷	//

---

[1] سفرنامہ سلیمان تاجر ص ۱۵ پیرس سنہ ۱۸۱۱ھ ص ۱۵، ۱۶۔ [2] سفرنامہ ابوزید ص ۱۳۶ پیرس، سنہ ۱۸۱۱ء

[3] کتاب المسالک ابن خرداذبہ ص ۶۱ لیڈن۔

جزیرہ کیش سے جزیرہ ابن کاوان	۱۸	//
جزیرہ ابن کاوان سے جزیرہ ہرمز	۷	//
جزیرہ ہرمز سے تارا	۷	دن کی راہ

کہتا ہے کہ یہی تارا فارس اور سندھ کی حد فاصل ہے، یہاں سے جہاز دیبل روانہ ہوتا ہے۔

تارا سے دیبل	۸ دن کی راہ
دیبل سے دریائے سندھ کا دہانہ	۲ فرسنگ
دریائے سندھ سے اونگین	۴ دن کا راستہ

کہتا ہے کہ اونگین سے ہندوستان کی سرحد شروع ہوتی ہے۔

اونگین سے کولی	۲ فرسنگ
کولی سے سندان	۵ دن ۱۸ فرسنگ
سندان سے ملی	۵ دن کی راہ
ملی سے بلین	۲ // //

بلین سے راستے علاحدہ علاحدہ ہوتے ہیں، تو جو جہاز ساحل کے کنارے کنارے چلتے ہیں وہ بلین سے پاٹن جاتے ہیں جو دو دن کا راستہ ہے۔

پاٹن سے سنجلی اور کیش گان	۱/دن کی راہ
یہاں سے گوداوری کا دہانہ	۳ فرسنگ
یہاں کیلکان	۲/دن
یہاں سے سمندر	۱۰/فرسنگ
یہاں سے اور نجین	۱۲/فرسنگ

دوسرے جہازات بلین سے سراندیپ پھر جاوہ چلے جاتے ہیں اور بعض بلین ہی سے براہ راست چین چلے جاتے ہیں۔[۱]

یورپ اور ہندوستان کے تجارتی راستے سلطنت عرب ہوکر

مصر وشام وعراق و ایران اور بحر روم وقلزم و بحر ہند پر عربوں کے قبضہ ہوجانے سے بھی مشرق ومغرب کی تجارتی آمد و رفت بند نہیں ہوئی۔ مسلمان تاجر یورپ نہیں جاتے تھے اور رومی ان ملکوں میں نہیں آتے تھے، مگر ان دونوں قوموں کے درمیان یہودیوں کی قوم ایسی تھی جو درمیانگی کا کام کرتی تھی، وہ اسلامی ملک میں اہل کتاب تھے اور یورپ سے یونانیوں ہی کے زمانہ سے آشنا تھے، طرابزند جو بحر اسود (بلیک سی) کے ساحل پر اشیائے کوچک اور روس کی سرحد ہے، وہ مسلمان اور عیسائی تاجروں کے ملان کی جگہ تھی، وہ اس سے آگے نہیں بڑھتے تھے، [۲] لیکن یہودی تاجر بڑی آسانی سے اسلامی اور عیسائی دونوں دنیاؤں کو ایک ساتھ عبور کر لیتے تھے، ابن خرداذبہ لکھتا ہے کہ ''یہ عربی، فارسی، لاطینی، فرنگی، اسپینی اور سلاوی زبانیں بولتے ہیں، یہ پورب سے پچھّم اور پچھّم سے پورب خشکی اور تری میں دوڑتے پھرتے ہیں، یہ لونڈی، غلام، دیبا، ریشم کے کپڑے، سمور، پوستین، اور تلوار بھیجتے ہیں، یہ فرنگستان سے سوار ہوکر بحر روم کے مصری ساحل پر آتے ہیں، وہاں خشکی پر اتر کر تجارت کے سامان کو جانوروں کی پیٹھوں پر لاد کر قلزم (ریڈسی) لاتے ہیں۔ یہاں پھر جہاز پر بیٹھ کر جدہ آتے ہیں اور یہاں سے سندھ ہندوستان اور چین جاتے ہیں اور وہاں سے پھر اسی راستہ سے لوٹ آتے ہیں، دوسرا راستہ یہ اختیار کرتے ہیں کہ یورپ سے چل کر بحر روم

---

[۱] ابن خرداذبہ ص ۶۱۔۶۴ (لیڈن) [۲] نخبۃ الدھر فی عجائب البر والبحر صوفی دمشقی ص ۱۴۶۔

سے نکل کر انطاکیہ (شام) آتے ہیں اور پھر خشکی کی راہ یہاں سے جابہ (عراق) چلے جاتے ہیں اور وہاں سے نہر فرات میں سوار ہوکر بغداد آتے ہیں، پھر جہاز میں سوار ہوکر دجلہ کی راہ سے ابلہ پہنچتے ہیں، اور یہاں سے عمان، سندھ ہندوستان اور چین چلے جاتے ہیں''۔[1]

روسی تاجر

یہودیوں کے علاوہ ابن خرداذبہ نے روسی تاجروں کا ذکر کیا ہے جو تری اور خشکی دونوں میں سفر کرتے ہیں اور عیسائی ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں، (روسی دسویں صدی عیسوی میں عیسائی ہوئے ہیں) ابن خرداذبہ کا بیان ہے کہ یہ لوگ سلاوی (صقالیہ) نسل کے ہیں، یہ سلاویا سے نکل کر بحر روم میں سوار ہوتے ہیں، قیصر روم ان سے دسواں حصہ (عشر) لیتا ہے، یہاں سے وہ بحر جرجان (کیسپین سی) کے کسی ساحل پر آکر اترتے ہیں، وہاں سے خشکی کی راہ اونٹوں پر بغداد آتے ہیں اور یہاں عیسائی بن کر جزیہ ادا کرتے ہیں۔

یہ پورا راستہ کبھی خشکی سے بھی طے کرتے ہیں، وہ اسپین یا فرانس سے سوس الاقصی (شمالی افریقہ) آتے ہیں، وہاں سے طنجہ، وہاں سے الجزائر، ٹیونس اور طرابلس ہوکر مصر، مصر سے رملہ (شام) ہوکر دمشق، دمشق سے کوفہ، پھر بغداد، پھر بصرہ، پھر اہواز پھر فرانس، پھر کرمان، پھر (بلوچستان ہوکر) سندھ، پھر ہندوستان، پھر چین۔[2]

خراسان سے ہندوستان کا کارواں

مسعودی جو ہندوستان سنہ ۳۰۵ھ کے قریب آیا تھا اور بلخ و خراسان سے بھی گزرا تھا وہ بیان کرتا ہے کہ ''خراسان سے چین کو خشکی کا راستہ بھی ہے اور ہندوستان کا

---

[1] ابن خرداذبہ ص ۱۵۳۔ ۱۵۴ (لیڈن) [2] ابن خرداذبہ ص ۱۵۳۔۱۵۴

ملک خراسان سے مل جاتا ہے، اور سندھ سے ایک طرف ملتان پر اور دوسری جانب منصورہ پر ملتان ہے، اور قافلے خراسان سے سندھ کو اور اسی طرح ہندوستان کو برابر آتے جاتے رہتے ہیں، جہاں یہ ملک زابلستان (افغانستان) سے مل جاتا ہے'' [۱]

ابن حرقل جو محمود غزنوی سے ۵۰ برس پہلے تھا کہتا ہے کہ'' کابل اور غزنین ہندوستان کی تجارت کی نکاسی کی جگہ ہیں'' [۲] اسیوان جس کو عرب عسیفان کہتے ہیں پنجاب میں ایک ہندو ریاست تھی، وہاں بھی مسلمان تاجر تھے'' [۳]

ہندوستان کے بحری سفر کا زمانہ

مسعودی نے بحر ہند کے اتار چڑھاؤ اور تلاطم اور سکون کے زمانے مقرر کئے ہیں اور اس حساب سے جہازات کی روانگی کے مہینے قرار دیئے ہیں، لکھا ہے کہ'' ہمارے یہاں (شاید بغداد) اور ہندوستان میں موسموں کا فرق ہے، ہمارے یہاں سے گرمی میں لوگ ہندوستان سردی گزارنے جاتے ہیں کہ جون (تیر ماہ) کے مہینے میں ہندوستان جہاز کم جاتے ہیں اور جو جاتے ہیں، وہ بہت ہلکے ہوتے ہیں اور ان میں زیادہ سامان نہیں لادا جاتا اور ان جہازوں کو تیر ماہی (جون والے) جہاز کہتے ہیں'' [۴]

ابوزید سیرافی کا بیان ہے کہ برسات کے زمانہ میں جہازات نہیں چلتے، ہندوستان والے اس زمانہ میں بیٹھ کر کھیتی باڑی کرتے ہیں یا کوئی پیشہ کرتے ہیں، اسی برسات پر ان کا گزارا ہے، اس میں چاول پیدا ہوتا ہے جو ان کی خوراک ہے۔ [۵]

عرب میں جہازرانی کے بعض ہندی الفاظ

عربوں کے ہندوستانی سواحل پر دریائی آمد و رفت کا یہ اثر ہوا کہ عربی

---

[۱] مروج الذہب مسعودی۔ [۲] ابن حرقل ص ۳۲۸ (یورپ) [۳] فتوح البلدان بلاذری ص ۴۴۶ (لیڈن) [۴] مروج الذہب مسعودی اعظمی [۵] سفرنامہ ابوزید سیرافی ص ۱۲۶۔

سفر ناموں اور جغرافیوں میں اور عرب اور فارسی ملاحوں کی زبانوں پر جہاز اور متعلقات جہاز کے ہندی نام زبانوں پر چڑھ گئے، ان میں سے ایک لفظ ''بارجہ'' ہے، بیرونی نے بتایا ہے کہ یہ اصل میں ہندی لفظ ''بیڑہ'' ہے جس کو عرب بارجہ کہتے ہیں (ہ عربی میں ج سے بدل جاتی ہے) اور اس کی جمع ''بوارج'' آتی ہے، اور چوں کہ سواحل ہند کے بحری ڈاکو انہیں کشتیوں پر ڈاکے ڈالتے تھے اس لئے بعد کو ''بوارج'' ہندوستان بحری ڈاکوؤں کو کہنے لگے [۱] جس طرح بحر روم کے دریائی ڈاکوؤں کو ''قرصان'' کہتے ہیں اور آج کل کی عربی زبان میں بارجہ جنگی جہازوں کے بیڑہ کو کہتے ہیں۔

دوسرا لفظ ''دونج'' ہے جس کی جمع ''دوانج'' آتی ہے [۲] یہ ہندی ''ڈونگی'' کی عربی شکل ہے، تیسرا لفظ ''ہوری'' اب بھی بمبئی والے ہوری بولتے ہیں۔

تین لفظ اور ہندوستان یا ہندوستانی جزیروں کی پیداوار جن کی اصلیت ٹھیک نہیں معلوم۔ ''بلیج'' جہاز کی جہت کو کہتے ہیں ''جوش'' کشتی کے رسے کو اور ''کنیر'' ناریل کی چھال کی رسی کو جو جہازوں کے باندھنے اور تختوں کے سینے میں کام آتی تھی، یہ الفاظ ہندی الاصل ہیں [۳] ایک لفظ ایسا ہے جو اس زمانہ کی مشرقی بین الاقوامی بحری تجارت کی مختصر تاریخ ہے، یہ لفظ عربی میں ناخوذہ ہے اور اس کی جمع نواخذہ ہے، لیکن ہندوستان اس کی فارسی شکل سے زیادہ واقف ہے، بہ معنی ناخدا، یہ اصل میں ناؤ خدا ہے، ناؤ ہندی ہے، خدا مالک کے معنی میں فارسی ہے، حافظ کہتے ہیں: ما خدا داریم مارا ناخدا در کار نیست۔

---

[۱] کتاب الہند بیرونی ص ۱۰۲ (لیڈن) عجائب الہند بزرگ ص ۱۱۴ (پیرس) [۲] یاقوت حموی کی معجم البلدان لفظ قیس ج ۷ و عجائب البلدان بزرگ ص ۶۶ مطابع بریل لیڈن۔ [۳] دیکھو سواء السبیل فی البواد والدخیل، ڈاکٹر آرنلڈ۔

ہندوستانی پیداوار اور بیوپار

یہ عرب سوداگر ہندوستان اور ہندوستان کے جزیروں سے اپنے ملک کو کیا لے جاتے تھے اس کا سرسری اندازہ اس بیان سے ہوگا جو سنہ ۱۴ھ میں ایک عرب سیاح نے حضرت عمر سے کہا تھا کہ ''ہندوستان کا دریا موتی'' اس کا پہاڑ یاقوت اور اس کا درخت عطر ہے''۔ اس سے معلوم ہوگا کہ چھٹی صدی عیسوی میں اہل عرب ہندوستان سے موتی جواہرات اور خوشبو کی چیزیں لے جاتے تھے، نویں صدی عیسوی میں ایک عرب سیاح اس کا سبب بیان کرتا ہے کہ سیراف کے جہاز بحر احمر ہو کر مصر کیوں نہیں جاتے اور جدہ سے لوٹ کر ہندوستان کیوں چلے جاتے ہیں؟ کہتا ہے ''اس لئے کہ وہ چین اور ہندوستان کے سمندر کی طرح جس کے پانی میں موتی اور عنبر ہوتا ہے اور جس کے پہاڑوں میں جواہرات اور سونے کی کانیں ہیں اور جس کے جانوروں کے منہ میں ہاتھی دانت ہیں اور جس کی پیداوار میں آبلوس، بید، عود، کافور، لونگ، جوز بوا (جائے پھل) بکم، صندل اور ہر قسم کی خوشبو کی چیزیں ہوتی ہیں اور جس کے پرندوں میں طوطا اور مور ہیں اور جس کی زمین کا فضلہ مشک اور زباد (ایک جانور کا خوشبودار پسینہ) ہے''۔[1]

ابن خرداذبہ (سنہ ۲۵۰ھ) جو آٹھویں صدی عیسوی کے کچھ بعد تھا، وہ ہندوستان کی ان پیداواروں اور بیوپار کی جو عرب اور عراق جاتی تھیں، یہ فہرست دیتا ہے: خوشبو، لکڑیاں، صندل، کافور، لونگ، جوز بوا (جائے پھل) کباب چینی، ناریل اور سن کے کپڑے اور روئی کے مخملی کپڑے اور ہاتھی اور سراندیپ سے ہر قسم کے یاقوت، موتی بلور اور سنباذج جس سے جواہرات درست کئے جاتے ہیں اور ملیبار سے سیاہ مرچ اور گجرات سے سیسہ اور دکھن سے بکم اور داذی اور سندھ سے کٹ (ایک ہوا) اور بانس اور بید۔[2]

---

[1] ابوزید سیرافی ص ۱۳۵ پیرس، سنہ ۱۸۱۱ء [2] کتاب المسالک والممالک ابن خرداذبہ ص ۷۱ (لیڈن)

مسعودی (سنہ ۳۰۳ ھ) اور بشاری (سنہ ۳۷۰) دونوں نے کھمبایت (کاٹھیاواڑ) کے جوتوں کی تعریف کی ہے، جو یہاں سے بن کر باہر جاتے تھے [۱] تھانہ (بمبئی) کے کپڑے مشہور تھے، وہ یا یہیں بنتے تھے یا اندر ملک سے آتے تھے، مگر اسی بندرگاہ سے باہر جاتے تھے، بہر حال ان کو تھانہ کے کپڑے کہتے تھے [۲]

مسعود بن مہلہل جو سنہ ۳۳۱ ھ میں ہندوستان آیا تھا اور جنوبی ہندوستان کی اس نے سیر کی تھی وہ کولم (واقع ٹراونکور مدراس) کے حال میں لکھتا ہے: ''یہیں وہ مٹی کے برتن (غضائر) [۳] تیار ہوتے ہیں جو ہمارے ملک میں چینی کر کے بکتے ہیں، لیکن دراصل وہ چینی نہیں ہیں کیوں کہ چین کی مٹی کولم کی مٹی سے سخت ہوتی ہے اور آگ پر زیادہ دیر ٹھہر سکتی ہے، کولم کی مٹی (غضائر) کا رنگ میلا ہوتا ہے اور چینی مٹی کا سفید اور دوسرے رنگ یہاں ساگون کی لکڑی اتنی لمبی ہوتی ہے کہ کبھی ۱۰۰ ہاتھ تک پہنچ جاتی ہے، نیز بقم (بکم) بید، نیزہ کی لکڑی بھی وہاں بہت ہے اور ریوند چینی، تیز پات جو نہایت کمیاب ہے اور جو آنکھوں کی بیماری میں بہت مفید ہے اور یہیں سے عود، کافور اور لوبان بھی تاجر لے جاتے ہیں [۴]

ہندوستان سے ایک قسم کا زہر بھی باہر جاتا تھا جس کا نام قزوینی نے ''بیش'' لکھا ہے، یہ ''بس'' کی خرابی ہے جو ہندی میں زہر کو کہتے ہیں [۵]

---

[۱] مروج الذہب مسعودی جلد اول ص ۳۵۲ پیرس و احسن التقاسیم بشاری (لیڈن) ص ۴۸۲ [۲] تقویم البلدان ابوالفدا ص ۳۰۹ [۳] غضائر کا واحد غضارہ ہے، اس کے معنی خوشبو کے ہیں، مگر غالباً بید کو یہ چینی کے برتنوں کے معنی مستعمل ہوا ہے، (دیکھو معجم البلدان یاقوت ج ۸ ص ۳۴۸ اخذ نیروان [۴] آثار البلاد قزوینی ص ۷۰ کوٹنجن (سنہ ۱۸۴۸ء) [۵] ایضاً ص ۸۵

الا یچی

الا یچی جس قدر مفرح اور دل پسند چیز ہے اسی قدر اس کی لغوی اصلیت بھی دل چسپ ہے، کارومنڈل اور ملیبار کے بیچ میں ایک راس کا نام راس ہیلی ہے،[1] الا یچی کا مخزن یہی ہے، خیال یہ ہے کہ سنسکرت میں اس کو ایل اور فارسی میں اس کو چر ہیل کہتے ہیں، وہ نام اسی راس ہیلی سے لیا گیا ہے، اس ایل سے اردو میں ایلا یچی (الا یچی) کہتے ہیں جس طرح عود کا نام جومنڈل (کارومنڈل) سے جاتا تھا، عربوں میں منڈل ہوگیا۔[2]

دسویں صدی عیسوی کے آخر میں مسعودی کہتا ہے کہ "دیپ (مالدیپ اور سنگلدیپ وغیرہ جزائر ہند) سے ناریل اور یہی سے بقم (بکم) کی لکڑی، بید اور سونا تاجر لے جاتے ہیں"[3] مہراج کے جزیروں کی دولت اس طرح وہ بیان کرتا ہے کہ "ان جزیروں میں طرح طرح کی خوشبوئیں ہیں، یہی سے کافور، عود، لونگ، جائے پھل، کباب چینی، جاوتری، بڑی الا یچی، وغیرہ لے جاتے ہیں"[4] اور بعض ان جزیروں سے چھوٹی چھوٹی کشتیوں پر بیٹھ کر جو صرف ایک لکڑی کو کھود کر بنا لیتے ہیں، ناریل، گنے، کیلے اور ناریل کا پانی لے کر آتے ہیں اور لوہا تبادلہ میں لیتے ہیں۔[5]

ابن الفقیہ ہمدانی (سنہ ۳۳۰ھ) میں لکھتا ہے کہ "ہندوستان اور سندھ کو اللہ تعالی نے یہ خصوصیت دی ہے کہ وہاں ہر قسم کی خوشبو، جواہرات جیسے یاقوت اور الماس وغیرہ اور گینڈا اور ہاتھی اور مور اور عود، عنبر، لونگ، سنبل، خولنجان، دارچینی، ناریل، ہڑ، توتیا، بکم بید، صندل، ساگون کی لکڑی اور سیاہ مرچ پیدا ہوتی ہے۔[6]

---

[1] ابن بطوطہ ج دوم، (تقویم البلدان ابو الفدا ص ۴ تا ۳ [2] آثار البلاد قزوینی (گوٹنجن) ص ۸۲، [3] مروج الذہب باب ۱۶ [4] ایضاً [5] سلیمان تاجر ص ۱۸۔ [6] کتاب البلدان ابن الفقیہ الہمدانی ص ۲۸۰ (لیڈن)

لغت عربی کی قدیم شہادت

اس بات کے جاننے کے لئے کہ ہندوستان سے اہل عرب کیا کیا چیزیں اپنے وطن لے جاتے تھے، خود عربی زبان کی لغت میں بعض ذرائع موجود ہیں، عرب میں ہندوستان کی بنی ہوئی تلواریں مشہور تھیں، اسی لئے تلوار کے نام ہندی، ہندوانی، مہند، عام طور سے عربی میں مستعمل ہیں، حسب ذیل الفاظ عربی میں ہندی الاصل ہیں جو اپنی اصلیت اور وطن کا خود پتہ دیتے ہیں، یہ زیادہ تر مسالوں اور خوشبوؤں اور دواؤں سے متعلق ہیں، ہم نے کوشش کی ہے کہ ان کی اصل ہندی شکل وصورت کا پتا لگایا جائے تاکہ آج ان کے اہل وطن ان کو اپنے گھر کے عزیزوں کی طرح پہچان سکیں۔

عربی نام	ہندی	اردو
صندل	چندن	صندل
مسک	موشکا	مشک
تنبول	تامبول	پان (تنبول)
کافور	کپور	کافور
قرنفل	کنک، پھل	لونگ
فلفل	پیلی، پیلا	گول مرچ (اسی سے غالباً انگریزی لفظ پیپر بھی ہے۔)
فوفل	کوبل	سپاری، ڈلی
زنجبیل	زرنجابیرا	سونٹھ، ادرک
نیلوفر	نیلوپھل	نیلوفر
ھیلی	ایل	ایلا یچی (الائچی)

(دوائیں)

جائفل	جائے پھل	جائے پھل
اطریفل	تری پھل	اطریفل
شخیرہ	شکیر	توتیا
بلیلج	بہیزا	بہیزا
ہلہلج	ہوہ	ہلیلہ
بلادر	بہلانکہ	بہلاوہ

عود ہندی، قسط ہندی (کٹ)، سانج ہندی (تیز پات) قرطم ہندی اور تمر ہندی (ہندوستانی کھجور) یعنی املی یہ خود اپنی نسبت اپنے ساتھ رکھتی ہے، عود چوں کہ کارومنڈل سے جاتی تھی اس لئے عربوں نے اس کا نام ہی مندل رکھ دیا۔[1]

(کپڑوں کے اقسام)

عربی	ہندی	
قرفس	کرباس	ململ
شیت	چھینٹ	
فوطہ	پٹ لنگی وال رومال	

(رنگ)

نیلج	نیل
قرمز	کرمج

---

[1] آثار البلاد قزوینی ص ۸۲ گوٹنجن سنہ ۱۸۴۸ء۔

(پھل)

موز	موشہ	کیلا
نارجیل	ناریل	
انج	آم	
لیمون	لیمو (اسی سے انگریزی لیمن ہے)	

یہ الفاظ اپنی زبان حال سے خود ظاہر کر رہے ہیں کہ کس دیس میں وہ پیدا ہوئے تھے اور کہاجا کر یہ نیا رنگ وروپ پیدا کیا۔

قرآن پاک میں تین ہندی لفظ

اس سلسلہ میں اچھا خاصہ علماء میں اختلاف رہا ہے، کہ قرآن پاک میں کسی غیر زبان کا لفظ ہے یا نہیں؟ لیکن فیصلہ یہی ہوا ہے غیر زبان کے ایسے الفاظ موجود ہیں جو عربی کی زبان میں آکر مستعمل ہو گئے تھے اور وہ اپنی پہلی صورت بدل کر عربی زبان کے لفظ بن گئے، حافظ ابن حجر اور حافظ سیوطی نے قرآن پاک کے اس قسم کے لفظ جمع کئے ہیں، ہم ہندیوں کو بھی فخر ہے کہ ہمارے دیس کے بھی چند لفظ ایسے خوش نصیب ہیں جو اس پاک اور مقدس کتاب میں جگہ پا سکے، پہلے علماء نے جن الفاظ کا ہندی ہونا ظاہر کیا تھا وہ تو لغو و بے بنیاد تھے، مثلاً ''ابلعی'' کی نسبت یہ کہنا کہ ہندی میں اس کے معنی ''پینے'' کے ہیں یا ''طوبیٰ'' کو ہندی کہنا، جیسا سعید بن جبیر سے روایت ہے،[1] بے بنیاد ہے، مگر اس میں شک نہیں کہ جنت کی تعریف میں اس جنت نشان ملک کی تین خوشبوؤں کا ذکر ضرور ہے یعنی مسک، (مشک) زنجبیل (سونٹھ یا ادرک) اور کافور (کپور)۔

---

[1] دیکھو الاتقان فی علوم القرآن نوع ۳۸۔

تورات کی شہادت
عربوں کی ہندوستان تجارت کی قدامت پر

اوپر کے بیانات اور الفاظ کی لغوی تحقیق کو سامنے رکھ کر تورات کے ان مختلف حوالوں پر غور کرو۔ مسیح سے دو ہزار برس پہلے جو عرب تاجر بارہا مصر کو جاتے دکھائی دیئے ہیں ان کا سامان یہ تھا، بلسان صنوبر اور دوسری خوشبودار چیزیں،[1] یمن کی ملکہ حضرت سلیمان کے لئے جو تحفہ سنہ ۹۵۰ ق م میں شام لائی تھی وہ بھی ''خوشبو کی چیزیں، بہت سا سونا اور بیش قیمت جواہر''[2] جز قیال نبی (سنہ ۵۲۸ ق م) کے زمانہ میں اوزال (یمن) سے فولاد، تیز پات اور مسالہ، عرب ہی ملک شام کو لے جاتے تھے، حزقیال نبی کہتے ہیں کہ '' اوزال (یمن) سے تیرے بازار میں آبدار فولاد، تیز پات اور مسالہ بیچنے آتے ہیں''[3] یہ اچھی طرح معلوم ہے کہ لوبان اور قسم قسم کے خوشبو پھول خود یمن میں پیدا ہوتے تھے، مگر آبدار فولاد (تلوار) تیز پات اور مسالوں کا ملک ہندوستان ہی تھا اور تلوار تیز پات اور مسالوں کا ملک وہی آج بھی ہے، اس سے صاف ظاہر ہے کہ عربوں کے ہندوستان کے تجارتی تعلقات مسیح سے کم از کم دو ہزار برس پہلے سے ہیں۔

ہندوستان کی پیداوار اور بیوپار
عرب سیاحوں کی نظر میں

ہندوستانی پہلوں میں سب سے پہلی چیز ان کی نظر میں ناریل ہے، نویں صدی عیسوی کا عرب سیاح ابوزید کہتا ہے کہ ''عمان کے عرب یہ کرتے ہیں کہ وہ ان مقامات میں جہاں ناریل ہوتے ہیں بڑھئیوں کے اوزار لے کر چلے جاتے ہیں، پہلے وہ

---

[1] پیدائش ۲۶:۳۷ [2] دوم ایام ۹:۹ [3] جز نیال ۱۹:۲۷

ناریل کا درخت کاٹ کر سوکھنے کو چھوڑ دیتے ہیں، جب وہ سوکھ جاتا ہے تو اس کے تختے کاٹ ڈالتے ہیں، اور ناریل کی چھال کو بٹ کر رسی تیار کرتے ہیں اور اسی سے تختوں کو سی کر کشتی تیار کرتے ہیں اور اسی کا مستول بناتے ہیں اور اس کے جھونجھے کو بن کر پال تیار کرتے ہیں، جب یہ جہاز بن کر تیار ہو چکتے ہیں تو پھر ان میں ناریل بھرتے ہیں اور ان کو بھر کر عمان لاتے ہیں اور بڑی دولت حاصل کرتے ہیں''۔[۱]

ناریل کے بعد وہ لیموں اور آم کے نام بہت تعجب سے لیتے ہیں، ابن حرقل (سنہ ۳۵۰ھ) سندھ کے ذکر میں کہتا ہے ''ان کے ملک میں سیب کے برابر ایک پھل ہوتا ہے جس کو ''لیموں'' کہتے ہیں ڈ جو بہت کھٹا ہوتا ہے اور ایک میوہ ان کے یہاں ہوتا ہے جو شفتالو کی طرح ہوتا ہے، اس کا نام ''انبج'' یعنی آم ہے، جس کا مزہ بھی شفتالوں کے قریب ہوتا ہے۔''[۲]

آم کے ہندی عاشق ذرا آم کی یہ عربی قدر دانی ملاحظہ فرمائیں

مسعودی کا بیان ہے کہ'' نارنگی اور لیموں بھی ہندوستان کی خاص چیزیں ہیں، یہ عرب میں تیسری صدی ہجری میں ہندوستان سے لائے گئے، اور پہلے عمان میں، پھر وہاں سے عراق و شام تک پہنچے، یہاں تک کہ وہ شام کے ساحلی شہروں اور مصر میں گھر گھر پھیل گئے''، مگر ان میں مسعودی کہتا ہے کہ'' وہ ہندوستان کا مزہ نہیں''۔[۳]

ابن حرقل (سنہ ۳۵۰ھ) سندھ اور گجرات کی پیداوار اور بیوپار کا یہ حال بیان کرتا ہے:

منصورہ، جس کا پرانا نام برہمن آباد ہے، یہاں لیموں اور آم ہیں اور گنے بھی ہیں، نرخ سستے ہیں سرسبزی ہے۔

الور، بڑائی میں ملتان کے برابر ہے، شہر پناہ ہے، دریائے سندھ کے

---

[۱] ابوزید ص ۱۳۱۔ [۲] ابن حرقل ص ۲۲۸۔ [۳] مروج الذہب ج ۲ ص ۴۳۹ یورپ۔

کنارے ہے، نہایت سرسبز و شاداب اور بڑے بیوپار کی جگہ ہے۔

دیبل، دریائے سندھ کے یورپ سمندر پر ہے، یہ بہت بڑی منڈی ہے اور مختلف قسم کی یہاں تجارتیں ہیں، یہ اس ملک کا بندرگاہ ہے، غلے بھی ہیں، یہاں کی آبادی صرف تجارت اور بیوپار کی وجہ سے ہے۔

کامیل۔ کامیل سے مکران تک بودھوں اور میدیوں کا ملک ہے، یہاں دوکوہان والے اونٹ ہوتے ہیں جن کی خراسان اور فارس میں نسل لینے کے بڑی قدر ہے۔

قندابیل۔ یہ بودھوں کا تجارتی شہر ہے، مکانات چھپروں اور جھونپڑیوں کے ہیں۔

جیمور اور کھنبایت (گجرات و کاٹھیاواڑ) یہاں زیادہ تر چاول ہے اور شہد بھی بہت ہے:

کلواں: یہاں غلّوں کی کثرت ہے، پھل کم ہیں، جانور اور مویشی زیادہ ہیں۔

کیزکتان (قزعدار کا پایہ تخت) ارزانی ہے، یہاں انگور اور انار اور سرد میوے ہیں، کھجوریں نہیں ہیں۔

قنجپور۔ مکران کا سب سے بڑا شہر ہے، یہاں گنے چھوہارے اور فانید (ایک قسم کا حلوا) بنتا ہے جو یہاں سے تمام دنیا میں جاتا ہے۔

قندابیل۔ یہ ہندوستان کے غلوں کی بڑی منڈی ہے۔

اس کے بعد بشاری مقدسی (سنہ ۳۷۵ھ) کا بیان نہایت مفصل ہے، وہ ایک ایک شہر کا حال بیان کرتا ہے۔

ویہند۔ یہ منصورہ سے بڑا شہر ہے، نہایت پاک و صاف شہر ہے، نہایت اچھے پھل، بڑے بڑے درخت، ارزاں نرخ، شہد ایک درہم کا تین من (عربی میں من بہت چھوٹا ہوتا تھا) روٹی اور دودھ کی ارزانی کا حال مت پوچھو، اخروٹ اور بادام

کے درخت بکثرت ہیں۔

قنوج (ملتان کے پاس) بڑا شہر ہے، شہر پناہ ہے، یہاں گوشت بہت سستا ہے، باغ بکثرت ہیں، منڈی بہت نفع بخش ہے، کیلے یہاں سستے ہیں مگر گیہوں بہت کم ہے، ان کی غذا زیادہ چاول ہے۔

ملتان۔ منصورہ کے برابر ہے، وہاں سے زیادہ یہاں پھل نہیں، لیکن ارزانی وہاں سے زیادہ ہے، روٹی ایک درہم میں ۳۰ من فانیذ حلوا ایک درہم کا ۳ من، تجارت میں یہاں تاجر جھوٹ نہیں بولتے، یہاں کی تجارت کا حال بہت اچھا ہے۔

طوران سے فانیذ حلوا، سندان سے چاول اور کپڑے جاتے ہیں اور پورے سندھ میں فرش فروش بہت اچھے تیار ہوتے ہیں، باریک کپڑے اور ناریل اور منصورہ سے کھنبایت کے بنے ہوئے جوتے، اور سندھ سے ہاتھی اور ہاتھی دانت اور بیش قیمت چیزیں اور عمدہ دوائیں باہر جاتی ہیں، اور یہاں کی خاص پیداوار دو پھل ہیں، ایک کا نام لیموں ہے اور دوسرے کا آم، جو بہت لذیذ ہوتا ہے، مشرق اور فارس میں جو عمدہ بختی اونٹ ہوتے ہیں وہ سندھی ہی اونٹوں سے نسل لے کر تیار کئے جاتے ہیں، اور یہ سندھی اونٹ جن کو پالہ (فالج) کہتے ہیں ان کے دو کوہان ہوتے ہیں اور وہ اتنے قیمتی ہوتے ہیں کہ دوسرے ملکوں میں صرف بادشاہ ہی کی سواری میں وہ کام آتے ہیں، اسی طرح کھنبایت کے جوتوں کی بھی قدر ہے۔[1]

مسعودی نے ہندوستان کے مور کی تعریف کی ہے، اور لکھا ہے کہ ''گو ہندوستان سے لے جا کر عراق وغیرہ میں ان کی نسل لے جائی گئی اور تیار کی گئی مگر وہ ہندوستان کا قد و قامت اور رنگ و روپ ان میں نہیں''۔[2]

---

[1] احسن التقاسیم فی معرفۃ الاقالیم بشاری مادی ص ۴۷۴-۴۸۲ (لیڈن) [2] مورج الذہب ج ۲ ص ۴۲۸ (لیڈن)

ہندوستان کے باریک کپڑوں کی تعریف ہمیشہ سے ہے اور ہر قوم کے بیانات سے اس کا ثبوت ملتا ہے کہ یہاں نہایت باریک کپڑے بنے جاتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ مصری ممی جن باریک کپڑوں میں لپٹی ہوئی ملتی ہے وہ ہندوستان ہی کی ساخت کے ہیں۔ بہر حال یہ تو قیاس ہے مگر آٹھویں صدی عیسوی کا ایک عرب سیاح سلیمان ہندوستان کے ایک مقام کی نسبت لکھتا ہے کہ ''یہاں جیسے کپڑے بنے جاتے ہیں ویسے کہیں نہیں بنے جاتے اور اتنے باریک ہوتے ہیں کہ ایک 'پورا کپڑا' (یا تھان) ایک انگوٹھی میں آجاتا ہے۔ یہ کپڑے سوتی ہوتے ہیں اور ہم نے وہ کپڑے خود بھی دیکھے ہیں''۔[۱]

عرب گینڈے کی سینگھ بھی یہاں سے چین لے جاتے تھے۔ اس میں تصویریں بن جاتی تھیں، اس کی پیٹی بنتی تھی جو اس قدر بیش قیمت ہوتی تھی کہ ایک ایک کی قیمت چین میں دو دو تین تین ہزار اشرفی ہوتی تھی۔[۲]

ایک جانور جس کے پسینہ سے خوشبو نکالتے تھے، اس کو عرب تاجر ہندوستان سے مراکش تک لے جاتے تھے[۳] کالا نمک بھی ہندوستان سے باہر جاتا تھا۔[۴]

پان (تنبول) کا مفصل بیان عربوں میں مسعودی نے کیا ہے جو تقریباً آج سے نو سو برس پہلے کا بیان ہے۔ کہتا ہے ''پان (تنبول) ایک قسم کا پتہ ہوتا ہے جو ہندوستان میں پیدا ہوتا ہے۔ اس کو چونا اور قلمی ملا کر جب کھاتے ہیں تو انار کے دانوں کی طرح دانت لال ہو جاتے ہیں اور منھ میں خوشبو ہو جاتا ہے اور قلب میں فرحت ہوتی ہے اور اہل ہند سپید دانت اور جو پان نہیں کھاتا اس کو ناپسند کرتے ہیں''۔ خیر

---

[۱] سفر نامہ سلیمان تاجر ص ۳۰ (پیرس) [۲] ایضاً ص ۳۱ ۔ [۳] تحفۃ الحباب ابو حامد غرناطی ص ۴۹ (پیرس) [۴] مفاتیح العلوم خوارزمی ص ۲۵۹ (لیڈن)

پان کا بیان تو یہاں ضمنی ہے، اس زمانہ میں پان جیسی نازک چیز عرب نہیں پہنچ سکتی تھیں مگر ڈلی برابر پہنچتی تھی۔ سنہ ۳۰۵ ھ میں مسعودی کہتا ہے کہ ''اب آج کل یمن اور حجاز میں مکہ میں لوگ ڈلی بڑی کثرت سے کھانے لگے ہیں''۔[۱] اب آج ہمارے زمانہ میں تو پان عدن تک سرسبز و شاداب اور مکہ میں سوکھے کثرت سے پہنچنے لگے ہیں۔ یہ ہندوستانیوں کی وضع داری کی برکت ہے۔ بہرحال ڈلی ہندوستان سے عرب اسی زمانہ سے جارہی ہے۔ عود عرب میں راس کماری کا مشہور تھا اور یہیں سے جاتا تھا،[۲] اور چوں کہ وہ راس کماری کو قمار کہتے تھے اس لئے عود قماری ان کے ہاں مشہور تھا۔ مشک تبت سے لاتے تھے،[۳] الماس کشمیر کے پہاڑ سے آتا تھا۔[۴]

ہندوستان کی بحری درآمد

یہ چیزیں تو خیر ہندوستان سے باہر جاتی تھیں، مگر ان کے بدلے اہل عرب ہندوستان والوں کو کیا لاکر دیتے تھے، جزائر والے تو اپنی ضرورت کی چیزیں لیتے تھے جیسے کپڑے۔ بعض چیزوں کے متعلق عربوں نے لکھا ہے کہ وہاں لوگ ننگے رہتے ہیں، وہ کپڑے نہیں لیتے، لوہا لیتے ہیں۔[۵]

تیسری صدی ہجری میں (نویں صدی عیسوی میں) سندھ کے طلائی سکوں کی ہندوستان میں مانگ رہتی تھی۔ وہاں کی ایک اشرفی یہاں تین تین اشرفی کو بکتی تھی۔ مصر سے زمرد کی انگوٹھی بن کر یہاں آتی تھی جو تکلف کے ساتھ ڈبیوں میں رکھی ہوتی تھی۔ مرجان اور ایک اور معمولی پتھر کی جس کا نام دھنج تھا یہاں مانگ تھی۔[۶]

---

۱ مروج الذہب ج ۲ ص ۸۴ (پیرس) ۲ سفرنامہ سلیمان و ابوزید ص ۹۳ و ۱۳۰ ۳ ایضاً ص ۱۱۱
۴ عجائب الہند بزرگ ص ۱۲۸ (پیرس) ۵ سفرنامہ سلیمان و ابوزید ص ۹۔ ۶ سفرنامہ سلیمان و ابوزید ص ۱۴۵

شراب بھی مصر سے یہاں آتی تھی [۱] اور روم سے ریشمی کپڑے اور سمور اور بوستین اور تلواریں آتی تھیں [۲] فارس سے گلاب کا عرق جو مشہور تھا ہندوستان آتا تھا [۳] بصرہ سے دیبل (سندھ) کی بندرگاہ میں کھجوریں آتی تھیں [۴] کارومنڈل میں عرب سے گھوڑے آتے تھے۔[۵]

کیا اہل ہند بھی جہاز راں تھے؟

ہندوستان کی خشکی اور تری کی ہر قسم کی بیرونی تجارت کے بیان میں کہیں ہندوؤں کا نام نہیں آتا اور نہ ہندوؤں کا نام دریائی سفر کرنے والوں اور جہاز چلانے والوں میں کسی نے ذکر کیا ہے، یونانیوں سے لے کر عربوں تک کی تاریخ جغرافیے اور سفرنامے اس سے خالی ہیں اور ہر جگہ ہندوستان کے بحری تاجروں کی حیثیت سے یونانیوں رومیوں اور عربوں ہی کے نام آتے ہیں، یہاں تک کہ مارکوپولو کے سفرنامہ میں بھی عربوں ہی کے نام ہیں اور اسی بنا پر الفنسٹن صاحب وغیرہ نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ دریائے سندھ اور گنگا میں کشتی اور ڈونگی اور سمندر کے کنارے کنارے ایک بندر سے دوسرے بندر تک جانے کے سوا ہندوؤں نے سمندر کو پار کرنے کی ہمت نہیں کی، یہاں تک کہ سکندر کے زمانہ میں بھی دریائے سندھ میں یونانیوں کو نہ تو جہاز ملے اور نہ جہاز چلانے والے، ہاں چھوٹی چھوٹی ڈونگیوں اور ناؤں پر مچھوے البتہ ان کو ملتے رہے، ہاں، کارومنڈل کے لوگ بے شک جزائر جاوہ میں جانے کی ہمت کر سکے۔[۶]

---

[۱] سفرنامہ سلیمان و ابوزید ص ۱۴۵۔ [۲] ابن حرقل ص ۲۳۱۔ [۳] ابن خرداذبہ ص ۱۵۳ (لیڈن) [۴] ابن حرقل ص ۲۱۳۔ [۵] تقویم البلدان ابوالفدا ص ۳۴۹۔ [۵] ایضاً ص ۳۵۵۔ [۶] الفنسٹن کی تاریخ ہند، دسواں باب (تجارت)۔

لیکن ہمیں ان صاحبوں کی اس تحقیق سے اختلاف ہے، ہمارا خیال ہے کہ کل ہندو نہیں لیکن کم از کم سندھ اور گجرات کے لوگ اس سے مستثنیٰ ہیں، بلکہ منو جی کی شاستر میں ایک ایسا فقرہ ہے جو اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ اس زمانہ کے ہندوؤں میں کچھ لوگ ایسے تھے جو سمندر کے سفر سے آگاہ تھے، وہ فقرہ یہ ہے: [۱]

''سمندر کے راستہ میں خیر و عافیت، ملک، وقت، مطلب، ان چار کے دیکھنے والے جو سود قرار دیں وہ سود لینا''۔ (ادھیایہ ۸: ۱۵۷)

یونانی مؤرخ آرین (Arian) سکندر کے حال میں بیان کرتا ہے کہ ''ہندوستان میں اس کو اپنے جہازات خود تیار کرانے پڑے'' مگر ساتھ ہی یہ بھی لکھتا ہے کہ ''ہندوؤں کی چھوٹی ذات میں وہ ہیں جو جہاز بناتے ہیں، چلاتے ہیں، یا کھیتے ہیں، (ملاح) ایسے جو دریاؤں کو پار کر لیتے ہیں''۔ [۲]

یونانیوں کے ایک بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ بحر احمر کے دھانہ کے ایک جزیرہ میں جو شاید سقوطرہ ہو، عربوں اور یونانیوں کے ساتھ کچھ ہندوؤں کی بھی آبادی تھی۔ [۳]

اس میں کسی قسم کا شک و شبہ نہیں کہ مالدیپ، لنکا، جاوا اور دوسرے ملائی جزیروں کا اچھا خاصہ حصہ ہندو آبادی پر مشتمل تھا، ان کے رسوم اور مذہب بلکہ ان کی زبان تک ہندو ہونے کو ظاہر کرتی ہے، عرب سیاحوں اور تاجروں نے اسی لیے ان جزیروں کو ہند کا ٹکڑا یقین کیا اور اسی حیثیت سے ان کا ذکر کیا، بلکہ نویں صدی عیسوی کا سیاح ابوزید کہتا ہے کہ ''راس کماری بھی جاوہ کے مہراج نے فتح کر لیا تھا'' [۴] یہ بات خاص خیال کے قابل ہے کہ عربوں نے جاوہ کے بادشاہ کو ہمیشہ مہراج کہا ہے اور ان

---

[۱] منوشاستر ترجمہ اردو لالہ سوامی دیال نولکشور۔ [۲] الفنسٹن جلد اول ص ۱۸۲۔ [۳] ایضاً ص ۱۸۳۔

[۴] ابوزید ص ۹۷۔

جزیروں کو مہراج کی مملکت بیان کیا ہے۔

لیکن اس سے زیادہ یہ کہ نویں صدی عیسوی میں ابوزید سیرافی اس سلسلہ میں کہ ''اہل ہند ایک ساتھ مل کر نہیں کھاتے'' کہتا ہے کہ ''چنانچہ یہ ہندو سیراف (عراق کی بندرگاہ) آتے ہیں اور کوئی (عرب) تاجر ان کی دعوت کرتا ہے تو وہ کبھی سو اور کبھی سو سے زیادہ ہوتے ہیں مگر ان کے لیے اس کی ضرورت ہوتی ہے کہ ہر ایک کے سامنے علاحدہ ایک طبق رکھا جائے جس میں کوئی دوسرا شریک نہ ہو'' [۱] اس فقرہ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ عراق کی بندرگاہ میں بہ کثرت اور بڑی تعداد میں وہ کم از کم عربوں کے عہد میں آنے جانے لگے تھے، ہندوؤں کا کشمیر زیریں (پنجاب) سے سندھ تک دریا کا سفر کرتے رہنا اہل عرب نے بھی بیان کیا ہے۔ [۲]

اس سے زیادہ ایک اور ثبوت ہے کہ بزرگ بن شہریار ناخدا نے اپنی کتاب عجائب الہند میں بیسوں مقامات پر ''بانانیہ'' یعنی بنیا کے نام سے جہاز کے دوسرے مسافروں کی طرح ہندوستانی بیوپاریوں کا نام لیا ہے، بلکہ ایک جگہ اس نے دو لفظ علاحدہ علاحدہ استعمال کیے ہیں، یعنی ''بانانیہ اور تاجر'' [۳] جس سے مقصود ہندو بیوپاری اور عرب تاجر ہیں، عرب میں آج تک ہندو بیوپاری اور تاجر ''بانیہ'' اور جمع کی صورت میں ''بانانیہ'' ہی کہلاتے ہیں اور عراق، بحرین، عمان، سوڈان، مصوع، پورٹ سعید اور قاہرہ (مصر) میں ان کی آج بھی تجارتیں ہیں، حجاز اور مصر کے سفر میں ان بنیوں سے میری ملاقاتیں ہوئی ہیں۔

یہ روزمرہ کی بازاری عربی زبان اس خوبی سے بولتے ہیں کہ ہمارے یہاں کے اچھے اچھے مولوی ان کا منھ تاکتے رہیں، یہ لوگ زیادہ تر سندھی، ملتانی اور گجراتی

---

[۱] ابوزید ص ۱۴۶۔ [۲] عجائب الہند ص ۱۰۴۔ [۳] ایضاً ص ۱۶۵۔

ہوتے ہیں جو خدا جانے کب سے ان ملکوں میں آمد و رفت رکھتے ہیں، چنانچہ سنہ ۳۰۰ھ میں بھی یہ لوگ عدن کے پاس عرب جہازوں میں بیٹھتے نظر آتے ہیں۔ [۱]

بحر ہند کے جہازات

ہندوستان کے سمندر میں جو جہازات چلتے تھے اور جو بحر روم میں چلتے تھے ان دونوں میں ایک خاص فرق تھا، بحر روم کے جہازوں کے تختے لوہے کی کیلوں سے جڑے جاتے تھے اور بحر ہند کے جہازوں کے تختے ڈوری سے سلے جاتے تھے [۲] یہ جہاز کتنے بڑے ہوتے تھے اس کا اندازہ اس سے ہوگا کہ ان میں دو دو منزلیں ہوتی تھیں، علاحدہ علاحدہ کمرے ہوتے تھے، پانی پینے اور کھانے کا ذخیرہ ہوتا تھا، مسلمانوں کے علاوہ سامان تجارت اور اسباب کے گودام ہوتے تھے، جہازوں میں کام کرنے والے خلاصی اور ملاح اور حفاظت کرنے والے تیرانداز سپاہی خود ایک ہزار ہوتے تھے [۳] بزرگ بن شہریار ناخدا سنہ ۳۰۶ھ کا ایک قصہ سناتا ہے:

> ''سنہ ۳۰۶ھ میں سیراف سے ایک جہاز پر میں ہندوستان چلا، ہمارے ساتھ عبداللہ بن جنید کا جہاز اور سیاح کا جہاز بھی تھا اور یہ تینوں جہاز بہت بڑے تھے اور سمندر کے ممتاز جہازوں میں تھے اور وہ ان کے ناخدا اور ملاح بھی بہت مشہور تھے اور ان تینوں جہازں میں تاجر، ملاح، بنیا وغیرہ ملا کر بارہ سو آدمی تھے اور ان میں مال و اسباب اس کثرت سے تھا جس کا اندازہ نہیں جب گیارہ دن کے بعد تھانہ (بمبئی) کے نشانات ملے''۔ [۴]

---

[۱] عجائب الہند ص ۱۴۷۔ [۲] سفرنامہ سلیمان ص ۸۸۔ [۳] سفرنامہ ابن بطوطہ جلد ۲ (سفر چین)
[۴] عجائب الہند ص ۱۶۵ و ۱۴۷۔

اس سے اندازہ ہوگا کہ یہ جہاز اتنے بڑے ہوتے تھے کہ سامان و اسباب اور خلاصیوں اور ملاحوں کے علاوہ چار سو آدمی آرام کے ساتھ سفر کر سکیں، چین جانے والے جہاز اتنے بڑے ہوتے تھے کہ ان میں صرف جہاز کے تعلق کے ایک ہزار آدمی ہوتے تھے، چھ سو جہاز چلانے کے لیے اور چار سو تیر انداز اور نفطہ پھینکنے والے سپاہی، باقی مسافروں کا اندازہ کر لیجئے، ہر بڑے جہاز پر تین چھوٹی کشتیاں وقت بے وقت کے اتفاقات کے لیے ہوتی تھیں۔ [1]

بحری تجارت کی دولت

بحر ہند کی تجارت سے ہندوستان اور عرب دونوں کو جو فائدے پہنچتے تھے ان کا اندازہ بعض واقعات سے ہوتا ہے، ولبھ رائے کا پایۂ تخت مہانگر ''سونے کا شہر'' کہلاتا تھا، مہراج کا پایہ تخت (جزیرہ جاوہ) کے بازار میں دکانوں کا شمار نہ تھا، فقط صرافی کی دکانیں اس بازار میں ۸۰۰ تھیں [2] عمان میں موتیوں کا ایک تاجر تھا، اس نے ایک دفعہ دو نادر روزگار موتی پائے، جن کی قیمت بغداد کے خلیفہ نے ایک لاکھ درہم ادا کی [3] ایک ناخدا کا بیان ہے کہ ''سنہ ۳۱۷ھ میں کلہ (ہند) سے عمان سامان تجارت لے کر گیا، ہمارے جہاز پر اتنا مال و اسباب تھا کہ عمان کے حاکم نے ہمارے جہاز سے ۶ لاکھ دینار ٹیکس لیا، یہ اس لاکھ دینار کے علاوہ جس کو اس نے اپنی مہربانی سے معاف کر دیا یا لوگوں نے چوری سے اس کو چھپا لیا اور ظاہر نہیں کیا [4] اسی سال سراندیپ سے ایک اور جہاز آیا جس نے اپنا محصول چھ لاکھ ادا کیا [5] عمان میں اسحاق نام ایک یہودی تھا جو دلالی کا کام کرتا تھا، وہ ایک اور یہودی سے لڑ کر ہندوستان چلا آیا،

---

[1] سفرنامہ ابن بطوطہ جلد ۲ (کالی کٹ کا میدان) [2] عجائب الہند ص ۱۳۷۔ [3] ایضاً ص ۱۳۶۔
[4] ایضاً ص ۱۳۰ [5] ایضاً ص ۱۵۸۔

پھر چین چلا گیا اور تیس برس میں اتنی دولت پیدا کی کہ خود جہازوں کا مالک ہو گیا اور آخر کار تیس برس کے بعد سنہ ۳۰۰ ھ میں وہ پھر عمان آیا، تو اس نے عمان کے حاکم کو ایک لاکھ درہم کی رشوت اس لیے دی کہ اس کا اسباب سرکاری طور سے دیکھا بھالا نہ جائے، اس کے پاس مشک کا ذخیرہ اتنا تھا کہ ایک دفعہ اس نے ایک لاکھ مثقال (تولہ) مشک صرف ایک سوداگر کے ہاتھ فروخت کی اور اس کے علاوہ ٦٠ ہزار اشرفی کی مشک ہر دوسرے سوداگروں کے ہاتھ بیچیں [1] ایک اور شخص جو نہایت غربت کی حالت میں عمان سے روانہ ہوا تھا وہ واپس آیا تو پورا جہاز اس کے مال و اسباب سے لدا ہوا تھا، جس میں دس لاکھ اشرفی کی تو مشک تھی اور اسی قیمت کے ریشمی کپڑے اور جواہرات تھے، اس سے محصول ۵ لاکھ دینار وصول کیا گیا۔ [2]

دوسری طرف ان عرب تاجروں سے ہندوستانی سواحل کے راجاؤں کو بھی بڑی آمدنی ہوتی تھی، اسی لیے وہ ان کی بڑی قدر کرتے تھے [3] ابن بطوطہ نے جنوبی ہند کے ساحلی شہروں کا سفر کرتے ہوئے جابجا لکھا ہے کہ یہ ہندو راجہ ان عرب جہاز رانوں کو اس لیے ناخوش نہیں ہونے دیتے تھے کہ ان کے ملک کی آمدنی انہیں کی آمد و رفت سے ہے، کالی کٹ اور کارومنڈل کے راجہ اس بحری تجارت کی بدولت لاتعداد دولت کے مالک تھے، کارومنڈل کے ایک راجہ کے مرنے پر اس کے ایک مسلمان کارکن کو جو سونا اور جواہرات ہاتھ آئے ان کے اٹھانے کے لیے سات ہزار بیلوں کی ضرورت تھی، [4] اس کارومنڈل کو جب علاؤالدین خلجی کے سپہ سالار ملک کافور نے ایک دفعہ فتح کیا تو اس کو سرکاری خزانہ سے دوسری چیزوں کے علاوہ

---

[1] عجائب الہند ص ۱۰۸۔ [2] معجم البلدان یاقوت لفظ قیس۔ [3] ایضاً لفظ قیس [4] جامع التواریخ مندرجہ الیٹ جلد اول ص ٦٩ و ٧٠ و تاریخ وصاف مندرجہ الیٹ جلد ۳ ص ۳۲ و ۵۳۔

چھانوے ہزار من سونا[1] اور پانچ سومن موتی[2] اور جواہرات ملے'' موتی اور جواہرات کی قیمیت کو چھوڑ کر چھانوے ہزار من سونا کیا کم چیز ہے؟ علاؤالدین کے زمانہ میں تیرہ چوودہ سیر کے قریب من ہوتا تھا یعنی انگریزی حساب سے ۲۸ پونڈ کے برابر، اس لحاظ سے صرف اس سونے کا حساب ۲۶ لاکھ ۸۸ ہزار پونڈ ہوتا ہے۔

کارومنڈل کی تجارت تمام تر عرب، عراق، اور فارس کے سواحل سے تھیں، تفصیل آگے آئیگی۔

بحر روم سے ہندوستان کا دوسرا بحری راستہ عربوں نے دریافت کرلیا تھا۔

اوپر گذر چکا ہے کہ کس طرح پرتگالی جہاز رانوں نے بحر روم کو چھوڑ کر افریقہ کی پشت پر سے ہندوستان کا راستہ پایا اور یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ دریافت انہیں جہاز رانوں کی کوششوں کی ممنون ہے لیکن یہ سن کر تعجب ہوگا کہ اس دریافت کی عزت ان سے سینکڑوں برس پہلے ان عرب تاجروں کو حاصل ہے، جو بحر ہند میں اپنا جہاز چلایا کرتے تھے، یہ معلوم ہو چکا ہے کہ ہندوستانی سمندر اور رومی سمندر کے جہازوں کی ساخت میں کیا فرق تھا، بڑا فرق یہ تھا کہ بحر روم کے جہازوں کے تختے لوہے کی کیلوں سے جڑے جاتے تھے اور ہندوستانی سمندر کے جہازات مضبوط رسی سے جو کھجور یا ناریل کی چھال سے تیار ہوتی تھی، سی جاتی تھی، سلیمان تاجر جو سنہ ۲۳۷ھ میں تھا جس کا بار بار نام آچکا ہے، وہ اپنے سفرنامہ میں ایک جگہ لکھتا ہے:

''ان باتوں میں جو ہمارے زمانہ میں نئی معلوم ہوئیں اور ہم سے پہلے لوگوں کو ان کا علم نہ تھا ایک یہ ہے کہ کسی کو اس کا پہلے وہم و گمان بھی نہ تھا کہ وہ سمندر جس پر ہندوستان اور چین واقع ہیں، وہ کس طرح سے بحر شام (بحر روم یعنی میڈیٹرین سی)

---

[1] تاریخ ضیا برنی صفحہ ۳۳۳ مطبوعہ کلکتہ۔ [2] خزائن الفتوح امیر خسرو مطبوعہ علی گڑھ صفحہ ۱۷۸۔

سے ملا ہوا ہے اور اس پر کوئی دلیل بھی ان کے پاس نہ تھی، مگر ہمارے زمانہ میں یہ ہوا کہ عربوں کے کچھ سئے ہوئے جہازوں کے تختے جو بحر ہند میں ٹوٹ گئے تھے اور جن کے مسافر ڈوب گئے تھے وہ بحر اخضر ہو کر بحر روم میں پائے گئے، اس سے یہ بات بخوبی ثابت ہوگئی کہ بحر ہند چین پر چکر کھا کر بحر روم میں جا کر مل گیا ہے، کیوں کہ سئے ہوئے جہاز صرف سیراف میں بنتے تھے اور روم و شام کے جہاز کیلوں سے جڑے جاتے ہیں'' ۔[1]

واسکوڈی گاما کو ہندوستان کس نے پہنچایا؟

اس میں شک نہیں کہ افریقہ کی پشت پر سے ہو کر پرتگالی جہاز ران آخر کار بحر ہند میں داخل ہو گئے، تاہم انہوں نے ہندوستان کا پتہ نہ پایا، اس کو پرتگالی مانتے ہیں اور خود بدقسمت اہل عرب بھی کہتے ہیں کہ ان پرتگالیوں کو ہندوستان تک ایک عرب ہی جہاز ران نے پہنچایا، اس کا نام ابن ماجد اور اسد البحر یعنی ''دریا کا شیر'' اس کا خطاب تھا، بحر ہند کی جہاز رانی کے فن پر اس کی متعدد کتابیں عربی میں کتب خانہ پیرس میں موجود ہیں، چند سال ہوئے کہ پیرس کے مشرقی کتابوں کے پبلشر بال گاتھر نے دو جلدوں میں ان کو شائع کر دیا ہے، تیسری جلد میں عربوں کے فن جہاز رانی اور آلات جہاز رانی پر پوری بحث ہے، اس تیسری جلد میں ''البرق الیمانی فی الفتح العثمانی'' کے حوالہ سے جو اسی زمانہ کی یمن کی تاریخ ہے، پرتگالیوں کے آنے اور ہندوستان کی تلاش میں ان کی سرگردانی اور ابن ماجد شیر دریا کا ان پرتگالی لومڑیوں کے پھندے میں پھنس کر نشہ کی حالت میں ان کو ہندوستان پہنچا دینا تفصیل کے ساتھ مذکور ہے۔

ع خدا سے کیا ستم و جور نا خدا کہئے

---

[1] سفرنامہ سلیمان ص ۸۸۔

ہندوستان کی سیاہ مرچیں اور یورپ

یورپ کے ابتدائی مشرقی تاجر جو ستر ہویں صدی سے ہندوستان آنا شروع ہوئے سب کو معلوم ہے کہ وہ سیاہ مرچوں کے زیادہ تر دلدادہ و شیدا تھے اور انہیں کو ہندوستان سے لاد لاد کر لے جاتے تھے، مگر تیرہویں صدی کا ایک عربی کا جغرافیہ نویس زکریا قزوینی (سنہ ۶۸۶ ھ) غالباً اپنی کسی پیشرو کی کتاب میں دیکھ کر ملیبار کے حال میں بیان کرتا ہے:-

''یہ سیاہ مرچیں انتہائی مشرق سے لے کر انتہائی مغرب تک جاتی ہیں اور ان کے سب سے زیادہ شائق اہل فرنگ ہیں، جو ان کو شام میں بحر روم سے لے کر اقصائے مغرب کو لے جاتے ہیں''۔[1]

غالباً ترکوں نے قسطنطنیہ فتح کر کے اور بحر روم پر قبضہ کر کے ہندوستان کی انہیں سیاہ مرچوں کے مزے سے ان کو محروم کر دیا اور آخر انہیں کے لیے جان جوکھوں میں ڈال کر وہ دوسرے دریائی راستہ سے ہندوستان آئے تا کہ یہ تحفہ کسی نہ کسی طرح اپنے ملک پہنچا سکیں۔

ایک عرب ہندوستانی کا وطنی گیت

اس بات کا خاتمہ ہم ایک عرب ہندوستان محبّ وطن کے عربی گیت یا نظم پر کرتے ہیں جو اس نے کسی معترض کے جواب میں ہندوستان کی خوبیوں اور اس کی پیداواروں کی تعریف میں لکھی ہے [2] اس شاعر کا نام ابو ضلع سندھی ہے اور جس کے وجود کا زمانہ بہر حال سنہ ۶۸۶ ھ سے پہلے ہوگا اور عجب نہیں کہ تیسری یا چوتھی صدی ہو، کیوں کہ سندھ میں عربوں کے دور کا زمانہ یہیں ختم ہوتا ہے۔

---

[1] آثار البلاد قزوینی جلد ۳ ص ۸۲ گوتنجن [2] آثار البلاد قزوینی ص ۸۵۔

ع لقد انکر اصحابی وما ذالک بالامثل

اذا ما مدح الھند و سھم الھند فی المقتل

(ترجمہ) میرے دوستوں نے انکار کیا اور یہ بہتر نہیں جب ہندوستان کی اور ہندوستان کے تیرا کی معرکہ میں تعریف کی جارہی تھی۔

ع لعمری انھا ارض اذا القطر بھا ینزل

یصھر الدو و الیاقوت والدر لمن یعطل

(ترجمہ) میری جان کی قسم! یہ وہ سرزمین ہے کہ جب اس میں پانی برستا ہے تو دودھ موتی اور یاقوت اس سے اگتے ہیں، ان کے لئے جو آرائش سے خالی ہیں۔

ع فمنھالمسک والکافور والعنبر والمندل

واصذاف من الطیب لیستعمل من یتفل

(ترجمہ) اس کی خاص چیزوں میں مشک، کافور، عنبر عود اور قسم قسم کی خوشبوان کے لیے جو میلے ہوں۔

ع وانواع الا فاویہ و جوز الطیب والسنبل

ومنھا العاج والساج ومنھا العود والصندل

(ترجمہ) اور قسم قسم کے عطریات اور جائے پھل اور سنبل اور ہاتھی دانت اور ساگون کی لکڑی اور خوشبو لکڑی اور صندل۔

ع وان التوتیا فیھا کمثل الجمل الاطول

ومنھا الببر والنمر ومنھا النیل الدغنل

(ترجمہ) اور اس میں تو تیا سب سے بڑے بہار کی طرح ہے اور یہاں شیر ببر اور چیتے اور ہاتھی اور ہاتھی کے بچے ہوتے ہیں۔

ع ومنها الكوك والبيغاء والطاؤس والجوزل

و منها شجر الرابخ والسلسم والفلفل

(ترجمہ) اور یہاں پرندوں میں کلنک اور طوطے اور مور اور کبوتر ہیں اور درختوں میں یہاں ناریل اور آنبوس اور سیاہ مرچوں کے درخت ہیں۔

ع سيوف ما لهامثل قد استغنت عن الصيقل

وار ماح اذا اهتزت بما الجحنل

(ترجمہ) اور ہتھیاروں میں تلوار ہیں جن کو کبھی صقیل کی حاجت نہیں اور ایسے نیزے ہیں کہ جب وہ ہلیں تو فوج کی فوج ان سے ہل جائے۔

ع فهل ينكر هذا الفضل الا الرجل الاخطل

(ترجمہ) تو کیا بیوقوف کے سوا کوئی اور بھی ہندوستان کی ان خوبیوں کا انکار کر سکتا ہے؟۔

تیسرا باب

علمی تعلقات

ماخذ

عرب و ہند کے علمی تعلقات کی تشریح عربی کی حسب ذیل قدیم مستند کتابوں سے کی گئی ہے۔

۱۔ جاحظ

سنہ ۲۵۵ھ میں وفات پائی، بصرہ کا رہنے والا تھا، عربی زبان کا مشہور انشا پرداز، فلاسفر اور متکلم تھا، اس کی بے شمار چھوٹی بڑی کتابیں ہیں، جن میں سے کتاب الایمان والتبیین، کتاب الحیوان، رسائل جن میں فرضی مناظرے ہیں،

مطبوعہ صورت میں ہیں اور ابھی حال میں اس کی ایک کتاب القاج مصر سے شائع ہوئی ہے، جاحظ کی کتاب البیان میں ہندوستان کے اصول بلاغت پر ایک صفحہ ہے اور رسائل میں سے ایک میں ہندوستان کی خوبیاں درج ہیں، یہ کتابیں مصر میں چھپی ہیں۔

۲۔ یعقوبی

اس کا نام احمد بن یعقوب بن جعفر ہے، عباسی سلطنت میں یہ دفتر انشا کا افسر تھا، اس نے ہندوستان اور دوسرے ممالک کی سیر و سیاحت کی تھی، یہ پہلا مسلمان مؤرخ تھا جس نے تمام دنیا کی قوموں کی تاریخ عربی میں لکھی، سنہ ۲۸۷ھ میں اس کا انتقال ہوا، اس کی دو کتابیں چھپی ہیں، ایک تاریخ دو جلدوں میں، اور دوسری جغرافیہ، تعجب ہے کہ اس نے جغرافیہ میں ہندوستان کا حال نہیں لکھا، مگر تاریخ کی پہلی جلد میں اس نے سب سے پہلی دفعہ ان کتابوں کا حال لکھا ہے جن کا ہندوستان کی زبانوں سے عربی میں ترجمہ ہوا، یہ دونوں کتابیں لیڈن میں چھپی ہیں۔

۳۔ محمد بن اسحاق معروف بہ ابن ندیم

یہ سنہ ۳۷۷ھ میں موجود تھا، بغداد کا رہنے والا تھا، اس نے ان تمام کتابوں کے نام اور احوال لکھے ہیں جو اس کے زمانہ تک کسی علم و فن میں عربی میں لکھی گئیں، یا کسی دوسری زبان سے ترجمہ ہوئی، اس میں ہندوستان کا بھی حصہ ہے، یہ کتاب جرمن فاضل فلوگل (Fluegel) کے اہتمام اور تحشیہ سے لیپزگ میں سنہ ۱۸۷۱ء میں شائع ہوئی۔

۴۔ ابوریحان بیرونی

المتوفی سنہ ۴۴۰ھ، اس نے کتاب الہند کے نام سے پوری کتاب ہی ہندوستان علوم و فنون پر لکھی ہے، پروفیسر زخاؤ کی محنت سے سنہ ۱۸۸۷ء میں لندن میں چھپی، انگریزی اور ہندی میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے۔

۵۔ قاضی صاعد اندلسی

یہ اسپین کا باشندہ تھا، اس کی کتاب کا نام طبقات الامم ہے، سنہ ۴۶۲ھ (سنہ ۱۰۷۰ء) میں وفات پائی، اس نے اپنے عہد تک کی تمام متمدن قوموں کے ان علوم و فنون کی تاریخ لکھی ہے جو عربی کے ذریعہ سے اس تک پہنچے ہیں، اس میں ہندوستان کا بھی ایک باب ہے، اس کی یہ کتاب بیروت کے کیتھولک مطبع میں سنہ ۱۹۱۲ء میں چھپی تھی، پھر مصر میں بھی چھپ گئی۔ میرے پیش نظر بیروت کا نسخہ ہے، دار المصنفین اعظم گڑھ نے اس کا اردو ترجمہ بھی شائع کر دیا ہے۔

۶۔ ابن ابی اصیبعہ موفق الدین

اپنے زمانہ کا مشہور حکیم و طبیب تھا، اس کا دادا سلطان صلاح الدین کا طبیب تھا، سنہ ۵۹۰ھ (سنہ ۱۱۹۴ء) سے سنہ ۶۶۸ھ (سنہ ۱۲۷۰ء) تک اس کا زمانہ ہے، اس نے عیون الانباء فی طبقات الاطباء کے نام سے دنیا کی تمام متمدن قوموں کے مشہور طبیبوں کی سوانح عمریاں لکھی ہیں، دوسری جلد میں ہندوستان کا بھی ایک باب ہے، کتاب مصر میں دو جلدوں میں چھپی ہے۔

۷۔ حضرۃ الاستاذ علامہ شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ

انہوں نے تراجم کے عنوان سے ایک مبسوط خطبہ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ میں دیا تھا جو رسائل کے ضمن میں چھپ چکا ہے، اس میں تفصیل کے ساتھ ان کتابوں کا ذکر تھا جو یونانی، فارسی، عبرانی، سریانی وغیرہ زبانوں سے عربی میں ترجمہ ہوئیں، اسی ضمن میں ایک مختصر بیان ان کتابوں کے متعلق بھی ہے جو سنسکرت سے عربی اور فارسی میں ترجمہ ہوئیں، مگر اس وقت تک چوں کہ بعض پرانی کتابیں طبع نہیں ہوئی تھیں اور بعض ناقص تحقیقات کی تکمیل نہیں ہوئی تھی، اس لیے خطبہ کا یہ حصہ ناتمام سا تھا۔

علمی تعلقات کا آغاز

برامکہ

اس سے پہلے کہ عرب و ہند کے علمی تعلقات پر گفتگو شروع کی جائے اس خاندان کا ذکر کرنا چاہئے جس کی کوششوں سے یہ تعلقات وجود میں آئے، عام طور سے عربی زبان میں یہ خاندان برامکہ کے نام سے مشہور ہے، یہ وہ خانوادہ ہے جس نے بغداد کی عباسی خلافت میں پچاس سال تک سنہ ۱۳۱ھ سے سنہ ۱۸۶ھ تک نہایت امن وامان، نظم ونسق، جود وکرم اور بخشش وفیاضی کے ساتھ وزارت کے فرائض انجام دیے، یہاں تک کہ بہت سے ایسے لوگ ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ خلافت عباسیہ کی نیک نامی، شہرت اور حسن انتظام انہیں برمکی وزیروں کی بدولت تھا، انہیں کا ابر کرم تھا جس کی جمیلتوں سے بغداد کبھی باغ و بہار بن گیا تھا، پہلے عباسی خلیفہ سفاح سے لے کر پانچویں خلیفہ ہارون الرشید اعظم تک ان کے خاندان کے مختلف افراد نے وزارت کی درحقیقت شہنشاہی کی، ان کے خاندان کا آغاز گو سفاح ہی کے زمانہ سے شروع ہوا، مگر ان کے اقبال کا آفتاب ہارون کے عہد میں اوج کمال تک پہنچ گیا اور ابھی دوپہر ہی تھی کہ ہارون کے ہاتھوں یہ ہمیشہ کے لیے ڈوب بھی گیا، ہارون رشید نے اس خاندان کو جن اسباب سے تباہ و برباد کیا وہ ہمیشہ زیر پردہ رہے، تاہم مؤرخوں نے یہ ثابت کیا ہے کہ اس کا سبب صرف یہ تھا کہ ''برامکہ نے اپنی فیاضی اور نیک نامی سے تمام لوگوں کو اپنا گرویدہ بنالیا تھا، ساتھ ہی ملک کی تمام اچھی اور عمدہ زمینیں اپنی جاگیر میں کرلی تھیں اور سلطنت کے جزو کل پر وہ ایسے حاوی ہوگئے تھے کہ اصل عباسی خاندان صرف انہیں کے رحم وکرم پر گویا باقی رہ گیا تھا، ایسی

حالت میں اگر برامکہ کی بروقت خبر نہ لی جاتی تو اسلامی دنیا میں ایک عظیم الشان تاریخی انقلاب پیش آتا اور عباسیہ ہمیشہ کے لئے مٹ جاتے، اس لیے عباسی خاندان کو بچانے کے لیے برمکی خاندان کو مٹانا ضروری تھا، اسباب جو کچھ ہوں مگر بہر حال اس میں کوئی شک نہیں کہ برامکہ خاندان وہ خاندان تھا جس کی سرپرستی میں مسلمانوں میں علم کلام، فلسفہ، طب معقولات، اور دوسری قوموں کے علوم کے سیکھنے کا شوق پیدا ہوا۔

برامکہ کون تھے

عام طور سے مشہور ہے کہ برامکہ مجوسی تھے، یعنی آتش پرست ایرانی تھے، بلخ میں نوبہار نام منوچہر کا بنایا ہوا ایک آتش کدہ تھا، اسی آتش کدہ کے یہ پیر مغاں تھے، جب مسلمانوں نے سنہ ۳۱ھ (۶۵۱ء) میں بلخ کو فتح کیا تو یہ آتش کدہ بھی اس آندھی میں سرد ہو گیا، مگر کچھ دنوں کے بعد پھر اس کے شعلے بھڑکے اور آخر سنہ ۸۶ھ (سنہ ۷۰۵ء) میں مشہور مسلمان سپہ سالار خراسان قتیبہ نے ہمیشہ کے لئے اس ملک کو اسلام کے دائرہ حکومت میں داخل کر لیا، اس آتش کدہ کے پجاری جو قدیم بادشاہوں کے زمانہ سے بلخ اور اس کے آس پاس کی موقوفہ آبادی کے مالک و حاکم تھے، ان میں کچھ لوگ خود اپنی مرضی سے مسلمان ہو کے دمشق چلے آئے اور پھر جب عربوں کی حکومت کا مرکز سنہ ۱۳۳ھ میں دمشق سے بغداد کو منتقل ہوا تو وہ بھی بغداد چلے آئے اور رفتہ رفتہ سلطنت اور حکومت کے اعلیٰ سے اعلیٰ مدارج کو طے کرتے ہوئے وزارت کے منصب تک پہنچے اور کبھی کل دنیائے اسلام پر شاہی کی۔

یہ خاندان جو اس آتش کدہ کا دستور اعظم تھا ''برمک'' کے لقب سے مشہور تھا، اسی برمک کی جمع ''برامکہ'' ہے جس کے ساتھ اس خاندان کی عزت و شہرت و ناموری قائم ہے، سوال یہ ہے کہ لفظ ''برمک'' کی اصلیت کیا ہے؟ قدیم مؤرخوں اور لغت نویسوں نے ادھر توجہ نہیں کی ہے، بعد کے فارسی مؤرخوں اور لغت نویسوں نے اس

کو ''مکیدن'' (چوسنا) کے فارسی مصدر سے جس پر کبھی ''بر'' کا زائد لفظ برما کو برمکیدن کہہ سکتے ہیں، اس لفظ کی اصلیت تیار کی ہے، پھر اس لفظ کے سہارے سے ایک بے بنیاد کہانی کی ایک عمارت کھڑی کی ہے، کہتے ہیں کہ پہلا برمک مسلمان ہو کر جب خلیفہ کے سامنے حاضر ہوا تو خلیفہ نے اس کو ڈانٹ کر کہا کہ ''تجھ کو بادشاہوں کے دربار میں آنے کا بھی سلیقہ نہیں، تو اپنے پاس زہر لے کر دربار میں آیا ہے، میرے پاس ایسے مہرے ہیں جن سے مجھ کو معلوم ہو جاتا ہے کہ کس کے پاس زہر ہے''، برمک اول نے عرض کی کہ ''یہ قصور بے شک ہوا، میری انگوٹھی کے نیچے زہر ہے تا کہ اگر کبھی مجھ پر ایسا وقت آ جائے کہ مجھے اپنی عزت بچانے کے لئے جان دینی پڑے تو میں اس انگوٹھی کو چوس لوں اور جان دے دوں'' چوں کہ اس کی زبان فارسی تھی اس لئے ''چوس لوں'' کو فارسی میں اس نے ''برمکم'' کے لفظ سے ادا کیا، اس وقت سے اس کا نام ہی ''برمک'' ہو گیا، [۱] یہ کہانی تمام تر جھوٹ ہے اور صرف فارسی قصہ نویسوں کی گپ ہے، دمشق کے دربار کی زبان فارسی نہ تھی، عربی تھی، علاوہ ازیں اس قصہ کا ماحصل یہ ہوگا کہ برمک کا لقب سنہ ۸۶ھ میں پیدا ہوا، حالاں کہ عربی کے تمام مستند مؤرخوں نے بھی لکھا ہے کہ یہ بلخ کے افسر پجاری کا پرانا لقب تھا۔

بعض فارسی لغت نویسوں نے برمک کو کسی مقام کا نام قرار دیا ہے جس کی طرف نسبت کر کے لوگ ان کو ''برمکی'' کہنے لگے، [۲] ایک عرب ادیب نے اس کی فیلالوجی اس سے بھی زیادہ دلچسپ بیان کی کہ بلخ کا یہ معبد خانہ کعبہ کے جواب میں بنایا گیا تھا، اس لیے اس کے افسر کو ''برمکہ'' یعنی مکہ کا حاکم کہتے تھے اور اسی کا اختصار برمک ہے، [۳] ایک اور تشریح یاقوت کی معجم البلدان میں ہے کہ ''بر'' کے معنی بیٹا اور

---

[۱] تاریخ ضیائے برنی، روفقا الصفا برہان قاطع۔ [۲] برہان قاطع۔ [۳] ربیع البرار زمخشری۔

''برمکا'' کے معنی مکہ کا بیٹا (نو بہار کا لفظ)۔

ہماری زبان میں البرامکہ کے نام سے اس خاندان کی مشہور تاریخ لکھی گئی ہے، اس کے لائق مصنف نے اس لفظ کی اصلیت یہ ظاہر کی ہے کہ برمک اصل میں برمغ تھا کہ ''مغ'' جس کی جمع اردو شاعری میں بھی مغاں اور پیر مغاں مستعمل ہے، آگ کے پجاری (آتش پرست) کو کہتے ہیں، اسی کی یونانی شکل مگوس اور عربی مجوس ہے اور 'بر' افسر کو کہتے ہیں، اس لیے ''برمغ'' کے معنی ''رئیس مجوس اور سردار مجوس'' کے ہوئے، ہم کو اس تشریح کے ماننے میں تامل نہیں، بشرطیکہ یہ ثابت ہو سکے کہ نو بہار کے عشرہ ملک ایران کے ہزاروں آتش کدوں میں سے کسی ایک کے افسر تجزی پروہت یا دستور کو اس نام سے پکارا گیا ہے، اس تشریح کے ساتھ یہ لفظ فارسی میں اتنا عام ہونا چاہئے تھا کہ اس کا استعمال فارسی شعروں میں بکثرت ہوتا اور اہل لغت کو معلوم ہوتا، مگر ان کی یہ پریشان گوئی ہی بتا رہی ہے کہ ان کو خود اس لفظ کی اصلیت کا علم نہ تھا، علاوہ اس کے برمغ اس لفظ کو عربی میں برمیج یا زیادہ سے زیادہ برمک کہنا چاہئے تھا، نہ برمک اور نہ اس کی کوئی مثال دی جا سکتی ہے کہ فارسی غ کو عربی میں ک سے بدلا گیا ہے، ج سے البتہ بدل ہوا ہے، جیسے چراغ سے سراج، ترکی نام ہلاکو کی اصل ہلاغو نہیں جیسا کہ سمجھا گیا ہے، بلکہ ہلاکو ہے اور پھر تعجب نہیں کہ اس سفاک اور خوں خوار بادشاہ کے نام کے لیے ہلاکو کا غلط تلفظ اس لئے بھی اختیار کیا گیا تا کہ عربی لفظ ہلاک (موت) کی طرف اس میں پر طعن تلمیح پوشیدہ رہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس لفظ کی تشریح اس راز کے فاش ہونے پر موقوف ہے کہ بلخ کا یہ معبد کیا درحقیقت مجوسیوں کا آتش کدہ تھا؟ اور کیا اس خاندان کا مذہب اسلام سے پہلے آتش پرستی تھا؟ اس کا جواب ایرانیوں کی طرف سے تو بھی ملے گا کہ

ایسا ہی ہے، یہ معبد آتش کدہ تھا اور ان کا مذہب آتش پرستی تھا۔

واقعہ یہ ہے کہ کسی غیر معمولی انسان کو اپنے میں شامل کرنے کا جذبہ ہر قوم میں ہے، کیا ایرانی سکندر کو خفیہ ایرانی شاہی نسل سے نہیں قرار دیتے؟ اور کیا مسلمانوں نے اپنے افسانوں میں رچرڈ شیر دل کو سلطان صلاح الدین ہی کے خاندان کی یادگار نہیں بتایا؟ یہی حال برامکہ کا بھی ہوا، ایرانیوں نے تو ان کا نسب وسب جوڑ کر گستاسپ کے وزیر جاماسپ تک پہنچا یا دیا ہے اور ثابت کیا کہ یہ ایرانی وزارت کا پرانا خاندان تھا، [۱] عربوں نے اس کے برخلاف یہ دعوی کیا کہ جعفر برمکی اول جس سے اس نسل کا عروج شروع ہوتا ہے، وہ خراسان کے عرب سپہ سالار قتیبہ کا بیٹا تھا، جعفر کی ماں لڑائی میں قتیبہ کے ہاتھ لگی تھی اور صلح کے بعد حاملہ ہو کر گھر واپس گئی۔ [۲]

حسب ونسب کے ان متضاد بیانات سے یکسو ہو کر نفس اس عبادت گاہ کی حالت پر غور کرنا چاہئے کہ کیا ایک آتش کدہ کی خصوصیتیں اس میں پائی جاتی تھیں؟ آتش کدہ کے لئے سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ ''وہ آتش کدہ ہو'' یعنی اس میں آگ جلتی ہو لیکن بلخ کے اس معبد کی نسبت سوائے پچھلے بے احتیاط لوگوں کے اور کسی نے ایسا نہیں لکھا، اس معبد کا سب سے قدیم اور پرانا حوالہ اس وقت ہمارے ہاتھ میں بلاذری ہے، مگر اس نے اس کی کوئی تفصیل نہیں دی ہے، اس کے بعد مسعودی (سنہ ۳۳۰ ھ) اور ابن الفقیہ ہمدانی کا زمانہ ہے، پھر معجم البلدان یاقوت (سنہ ۶۲۶ ھ) اور آثار البلاد زکریا قزوینی (سنہ ۶۸۶ ھ) کا بیان ہے، ابن الفقیہ اور یاقوت کا ابتدائی بیان حرف حرف ایک ہے اور یاقوت کا اپنا بیان عمر بن ازرق سے ماخوذ ہے۔

---

[۱] سیاست نامہ و نزہۃ الظرب حمداللہ مستوفی۔ [۲] طبری و ابن اثیر۔

مسعودی کا بیان

مؤرخ مسعودی نوبہار کے حال میں لکھتا ہے کہ: ''نوبہار کی عمارت نہایت پختہ اور بلند تھی اور اس کے اوپر نیزوں پر سبز حریر کے جھنڈے لہراتے تھے جن میں سے ہر جھنڈے کا کپڑا اسو سو ہاتھ کے برابر ہوتا تھا.....اس کی چاروں طرف کی دیواریں بھی ایسی ہی بلند تھیں، اس کے جھنڈے کا ریشمی کپڑا اتنا بڑا تھا کہ دور تک جاتا تھا''[1]

آپ نے دیکھا، اس میں کہیں آگ کا ذکر نہیں اور نہ عمارت کی یہ ترکیب اور نہ یہ جھنڈے آتش کدوں میں ہوتے ہیں۔

ابن الفقیہ کا بیان

ابن الفقیہ ہمدانی کا بیان یہ ہے:

''نوبہار۔ یہ برامکہ کی تعمیر تھی، ان کا مذہب بتوں کو پوجنا تھا، ان کو مکہ کا اور قریش کے مذہب کا حال معلوم ہوا تو انہوں نے بھی یہ عبادت گاہ بنائی، جس کا نام نوبہار ہوا، جس کے معنی ''نئے'' کے ہیں، تو عجم (غیر عرب) اس کا حج کرتے تھے، اس کو ریشم کا کپڑا پہنایا جاتا تھا، اس پر ایک گنبد تھا، جس کا نام ''اشمت'' تھا، یہ گنبد سو ہاتھ لمبا اور سو ہاتھ چوڑا تھا، عمارت کی چاروں طرف اس کے پجاریوں کے رہنے کے لئے ۳۶۰ حجرے تھے، سال کے ہر دن کے لیے ایک پجاری اور اس کے افسر پجاری کا لقب برمکا تھا، یعنی مکہ کا دروازہ اور والی، تو ہر ایک کا لقب برمک ہوتا تھا، چین اور کابل کے بادشاہ اس مذہب میں تھے، جب وہ یہاں آتے تھے، تو بڑے بت کو سجدہ کرتے تھے''۔[2]

آپ نے خیال فرمایا کہ اس بیان میں بھی اس میں آگ ہونا مذکور نہیں، بلکہ اس کے بجائے اس میں بتوں کا ذکر ہے، جن کو آتش کدوں سے کوئی تعلق نہیں،

---

[1] مروج الذہب ج ۴ ص ۲۸ (پیرس) [2] کتاب البلدان ص ۳۲۳

نہ مجوس وایرانی بت کو پوجتے ہیں، پھر اس میں یہ ہے کہ چین اور کابل کے بادشاہ کا وہی مذہب تھا، سب کو معلوم ہے کہ چین اور کابل میں آتش پرستی کبھی نہ تھی۔

یاقوت کا بیان

یاقوت رومی ایک متقدم مصنف کے حوالہ سے نقل کرتا ہے:

''عمر بن ازرق کرمانی نے کیا ہے کہ برامکہ بلخ میں ہمیشہ سے معزز تھے اور (سکندر کے بعد) جو طوائف الملو کی یا نراج کا دور ایران میں آیا، اس سے پہلے سے تھے، ان کا مذہب بتوں کی پوجا تھی، (پھر مکہ کی مشابہت اور مقابلہ میں نوبہار کی تعمیر ہونا جیسا اوپر گذرا ہے بیان کیا ہے) اس میں چاروں طرف بت کھڑے تھے اور ان کو ریشم کے کپڑے پہنائے جاتے تھے، نوبہار کے معنی نئی بہار کے ہیں، کیوں کہ ہر نئی بہار میں ان پر پھول کی نئی کلیاں چڑھائی جاتی تھیں، اہل فارس ان کا حج کرتے تھے اور اس کے سب سے بڑے گنبد پر جھنڈے کھڑے تھے اور اس گنبد کا نام استن تھا اور اس کی چاروں طرف ۳۶۰ کمرے تھے، جن میں پجاری رہتے تھے، ہندوستان، چین اور کابل وغیرہ کے بادشاہ اس مذہب میں تھے اور عاقوے کو یہاں آتے تھے اور آکر بڑے بت کو سجدہ کرتے تھے، یہ اتنا بلند تھا کہ اس کے جھنڈے کا کپڑا اڑ کر بلخ سے ترمز جا کر گرتا تھا۔[1]

پھول کے چڑھاوے اور بہار کی خصوصیات یہ سب فارسی لفظ ''بہار'' کی مناسبت سے گڑھ لی گئی ہیں، تاکہ نوبہار نام کی مناسبت ظاہر ہو۔

قزوینی کا بیان

بلخ کے حال میں لکھتا ہے:

---

[1] معجم البلدان ج ۸ ص ۳۲۱ (مصر) لفظ نوبہار۔

''یہیں وہ عمارت تھی جس کا نام نو بہار تھا، جو تمام بت خانوں میں سب سے بڑا بت خانہ تھا، (اس کے بعد وہی مکہ کی نقل و مشابہت کی کہانی ہے) اس کو ریشم اور جواہرات سے آراستہ کیا گیا تھا اور اس میں بت کھڑے تھے اور اہل فارس اور ترکوں کو اس سے عقیدت تھی اور اس کا حج کرتے تھے اور نذرانے چڑھاتے تھے، اس گھر کی لمبائی ۱۰۰ ہاتھ اور چوڑائی ۱۰۰ ہاتھ اور اونچائی ۱۰۰ ہاتھ سے زیادہ تھی، برامکہ یہاں کے اصلی پجاری تھے، ہندوستان کے راجہ اور چین کے خاقان یہاں آتے تھے، [1] اور سجدہ کرتے تھے''۔

وہار بودھ

ان تمام بیانات سے اس میں کوئی شک نہیں رہ جاتا کہ یہ مجوسیوں کا آتش کدہ نہیں، بلکہ بودھوں کا وہار تھا اور اسی وہار کی خرابی بہار ہے، نو بہار اصل میں ''نو وہار'' ہے، وہار خاص بودھوں کے معبد اور خانقاہ کو کہتے ہیں، جس کی ایک مثال خود ہمارے ملک میں شہر ''بہار'' ہے جو دراصل بودھوں کا وہار ہے، مسلمانوں نے اس کو اپنے فارسی لہجہ میں بہار کر لیا ہے، اسی نو بہار کے نام سے سندھ میں عربوں کی ابتدائی آمد کے زمانہ میں متعدد وہار تھے اور ان کی جو کیفیت عرب مؤرخوں نے لکھی، وہ حرف حرف بلخ کے نو بہار پر پوری اترتی ہے۔

بلاذری (سنہ ۲۴۷ھ) جو نہایت قدیم مؤرخ ہے، فتوح البلدان میں سنگھ کی فتح کے حال میں لکھتا ہے کہ ''دیبل میں ایک بہت بڑا بد (بودھوں کا معبد) تھا، جس کے اوپر ایک بہت بڑا ستون تھا اور اس میں بہت بڑا سرخ جھنڈا تھا، جو اتنا بڑا تھا کہ جب ہوا چلتی تھی وہ پورے شہر کے اوپر لہراتا تھا اور بد جیسا کہ (سندھ کے آنے جانے والے)

---

[1] آثار البلاد قزوینی ص ۲۲۱ کو شلجن۔

لوگوں نے بتایا اس عمارت کو کہتے ہیں جس میں ایک یا کئی بت ہوتے ہیں، ایک بہت بڑا مینار ہوتا ہے اور کبھی اس مینار کے اندر ہی بت رکھا ہوتا ہے اور ہر وہ چیز جس کی عبادت کے طور پر عزت کریں وہ بدھ ہے اور بت بھی بدھ ہوتا ہے''[۱] کیا اس بیان کے بعد بھی اس یقین میں شک رہ جاتا ہے کہ بلخ کا یہ نو بہار بودھوں کا بت خانہ تھا، مجوسیوں کا آتش کدہ نہیں۔

تعجب ہے کہ پرانے مؤرخوں کو چھوڑ کر یورپ کے نئے باخبر مؤرخوں کی بھی ادھر نظر نہ پڑی، وان کریسر نے برامکہ کو مزدکی بتایا، [۲] اور پرفیسر براؤن جیسے محقق سے بھی یہ حقیقت چھپی رہی، وہ بھی نو بہار کو آتش کدہ اور برامکہ کو مجوسی کہتے ہیں [۳] لیکن دوران تحقیق میں یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ زخاؤ نے کتاب الہند کے انگریزی ترجمہ کے مقدمہ (ص ۳۱) میں نو بہار کی اصل ''نو بہار'' اور بودھ خانقاہ بتائی ہے، موجودہ مستشرقین یورپ میں سے کم از کم ایک شخص ڈبلیو برتھالڈ (W. Barthald) نے انسائکلو پیڈیا آف اسلام کے مضمون برامکہ (جلد ا ص ۶۶۳) میں چند سطروں میں یہ اشارہ کیا ہے کہ ''نو بہار بودھوں کا نو وہار معلوم ہوتا ہے جیسا کہ چینی سیاح کا بیان ہے اور ابن فقیہ نے اس عمارت کی جو صورت لکھی ہے اس سے یہ ثابت ہوتا ہے''، لیکن ان میں سے کسی نے نہ تو اس پر کوئی اور دلیل قائم کی ہے اور نہ اور کوئی ثبوت بہم پہنچایا ہے، پھر اسی کے ساتھ اس غلطی کا بدستور ارتکاب کیا ہے کہ برامکہ کو ایرانی نسل کا مجوسی مانا ہے اور یہ کہ ایرانیوں نے اس کو آتش کدہ بنالیا تھا۔

لیکن میرے نزدیک یہ قطعاً غلط ہے، میرا دعویٰ ہے کہ برامکہ بودھ مذہب

---

[۱] فتوح البلدان ص ۳۳۷ مطبع بڑودہ سنہ ۱۸۶۶ء۔ [۲] ترجمہ، انگریزی صلاح الدین خدا بخش۔

[۳] لٹریری ہسٹری آف پرشیا جلد ا ص ۲۵۹۔

کے پیرو تھے اور ان کا اصل تعلق ہندوستان سے تھا، نہ کہ ایران سے، سچ ہے کہ برامکہ زمانہ کے بعض ہجو گو شاعروں یا بدظن لوگوں نے صریحاً ان کو مجوسیت کی طرف منسوب کیا ہے لیکن اس کا سبب یہ ہے کہ عربوں کو عجم کے باشندوں میں مجوسیوں کے سوا کوئی اور مذہب اور قومیت معلوم نہ تھی، دوسری بات یہ ہے کہ ایرانیوں اور برمکیوں کی سیاست کا اقتضا یہ تھا کہ وہ آپس میں عجمی بن کر ایک دوسرے کے معین و مددگار بنے رہیں، گو کہ آخر تک یہ تعاون دونوں سے نہ نبھ سکا اور یہی سبب برامکہ کے زوال کا ہوا۔

بہرحال میرے اس دعویٰ پر کہ نو بہار بودھوں کا معبد اور برامکہ دراصل بودھ تھے، حسب ذیل شہادتیں ہیں:

(الف) نو بہار کہیں کسی مجوسی بت خانہ کا نام نہ تھا، اس کے برخلاف یہ بودھوں کے معبد کا مشہور ہے اور خود اسی نو بہار کے نام سے سندھ میں بودھوں کے معبد اسی زمانہ میں موجود تھے [1]

(ب) عرب جغرافیہ نویسوں اور معتبر مؤرخوں نے اس معبد کی جو کیفیت بیان کی ہے وہ پوری پوری بودھ معبد کی تصویر ہے۔

(ج) ساتویں صدی عیسوی کے ایک چینی سیاح ہوان کنگ نے بلخ کے اس معبد کا ذکر کیا ہے [2] اور یہ زمانہ کنگ تقریباً وہ ہوگا جب عرب فاتح یہاں پہنچ چکے ہوں، یا پہنچنے والے ہوں گے۔

(د) مسعودی اس نو بہار کے حال میں کہتا ہے کہ ''بعض روایت اور تحقیق والے لوگوں نے بیان کیا ہے کہ انہوں نے نو بہار کے دروازہ پر فارسی میں ایک کتبہ پڑھا جس میں لکھا تھا: ''بوذاسف کا قول ہے کہ بادشاہوں کے دروازے تین خصلتوں

---

[1] ترجمہ انگریزی چچ نامہ الیٹ جلد اول ص ۱۵۰۔ [2] انسائکلو پیڈیا آف اسلام ج ۱ ص ۶۶۴۔

کے محتاج ہیں، عقل اور صبر اور مال'' اس کے نیچے کسی نے عربی میں لکھ دیا تھا کہ ''بوذاسف نے غلط کیا جس میں ان تین باتوں میں سے ایک بات بھی ہو وہ بادشاہ کے دروازہ پر کیوں جائے گا؟''[۱] محققین کو اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ اہل عرب بدھ ہی کو بوذاسف کہتے تھے، [۲] اب اگر یہ بودھوں کا معبد نہ ہوتا بلکہ مجوسیوں کا ہوتا تو اس کے صدر دروازہ پر بودھ کا مقولہ کیوں لکھا ہوتا؟

(ہ) بلخ خراسان کا ایک شہر ہے اور اس ملک کا مذہب اسلام سے پہلے گذشتہ اور موجودہ دونوں محققوں کے نزدیک بودھ مت تھا، چنانچہ ابن ندیم نے بھی خراسان کی ایک پرانی تاریخ کے حوالہ سے یہی لکھا ہے کہ ''اسلام سے پہلے خراسان کا مذہب بودھ کا تھا''۔[۳]

(و) برامکہ کے اسلام کے حال میں مؤرخوں نے یہ لکھا ہے کہ ''نوبہار کے پجاری کا جو مذہب تھا وہی مذہب ہندوستان، چین اور ترکوں کے بادشاہ کا تھا''[۴] سب کو معلوم ہے کہ ہندوستان، کابل، چین اور ترکستان کا مذہب بودھ مت تھا، آتش پرستی اور مجوسیت نہیں۔

(ذ) یاقوت میں ایک پیشرو مؤرخ عمر بن ازرق کرمانی کے حوالہ سے ہے (یہ کرمانی یقیناً تیسری چوتھی صدی کا آدمی ہے کیوں کہ بعینہ یہی عمارت ابن الفقیہ میں ہے جو چوتھی صدی کے وسط میں تھا) جب حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں بلخ فتح ہوا تو نوبہار کا متولی برمک بھی خلافت کے دربار میں گیا اور وہاں وہ اپنی خوشی سے مسلمان ہو گیا، جب وہاں سے بلخ واپس آیا تو لوگ اس کے تبدیل مذہب سے بہت برہم ہوئے

---

[۱] مروج الذہب ج ۴ ص ۴۹ (پیرس) [۲] کتاب الفہرست ابن ندیم ص ۳۴۵ مع حواشی ظولک [۳] ایضاً ص ۳۴۵۔ [۴] ابن الفقیہ، قزوینی اور یاقوت کے حوالے اوپر گذر چکے۔

اور اس کو معزول کر کے اس کی جگہ اس کے بیٹے کو متولی مقرر کیا، پھر نیزک طرخان (شاہ ترکستان) نے اس کو لکھا کہ اسلام چھوڑ کر پھر اپنے مذہب میں واپس آ جاؤ، اس نے جواب دیا میں نے اپنی مرضی سے اسلام کو قبول کیا ہے اور اس کو اچھا سمجھ کر قبول کیا ہے، اس کو چھوڑ نہیں سکتا، طرخان نے اس پر حملہ کرنا چاہا مگر برمک کی دھمکی سے وہ اس وقت چپ ہو گیا، مگر بعد کو دھوکے سے اس نے اس کو اور اس کے ساتھ اس کے دس بیٹوں کو بھی قتل کر دیا، صرف ایک کم سن لڑکا بچ گیا''۔

سوال یہ ہے کہ اگر نو بہار آتش کدہ ہوتا اور برامکہ مجوسی ہوتے تو ترک بودھوں کے بادشاہ طرخان کو اس پر غصہ کیوں نہیں آتا؟ اور وہ اس کے اور اس کے خاندان کے درپے کیوں ہوتا؟

(ح) برمک اور اس کی اولاد کے قتل ہو جانے کے بعد برمک کی بیوی اپنے کم سن بچہ کو لے کر بھاگ گئی اور بھاگ کر کشمیر آئی، چنانچہ اس کم سن بچہ نے کشمیر ہی میں تعلیم و تربیت پائی اور یہیں علم طب اور نجوم اور ہندوستان کے دوسرے علوم سیکھے اور وہ اپنے باپ دادوں کے مذہب پر رہا، اتفاق سے ایک زمانہ میں بلخ میں طاعون آیا، وہاں کے لوگوں نے سمجھا اپنے دین کے چھوڑ دینے کی وجہ سے یہ بلا ان پر آئی، چنانچہ نوجوان برمک کو کشمیر سے بلخ بلوا کر نئے سرے سے نو بہار کی آرائش کی۔[1]

بلخ سے کشمیر بھاگ کر آنے کی اور یہاں تعلیم و تربیت حاصل کرنے کی کوئی وجہ سوائے اس کے نہیں ہو سکتی کہ اس خاندان کا تعلق ہندوستان سے تھا اور ان کا مذہب بودھ تھا، جس کا ایک مرکز کشمیر بھی تھا، ورنہ ان کے لئے آسان تھا کہ وہ ترکوں کے ظلم و ستم سے بھاگ کر اپنے ہم قوموں اور ہم مذہبوں کے پاس ایران جائیں یا مسلمانوں

---

[1] دیکھو معجم البلدان یاقوت لفظ ''نو بہار'' اور کتاب البلدان ابوالغروہ صفحہ ۳۶۴ (لندن)

کے پاس آ کر پناہ لیں، پھر ایک مجوسی لڑکے کی تعلیم و تربیت دوسرے ملک اور مذہب میں کیا ہو سکتی ہے اور یہاں اس کو اپنے مذہب کی کیا تعلیم ملتی؟

(ط) یہ تو اس خاندان کے ہندوستان کے ساتھ تعلق کا واقعہ اس کے اسلام لانے سے پہلے کا ہے، اسلام لانے کے بعد اس کے خاندان نے ہندوستان کے ساتھ اپنے تعلقات کو اور زیادہ مضبوط کر دیا، ہندوستان کے پنڈتوں کو عراق میں بلوا کر اپنے درباروں میں جگہ دی، سندھ کے غالباً بودھ عالموں اور طبیبوں کو بلوا کر اس نے بغداد کے دارالترجمہ اور شفاخانوں میں مقرر کیا، ہندوستان مذہبوں اور دواؤں کی تحقیقات کے لیے وفد بھیجا، ابن ندیم کتاب الفہرست میں جو سنہ ۳۷۷ھ کی تصنیف ہے کہتا ہے:

> ''عربوں کے دور حکومت میں ہندوستان کے معاملہ سے جس نے زیادہ دل چسپی لی وہ یحییٰ بن خالد برمکی اور برامکہ کی جماعت ہے، جس کی دل چسپی اور اہتمام ہندوستان کے معاملہ کے ساتھ اور وہاں کے پنڈتوں اور ویدوں کو ہندوستان سے بغداد بلوانے میں (مشہور ہے)''۔[1]

اگر یہ لوگ ایرانی مجوسی ہوتے تو ان کی اس توجہ اور سرگرمی کا مرکز ہندوستان کی بجائے ایران ہونا چاہیئے تھا۔

(ف) سب کے آخر یہ کہ برمک جو ان کا خاندانی نام اور نوبہار کے متولی اور بڑے پجاری کا اعزازی لقب تھا وہ سنسکرت زبان کا لفظ برمک ہے، ڈاکٹر زخاؤ جو خود سنسکرت کے ماہر ہیں وہ کہتے ہیں کہ اس لفظ کے سنسکرت میں معنی برتر اور بڑے مرتبہ والے کے ہیں، ہم نے بھی سنسکرت جاننے والوں سے دریافت کیا تو انہوں نے بھی تصدیق کی۔

---

[1] کتاب الفہرست ص ۲۴۵ (سنہ ۱۸۷۱ء)

(ک) نوبہار کی عمارت میں جو بہت بڑا ''قبہ'' یا گنبد بنا ہوا تھا، اس کا نام تھوڑے تھوڑے فرق سے مختلف نسخوں میں مختلف طور سے لکھا ہوا پایا گیا ہے، یاقوت کے مصری نسخہ میں ''استن'' اس کا نام بتایا گیا ہے، یورپ کا نسخہ اس وقت میرے پاس نہیں، مگر ابن الفقیہ کا جو لیڈن کا چھپا ہوا نسخہ میرے سامنے ہے، اس میں اصل متن میں تو اس کا نام ''آسبت'' لکھا گیا ہے، مگر مشہور فاضل دی غوجی (De Goeje) اس کے اڈیٹر نے اس کی حسب ذیل شکلیں مختلف نسخوں کے حوالہ سے لے کر لکھی ہیں: ''استن'' ''است'' ''اسبت''، میرے خیال میں یہ صحیح لفظ ''آستب'' ہے اور یہ بودھ لفظ ''ستوب'' کا فارسی و عربی تلفظ ہے، سب جانتے ہیں کہ ''ستوب'' بودھوں کا وہ خاص معبد کہلاتا ہے جس میں بودھ کی راکھ یا سمادھی رکھی گئی تھی، ایسی عمارتیں ہندوستان میں بھی کئی نکل چکی ہیں اور آثار قدیمہ نے ان کی کیفیت پوری طرح بیان کی ہے، یہاں بھی فارسی لفظی مشابہت نے دھوکا دیا ہے، فارسی میں ''اُستن'' کھمبے کو کہتے ہیں جس کی دوسری فارسی شکل ستون ہماری زبان میں بھی ہے، اسی لئے لکھنے والوں نے اپنے خیال کے مطابق ''استب'' کو بے معنی سمجھ کر اس کو فارسی کر دیا ہے کہ اس کے کچھ معنی ہو جائیں، مگر اس سے زیادہ بے معنی بات کیا ہوگی کہ کسی قبہ یا گنبد کا نام ستون اور کھمبا رکھا جائے۔

ہم نے ایک جزئی مسئلہ پر نہایت تفصیل سے گفتگو کی ہے، شاید ہم پر بے موقع طول کلام کا الزام قائم کیا جائے مگر اس اہمیت کو اگر خیال میں رکھا جائے جو اس تحقیق کی روشنی میں اس مسئلہ کی نظر آتی ہے تو میرا یہ جرم بہت ہلکا ہو جائے گا اور نظر آئے گا کہ میرے اس نظریے ثبوت کے بعد برامکہ کے عہد وزارت کی وہ تمام علمی سرگرمیاں علوم وفنون کی سرپرستیاں، شعر وسخن کی قدردانیاں، ہندوستان کی طب اور ہئیت کو عربی میں منتقل کرنے کی کوششوں کی دادایران کی بجائے آئندہ آریاورت

ہندوستان کے حصہ میں آجائیں گی اور یہ ہندوستان کا معمولی کارنامہ نہ ہوگا۔

عربی زبان کی سب سے بڑی انسائکلو پیڈیا ابن فضل اللہ العمری مصری کی مسالک الابصار فی ممالک الامصار ہے، جس کی پہلی جلد ابھی شائع ہوئی ہے، اس میں نوبہار کی تاریخ و کیفیت ان الفاظ میں بیان کی ہے۔[1]

''نوبہار کو ہندوستان کے (راجہ) متوشہر نے بلخ میں بنایا، یہاں وہ ستارہ پرست آتے تھے جو چاند کو پوجتے ہیں اور اس کے متولی کا نام برمک ہوتا تھا، فارس کے بادشاہ اس کی اور اس کے متولی کی عزت کرتے تھے، اخیر میں یہ منصب خالد بن برمک کے باپ کو ملا اور اسی لئے ان کو برامکہ کہتے ہیں، یہ بہت بلند عمارت تھی، سبز ریشمی کپڑے سے ڈھانکی جاتی تھی اور اسی سبز ریشمی کپڑے کے سو سو ہاتھ کے پھریرے اس پر اڑتے تھے، اس پر یہ عبارت لکھی تھی..... (جو گذر چکی، مگر اس میں صرف ایک تحریف ہے کہ بوذآسف کی جگہ سوراشف ہے جو غلط ہے)۔

اس بیان میں اس کے بنانے والے کا نام ''ہندی'' ظاہر کرنا ہمارے دعوی پر ایک مزید شہادت ہے، اس بیان میں اس کو چاند کے پوجنے والوں کا معبد کہا گیا ہے، مگر بہرحال آتش کدہ نہیں، اس کا چاند کا معبد ہونا بھی ہندوستان کی طرف اشارہ ہے کہ بعض لوگوں کے نزدیک ہندو کی اصل اندو ہے، جو چاند کو کہتے ہیں اور اسی نسبت سے اس ملک کا یہ نام پڑا ہے[2] یہ وہ شواہد ہیں جن کو ہم اپنے دعوے کے ثبوت میں پیش کرتے ہیں، ان شواہد سے ہندوستان اور عرب کے علمی تعلقات کا وہ گم شدہ حلقہ

---

[1] کتاب مذکور جلد اول ص ۲۲۳ (مصر) [2] زبدۃ الصحائف فی سیاحۃ المعارف مصنفہ توظ آفندی (یہ اسی زمانہ کی ایک شامی عیسائی فاضل کی تصنیف ہے) ص ۹۳۔

مل جاتا ہے جس سے برامکہ اور ہندوستان کے علمی تعلقات کی زنجیر پوری استوار ہو جاتی ہے اور یہ راز کھل جاتا ہے کہ برامکہ کو خاص کر ہندوستان کے علوم وفنون سے کیوں اتنا ذوق تھا اور وہاں کے پنڈتوں سے اس میل جول اور ارتباط کے اسباب کیا ہیں؟

گذشتہ تقریر سے عرب اور ہندوستان کے تجارتی تعلقات کی پوری تشریح ہو چکی ہے لیکن واقعہ یہ ہے ہندوستان اور عرب کے درمیان تجارت کے علاوہ دوسرے اغراض سے بھی آمد و رفت کے تعلقات پہلی صدی ہجری کے آخر سے شروع ہو چکے تھے، چنانچہ جب محمد قاسم (سنہ ۹۶ ھ) سندھ کے حملہ میں ایک قصبہ میں پہنچا ہے تو معلوم ہوا کہ وہاں کے باشندے بدھ مت کے دو پیروؤں کو عراق کے گورنر حجاج کے پاس بھیج کر پہلے ہی مصالحت اور اس سے امن و امان کی سند حاصل کر چکے ہیں، اس کے بعد جب خلافت کا مرکز شام سے ہٹ کر عراق آ گیا یعنی امویوں کے بجائے عباسیہ اسلام کے تخت حکومت پر بیٹھے تو سندھ اور عراق کے قرب نے فارس کی خلیج میں ان دونوں قوموں کے درمیان اتحاد کا ایک نیا سنگم پیدا کر دیا، سفاح کی دو تین سال کی حکومت کے بعد عباسی خانوادہ کا دوسرا خلیفہ منصور سنہ ۱۳۶ ھ میں بادشاہ ہوا، سنہ ۱۴۶ ھ میں پایہ تخت کی تعمیر ختم ہوئی اور بغداد آباد ہوا اور اس کے آٹھ برس بعد یعنی سنہ ۱۵۴ ھ سے عرب و ہند کے علمی تعلقات کا باقاعدہ آغاز ہوا۔

سنسکرت سے ترجمہ کا آغاز

عربوں میں دوسری زبانوں سے علمی کتابوں کے ترجمہ کرانے کا خیال پہلی صدی ہجرت کے وسط سے ہو چکا تھا، مگر چوں کہ اب تک حکومت کا مرکز شام تھا، اس لئے یونانی و سریانی زبانوں کا غلبہ رہا، لیکن جب کو عراق میں عباسی خلافت کا تخت بچھا تو ہندوستان اور ایران کی زبانوں کو بھی اپنے جوہر دکھانے کا موقع ملا، چنانچہ جب

منصور کی علم دوستی کا چرچا پھیلا تو سنہ ۱۵۴ھ (۷۷۱ء) میں سندھ کے ایک وفد (ڈیپوٹیشن) کے ساتھ ہیئت اور ریاضیات کا ایک فاضل پنڈت سنسکرت کی سدھانت لے کر بغداد پہنچا [۱] اور خلیفہ کے حکم سے دربار کے ایک ریاضی داں ابراہیم قزاری کی مدد سے اس نے اس کا ترجمہ عربی میں کیا، [۲] یہ پہلا دن تھا کہ عربوں کو ہندوستان کی قابلیت اور دماغ داری کا اندازہ ہوا، پھر ہارون نے ایک علاج کے لئے یہاں سے وید بلوائے جنہوں نے عربوں میں ہندوستان کی علمی عظمت اور بڑائی کی دھاک بٹھا دی، اس کے بعد برامکہ کی سرپرستی میں طب، نجوم، ہیئت اور ادب و اخلاق کی کتابوں کا ترجمہ سنسکرت سے عربی میں ہوا، اس نے ہندوستان کی شہرت اور نیک نامی کو اور چار چاند لگا ہے۔

عربوں میں ہندوستان کی وقعت

یہ دکھانے کے لئے کہ ان ترجموں کے ذریعہ سے عربوں کے دلوں میں ہندوستان کی قدر و منزلت کتنی پیدا ہوگئی تھی عربی کے دو تین پرانے مصنفوں کے خیالات آپ کو سنانا چاہتا ہوں، ان میں سے پہلا شخص جاحظ ہے، یہ مشہور انشا پرداز، فلاسفر اور متکلم تھا، بصرہ کے باشندہ ہونے کے سبب سے ہندوستان سے اس کے تعلقات بھی تھے [۳] سنہ ۲۵۵ھ میں اس نے وفات پائی، اس کا ایک رسالہ اس بحث پر ہے کہ دنیا کی گوری اور کالی قوموں میں بڑھ کر کون ہے؟ وہ اپنا فیصلہ کالی قوموں کے حق میں دیتا ہے، اس سلسلہ میں کہتا ہے:

"لیکن ہندوستان کے باشندے تو ہم نے ان کو پایا ہے کہ وہ

---

[۱] کتاب الہند بیرونی ص ۲۰۸ (لندن) [۲] اخبار الحکمۃ تصلی، ۱۷۷ (مصر) [۳] ابن خلکان میں صور بن بحر الجاحظ کا حال۔

جوتش (نجوم) اور حساب میں بڑھے ہوئے ہیں اور ان کا ایک خاص ہندی خط ہے اور طب میں بھی وہ آتے ہیں اور طب کے بعض عجیب بھید ان کو معلوم ہیں، اور سخت بیماریوں کی دوائیں خاص طور سے ان کے پاس ہیں، پھر مجسموں اور اسٹیچو بنانا، رنگوں سے تصویر پیدا کرنا اور تعمیر وغیرہ میں ان کو کمال ہے، پھر شطرنج کے وہ موجد ہیں، جو ذہانت اور سوچ کا بہترین کھیل ہے، تلواریں عمدہ بناتے ہیں اور ان کے چلانے کے سب کرتب جانتے ہیں، زہر اتارنے اور درد دور کرنے کی منتر جانتے ہیں، ان کی موسیقی بھی دل پسند ہے، ان کے ایک ساز کا نام کنکلہ (؟) ہے جو کدو پر ایک تار کو تان کر بجاتے ہیں اور جو ستار کے تاروں اور جھانجھ کا کام دیتا ہے، ان کے ہاں ہر قسم کا ناچ بھی ہے،.....ان کے ہاں مختلف قسم کے خط ہیں، شاعری کا ذخیرہ بھی ہے اور تقریروں کا حصہ بھی ہے، طب، فلسفہ اور ادب و اخلاق کے علوم بھی ان کے پاس ہیں، انہیں کے ہاں سے کلیلہ دمنہ کتاب ہمارے پاس آئی، ان میں رائے اور بہادری ہے اور جو بعض خوبیاں ان میں ہیں چینیوں میں بھی نہیں، ان میں صفائی اور پاکیزگی کے بھی اوصاف ہیں، خوبصورتی، نمکینی اور خوش قامتی اور خوشبوئی بھی ہے اور انہیں کے ملک سے بادشاہوں کے پاس وہ عود آتی ہے جس کی نظیر نہیں اور فکر کا علم انہیں کے پاس سے آیا ہے اور ان کو ایسے منتر معلوم ہیں جنکو یہ زہر پر پڑھ دیں تو زہر بیکار ہو جائے، پھر نجوم کے حساب کے وہی موجد ہیں، ان کی عورتوں کو گانا اور مردوں کو پکانا خوب آتا ہے، صراف اور روپے کے کاروبار کرنے والے اپنے پیسے اور خزانے ان کے سوا اور کسی کے حوالہ

نہیں کرتے، جتنے (عراق میں) صراف ہیں سب کے ہاں خزانچی خاص سندھی ہوگا، یا کسی سندھی کا لڑکا ہوگا، کیوں کہ ان کو حساب و کتاب اور صرافی کے کاموں سے فطری مناسبت ہے، پھر یہ ایمان دار اور وفادار ملازم بھی ہوتے ہیں'' [۱]۔

دوسرا شخص یعقوبی ہے جو سیاح، مؤرخ اور فاضل بھی تھا، کہتے ہیں کہ ہندوستان بھی آیا تھا، تقریباً سنہ ۲۷۸ھ میں وفات پائی، وہ اپنی تاریخ میں ہندوستان کی افسانہ نما تاریخ لکھ کر کہتا ہے:

''اور ہندوستان کے لوگ عقل اور غور والے ہیں اور وہ اس حیثیت سے سب قوموں سے بڑھ کر ہیں، جوتش اور نجوم میں انکی باتیں سب سے زیادہ درست نکلتی ہیں، سدھانت انہیں کی ذہانت کا نتیجہ ہے، جس سے یونانیوں اور ایرانیوں تک نے فائدہ اٹھایا، طب میں ان کا فیصلہ سب سے آگے ہے، فن میں ان کی کتاب چرک اور ندان ہے.....اور بھی طب میں ان کی کئی کتابیں ہیں، منطق اور فلسفہ میں ان کی تصنیفات ہیں اور بہت سی ان کی تصنیفات ہیں جن کی بڑی تفصیل ہے'' [۲]

تیسرا بیان ابوزید سیرافی کا ہے جو تیسری صدی کے آخر میں تھا، وہ لکھتا ہے:

''ہندوستان کے اہل علم برہمن کہلاتے ہیں اور ان میں شاعر بھی ہیں جو بادشاہوں کے درباروں میں رہتے ہیں اور جوتشی اور فلاسفر اور فال کھولنے والے اور بازیگر ہوتے ہیں اور یہ قنوج میں زیادہ ہیں، جو جوز

---

[۱] رسالۃ نضر السودان علی البیضان جاحظ مجموعہ رسائل جاحظ ص ۸۱ مطبوعہ سنہ ۱۳۲۴ھ (مصر)

[۲] تاریخ ابن واضح یعقوبی جلد ا ص ۱۰۵ (لیڈن)۔

کی مملکت میں بڑا شہر ہے''۔ (ص ۱۲۷)

الغرض خلیفہ منصور اور ہارون الرشید کی سرپرستیوں اور برامکہ کی قدردانیوں اور فیاضیوں کی بدولت ہندوستان کے بیسیوں پنڈت اور وید بغداد پہنچے اور سلطنت کے طبی اور علمی محکموں میں مصروف ہوئے اور حساب، نجوم، ہئیت، طب اور ادب و اخلاق کی بہت سی کتابوں کا عربی میں ترجمہ کیا، افسوس یہ ہے کہ ان پنڈتوں کے ہندی نام عربی لب ولہجہ میں جا کر ایسے بدل گئے ہیں کہ آج گیارہ بارہ سو برس کے بعد ان کا صحیح تلفظ کرنا بالکل محال ہو گیا ہے اور شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ میرے گمان میں یہ لوگ زیادہ تر بودھ مت کے پیرو تھے اور اس زمانہ کے ناموں کے انداز موجودہ ویدک ناموں سے مختلف ہیں، پھر ان میں سے بعض نام ایسے بھی ہیں جو نام نہیں بلکہ لقب ہیں، ان ہندی ناموں کی عربی میں ایسی ہی کایا پلٹ ہوئی ہے جیسی عربی ناموں کی یورپ کی زبانوں میں۔

پنڈتوں اور ویدوں کے نام

بہر حال عربوں کی تحریروں میں ہندوستان کے جن پنڈتوں اور ویدوں کے نام آئے ہیں وہ یہ ہیں: بہلہ، مذکا، بازیگر (بجے کر؟) فلبورفل (کلب رائے کل؟) سندباد، یہ نام جاحظ (سنہ ۲۵۵ھ) نے لئے ہیں اور اتنے نام لکھ کر اوروں کے نام فلاں فلاں کہہ کر چھوڑ دیے ہیں اور لکھا ہے کہ ان کو یحییٰ بن خالد برمکی نے ہندوستان سے بغداد بلوایا تھا، یہ سب طبیب اور وید تھے۔[1]

ابن ابی اصیبعہ نے ان ویدوں میں سے مذکا اور بہلہ کے بیٹے کا جو شاید مسلمان ہو گیا تھا اور جس کا صالح نام تھا، ذکر کیا ہے، ابن ندیم نے ایک اور نام

[1] کتاب البیان ص ۴۰ (مصر)

ابن دہن لکھا ہے اور یہی تینوں بغداد میں اس زمانہ کے مشہور وید تھے، دوسری جگہ جن ہندوستانی عالموں کی طب اور نجوم کی کتابیں عربی میں ترجمہ ہوئیں ان کے یہ نام گنائے ہیں: باکھر، راجہ، منکہ، داہر، انکو، زنکل، اریکل، جبیر، اندبی، جباری۔ [۱]

منکہ یا منکا

ابن ابی اصیبعہ نے اپنی تاریخ الاطباء میں لکھا ہے کہ یہ طب اور علاج میں بہت ماہر تھا، ایک دفعہ ہارون الرشید سخت بیمار پڑا، بغداد کے تمام اطباء اس کے علاج سے عاجز آ گئے، تو ایک شخص نے ہندوستان کے اس طبیب کا ذکر کیا، چنانچہ سفر خرچ بھیج کر وہ بلوایا گیا، اس کے علاج سے خلیفہ کو صحت ہوئی، خلیفہ نے اس کو انعام واکرام سے مالا مال کر دیا، پھر یہ دارالترجمہ میں سنسکرت کی کتابوں کے ترجمہ پر مقرر ہوا [۲] کیا ہم منکہ نام کو مانک سمجھیں؟

صالح بن بہلہ

یہ بھی ہندوستانی طب کا ماہر تھا، ابن ابی اصیبعہ نے اس کو بھی ہندوستان کے ان ماہر طبیبوں میں داخل کیا ہے جو بغداد میں تھے، ایک موقع پر جب خلیفہ ہارون الرشید کا چچا زاد بھائی سکتہ میں بیمار ہو گیا تھا اور دربار کے مشہور یونانی عیسائی طبیب جبرئیل بختیشوع نے اس کی موت کا حکم لگا دیا، تو جعفر برمکی نے اس ہندی وید کو پیش کیا اور اسی وید کے علاج کا مشورہ دیا، خلیفہ نے قبول کیا اور اس نے بڑے معرکہ کا علاج کیا۔ [۳]

ابن دہن

یہ برمکیوں کے شفاخانہ کا افسر اعلیٰ تھا اور یہ بھی ان لوگوں میں تھا جو سنسکرت

---

[۱] فہرست ابن ندیم ذکر کتب طب و نجوم۔ [۲] تاریخ الاطباء ج ۲ ص ۳۳ (مصر) و فہرست ابن ندیم ص ۲۴۵۔ [۳] تاریخ الاطباء ج ۲ ص ۳۴ (مصر)

سے عربی میں کتابوں کے ترجمہ پر مامور تھے [۱] پروفیسر زخاؤ نے ''انڈیا'' کے مقدمہ میں دبہن کے نام کی اصلیت جاننے کی کوشش کی ہے، ان کی تحقیق کا نتیجہ یہ ہے کہ ''یہ نام دھنیا یا دبہن ہوگا، یہ نام غالباً اس لیے اختیار کیا گیا ہو کہ اس کو لفظاً دھنونتری سے مشابہت ہے، جو منوشاستر میں دیوتاؤں کے طبیب کا نام بتایا گیا ہے''۔ [۲]

سنسکرت سے عربی میں حسب ذیل علوم کی کتابیں نقل کی گئیں: حساب، نجوم، طب، ہئیت، اخلاقی افسانے اور کہانیاں، سیاست اور راجنیت، کھیل اور تماشے۔

حساب

اہل عرب کا صریحی بیان ہے کہ انہوں نے اسے ۹ تک کے حسابی رقم (ہندسہ) لکھنے کا طریقہ ہندوؤں سے سیکھا [۳] اور اسی لئے اہل عرب اس کو حساب ہندی، یا ارقام ہندیہ کہتے ہیں، عربوں سے یورپ کی قوموں نے سیکھا، اس لیے ان کی زبانوں میں اس کا نام ''ارقام یا اعداد یہ عربیہ'' (عربک فیگر) ہے، ٹھیک وہ زمانہ نہیں معلوم جس میں عربوں نے یہ طریقہ ہندوؤں سے سیکھا، مگر خیال یہی ہے کہ سنہ ۱۵۶ میں سندھ سے جو پنڈت سدھانت لے کر منصور کے دربار میں بغداد آیا تھا اسی نے عربوں کو یہ طریقہ سکھایا اور میرے خیال میں صحیح یہ ہے کہ سدھانت جس کا ترجمہ ہوا تھا، اس کے تیرہویں اور چوبیسویں باب میں خود حساب اور رقم ہے اسی کے ذریعہ سے یہ طریقہ عربوں میں رائج ہوا، عربی میں پہلے لفظوں میں عدد لکھتے تھے، پھر یہودیوں

---

[۱] فہرست ابن ندیم ص ۲۴۲۔ [۲] صفحہ ۳۳ مقدمہ ترجمہ انگریزی ۔ [۳] رسائل اخوان الصفا جو چوتھی صدی میں مرتب ہوئے، فصل فی معرفۃ براگفا الصورت وخلاصہ الحساب بہاؤالدین عاملی مطبوعہ کلکتہ ۱۶ اور اس کی شرح از مولوی عصمت اللہ وکشف الظنون چلپی، ومفتاح السعادۃ طالشکری زادہ (علم الحساب) وکتاب الہند بیرونی ص ۹۳ مطبوعہ لندن۔

اور ایرانیوں کی طرح حروف ابجد میں رقم لکھتے تھے، جیسا کہ اب بھی عربی ہئیت میں اختصار اور صحت کے خیال سے یہ طریقہ رائج ہے اور جس پر مشرق میں ابجد ہوز کے قاعدہ سے مادہ تاریخ نکالنے کا رواج ہے، بہر حال پہلے محمد بن موسیٰ خوارزمی نے اس ہندی حساب کو عربی قالب میں ڈھالا، انسائکلو پیڈیا برٹانیکا (گیارہواں اڈیشن) میں اعداد (Numeral) پر جو مضمون (جلد ۱۹ ص ۸۶۸) ہے اس میں قدیم ہندی، مشرقی عربی مغربی عربی اور یوروپین کی شکلیں، کتبوں اور پرانی قلمی کتابوں سے نقل کر کے دی ہیں، جس سے ایک نظر میں معلوم ہوسکتا ہے کہ ہندوستان سے عرب کی راہ اس طریقہ حساب نے کیوں کر سفر کیا، عربی میں مامون الرشید کے درباری منجم الخوارزمی (سنہ ۷۸۰ء۔ سنہ ۸۴۰ء) نے ان کی شکلیں درست کیں اور وہی اندلس کی راہ یورپ پہنچیں، یورہ میں حساب کے ایک خاص شعبہ کو الگارتھم اور الگاریٹم اور الگورزم (Algorithm,Algoritems,Algorism) کہتے ہیں، وہ سب اسی الخوارزمی کی بگڑی ہوئی شکلیں ہیں۔[۱] اندلس والے اسی ہندی ارقام کو حساب الغبار کہتے ہیں، شاید اس لیے کہ یہ ہندو اپنے طریقہ پر جیسا کہ اب تک دیہاتی پاٹ شالوں میں دستور ہے اس کو زمین پر لکھ کر سکھاتے تھے، یوروپین اعداد انہیں غباری اعداد سے ماخوذ ہیں۔

ان اعداد کے غیر عربی ہونے ایک عملی ثبوت یہ ہے کہ عربی طرز تحریر کے بالکل برخلاف یہ بائیں سے داہنے طرف لکھے جاتے ہیں لیکن اہل عرب پڑھتے وقت ان کو داہنے سے بائیں طرف پڑھتے ہیں، ابن ندیم نے سندھی خط کے دیوان سے ان ہندی ارقام کو نقل کیا ہے اور ہزار تک لکھنے کا طریقہ بتایا ہے، اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے

---

[۱] انسائکلو پیڈیا برٹانیکا ج ۱۹ ص ۸۶۷ کالم ۲۔

کہ عربوں میں یہ طریقہ سندھی پنڈتوں کے ذریعہ رائج ہوا۔

الخوارزمی کے بعد جس کا زمانہ تیسری صدی ہجری اور نویں صدی عیسوی کے آغاز کا ہے مسلمانوں میں ہندی حساب کو فروغ دینے والا دوسرا شخص علی بن احمد نسوی (سنہ ۹۸۰ء۔۱۰۴۰ء) ہے جس نے المقنع فی الحساب الہندی (ہندی حساب میں خواہش پورا کر دینے والی) کتاب لکھی، اس کے بعد اور بھی اس پر کتابیں لکھی گئیں، حالاں کہ اس سے بہت پہلے یعنی الخوارزمی ہی کے زمانہ میں یونانیوں کی ارتماطیقی (ارتھمیٹک) عربی میں منتقل ہو چکی تھی، [۱] مگر پھر بھی حساب ہندی کی قدر و منزلت میں کمی نہ آئی، تعجب سے سنا جائے گا کہ اس حساب ہندی نے عوام تک میں مقبولیت حاصل کر لی تھی، چنانچہ مشہور مسلمان حکیم اور فلاسفر بوعلی سینا (سنہ ۴۲۸ھ۔ سنہ ۱۰۱۵ء) نے بچپن میں اس ہندی حساب کو ایک کنجرے سے جو اس حساب میں بہت ماہر تھا سیکھا تھا۔ [۲]

نجوم اور ہیئت

اوپر گذر چکا ہے کہ تقریباً سنہ ۱۵۴ھ (سنہ ۷۷۰ء) میں سندھ سے جو ڈیپوٹیشن بغداد گیا تھا، [۳] اس کے ساتھ ایک پنڈت ہیئت کی ایک کتاب لے کر گیا تھا، سنسکرت میں اس کتاب کا پورا نام ''برہمسبت سدھانت'' ہے جو عربی میں ''السند ہند'' کے نام سے مشہور ہوا، اس کے بعد سنسکرت کی دوسری کتاب عربی میں

---

[۱] اس مسئلہ پر انگریزی میں سب سے بہتر معلومات ایچ سوٹر صاحب (H. Sutar) کے مضمون ''حساب'' میں ہیں، جو انسائکلو پیڈیا آف اسلام کے نمبر ۲۲ سنہ ۱۹۱۶ء ص ۳۱۵ میں ہے، عربی میں محمد بن احمد خوارزمی (سنہ ۳۸۱ھ) کی کتاب مفاتیح العلوم میں حساب الہند کے عنوان سے دو تین صفحوں میں اس کی تفصیل ہے، صفحہ ۱۹۳) مطبع بریل، لیڈن سنہ ۱۸۹۵ء۔ [۲] عیون الانباء ج ۲ ص ۲ (مصر) [۳] طبقات الامم صاعد اندلسی ص ۴۹ (بیروت)

ترجمہ ہوئی جس کا عربی نام ''ارجبہز'' ہے اور جس کا سنسکرت تلفظ ''آریہ بھٹ'' ہے اس کے بعد تیسری سنسکرت کتاب عربی میں منتقل ہوئی جس کا عربی میں زیادہ مشہور نام ''ارکند'' اور کم مشہور ''اہرقن'' ہے، اس کا اصلی سنسکرت نام ''کھنڈا کیڈک'' ہے، جس ہندی پنڈت کے ذریعہ سے پہلی کتاب سدھانت سنہ ۱۵۴ھ عربی میں ترجمہ ہوئی اس کے بغداد میں دو عرب شاگرد ہوئے ، ایک کا نام ابراہیم فزاری ہے اور دوسرے کا یعقوب بن طارق، ان دونوں نے سدھانت کو اپنی اپنی طور سے عربی میں منتقل کیا، ہندوؤں کے فلکیات کی بنیاد زمانہ کی اس تقسیم پر ہے، جس کو سنسکرت میں کلپ کہتے ہیں، یعنی دوسری پرانی قوموں کی طرح ان کا اعتقاد یہ تھا کہ چاند، سورج، زحل، مشتری وغیرہ ساتوں ستارے جن کو عرب سبع سیارہ کہتے ہیں، یہ کل کے کل ایک وقت میں نقطہ اعتدال ربیعی میں ایک ساتھ پیدا ہوئے اور ایک ساتھ حرکت شروع کی، اب یہ اپنی اپنی چال چل رہے ہیں، پھر کروڑوں برس کے بعد یہ ساتوں جب پھر اسی نقطہ پر جمع ہو جاتے ہیں تب پرلے ہو کر دنیا مٹ کر پھر سے بنتی ہے اور پھر اس سے حرکت شروع ہوتی ہے، ان دونوں نقطوں کے درمیان کے شمسی نجومی سالوں کی تعداد کا نام کلپ ہے، برہمگپت کے حساب سے ایک کلپ میں ۴ ارب ۳۲ کروڑ سال ہوتے ہیں اور پھر انہیں سے دنوں کا حساب لگایا جاسکتا ہے، عربوں نے اسی کلپ کا نام ''سنی السند ہند'' یعنی سدھانت کے برس اور دنوں کا نام ''ایام السند ہند'' رکھا۔

چوں کہ یہ اربوں اور کروڑوں سال کا حساب لگانا مشکل ہوتا تھا، اس لئے پانچویں صدی عیسوی کے آخر میں آریہ بھٹ نے آسانی کے لئے یہ کیا کہ کلپ کا ہزاروں حصہ لے کر اس پر حساب قائم کیا، جس کا نام جگ اور مہا جگ ہے، آریہ بھٹ کے اسی اصول پر جو کتاب ہے اس کو عرب ارجبھر اور جگ کو ''سنی ارجبہز'' یعنی ''آریہ بھٹ کے سال'' کہنے لگے، عربوں نے السند ہند اور ارجبھر کے اصلی سنسکرت معنی کے سمجھنے میں یہ غلطی

کی ہے کہ وہ سمجھے کہ اس کے معنی خود اسی اصول کے ہیں، چنانچہ انہوں نے غلطی سے السند ہیند کے معنی ''الدہر الداہر'' یعنی ''لا انتہاز مانہ'' اور ''ارجبہذ'' کے معنی ''ہزارواں حصہ'' کے سمجھے، اس آخری کتاب کو عربی میں ابوالحسن اہوازی نے عربی میں منتقل کیا تھا۔

یعقوب بن طارق نے سنہ ۱۶۱ھ میں اسی پنڈت یا کسی اور آنے والے پنڈت سے ارنکند یعنی کھنڈیا کھنڈیک کا طریقہ سیکھا، یہ بھی برہمگیت ہی کی تصنیف ہے، مگر اس کے کچھ اصول سدھانت سے الگ ہیں۔

ان تینوں کتابوں میں سے ابتدائی عرب ہیئت دانوں میں سدھانت کا رواج زیادہ ہوا اور گو اس کے بعد ہی عربی میں بطلیموس یونانی کی کتاب مجسطی کا عربی میں ترجمہ ہو گیا اور مامون کے زمانہ میں رصد خانہ بھی قائم ہو گیا، تحقیقات میں بھی اضافہ ہوا مگر اس کے باوجود ایک مدت تک عرب اہل ہیئت بغداد سے لے کر اسپین تک اسی ہندی کتاب کے سدھانت کے پیچھے لگے رہے، اس کے خلاصے کئے، اس کی شرحیں لکھیں، اس کی غلطیاں درست کیں، اس میں اصلاحیں دیں، یہاں تک کہ پانچویں صدی ہجری (گیارہویں صدی عیسوی) تک یعنی بیرونی کے زمانہ تک یہ سلسلہ قائم رہا، مامون الرشید کے عہد میں خوارزمی نے جو زیچ تیار کی، اس میں بھی ایرانی اور یونانی اصولوں کی افزایش کے ساتھ اصل ہندی اصول کو اس نے قائم رکھا، اور اسی لیے اپنی کتاب کا نام ''السند ہند الصغیر'' یعنی ''چھوٹا سدھانت رکھا''۔[۱]

اسی طرح حسن بن صباح، حسن بن خصیب، فضل بن حاتم تبریزی، احمد بن عبداللہ مروزی ابن الارمی، عبداللہ اور ابوریحان بیرونی نے تیسری چوتھی اور پانچویں صدی میں سدھانت کی تصحیح و تکمیل پر بہت کچھ کام کیا اور یونانی اصول اور ذاتی تحقیقات کے ساتھ وہ اس کا پیوند بھی لگاتے رہے۔

---

[۱] قفطی ص ۱۷۸ (مصر)

اسپین میں سدھانت کا اصول چوتھی صدی ہجری میں پہنچا، مسلمہ بن احمد مجریطی (میڈرڈ کے باشندہ) المتوفی سنہ ۳۹۸ھ (سنہ ۱۰۰۷ء) نے خوارزمی کی زیچ سند ہند صغیر کا خلاصہ کیا، پھر اسپین کے ابوالقاسم اصبغ معروف بہ ابن السمح المتوفی سنہ ۴۲۶ھ (سنہ ۱۰۳۵ء) نے سدھانت کے اصول پر بہت بڑی زیچ تیار کی، بعد کو بطور وضع داری وسعت علم کے اظہار کے لیے لوگ نئی تحقیقات کے ساتھ سدھانت کے اصول پر بھی نتائج نکالتے تھے، جیسا کہ اسی اسپین کے ابراہیم زرقالی نے اسطرلاب پر جو کتاب صفحہ زرقالیہ کے نام سے لکھی ہے اس میں کیا ہے اور اسی اسپین کے عربوں کے ذریعہ سے یہ سدھانت کی کتاب یہود تک اور پھر یورپ تک پہنچی، چنانچہ یہودی فاضل ابراہیم بن عزرا نے اپنی عبرانی تصنیفات میں سدھانت کے بعض اصول پر زیچ تیار کی۔ [1]

عربی میں سنسکرت اصطلاحات

عربوں کے علم ہئیت نے ان کی ذاتی تحقیقات کی بدولت ترقی کے بہت سے مدارج طے کر لیے، تاہم سنسکرت کی ایک متروک اور دو باقی اصطلاحیں ایسی اس میں رہ گئیں ہیں جو اب تک عربوں میں عام ہئیت کے آنے کا راستہ بتاتی ہیں، چنانچہ سدھانت وغیرہ ناموں کے علاوہ ایک سنسکرت اصطلاح پرانی عربی ہئیت میں ''کردجہ'' کی ہے، جس کی اصل سنسکرت کرمجیا ہے، جس کے لیے عربی میں بعد کی

---

[1] سدھا ہند، ارجبھند اور ارکند کا ذکر، فہرست ابن ندیم مسعودی فضلی اور کتاب الہند بیرونی سب میں ہے اور یہ سب کتابیں میرے پیش نظر ہیں مگر عربی میں مصری یونیورسٹی میں سینئر کولولیٹلیر ایک مشہور اٹالین فاضل نے سنہ ۱۹۰۹ء اور سنہ ۱۹۱۰ء میں عربوں کے علم ہئیت کی تاریخ پر نہایت محققانہ لکچر دیے تھے، یہ معلومات ان میں سے ۲۱۔۲۲۔۲۳ نمبر کے لکچروں سے لیے گئے ہیں اور ان کے علاوہ طبقات الامم صاعد اندلسی صفحہ ۵۰ بیروت سے بعض باتیں پڑھائی گئی ہیں۔

اصطلاح ''ونومستوی'' پیدا ہوئی، دوسری باقی اصطلاح جو آج تک عربی ریاضیات میں اور علم مثلثات میں مستعمل ہے، وہ ''جیب'' کا لفظ ہے اور جس کو غلطی سے عربی لفظ ''جیب'' جس کے معنی گریبان کے ہیں، سمجھا جاتا ہے، حالاں کہ یہ سنسکرت لفظ ''جیوا'' کا معرب ہے اور پھر اسی سے جیب التمام جیوب منکومہ، جیوب مبسوطہ اور مجیب وغیرہ اصطلاحیں پیدا ہوئیں اور اس طرح کٹ چھٹ کر عربی ڈھانچے میں ڈھل گئیں کہ آج ان پر غیر عربی ہونے کا شبہ بھی نہیں ہوسکتا۔

آخری لفظ ''اوج'' ہے جو ہئیت کی اصطلاح میں سب سے اونچے نقطہ بلندی کا نام ہے، یہ ہندی لفظ ''اوچ'' ہے جو عربی میں جا کر اوج ہوگیا ہے، [1] مدت سے جو عربی اور فارسی اور پھر اردو میں اس لفظ کا استعمال اس طرح ''اوج کمال'' پر ہے کہ کسی کو اس کے ہندی ہونے کا شبہہ بھی نہیں، یہی وجہ ہے کہ خالص عربی لغتوں میں یہ سادہ نہیں ملتا، اس کی مثال بالکل لفظ جنس کی ہے، جو عربی میں منطق کی ایک اصطلاح ہے اور جو یونانی لفظ جینس کا معرب ہے، مگر عرب میں آ کر یہ جنس، مجانست، تجلیس، مختلف بابوں میں مستعمل ہوگیا ہے، حالاں کہ قدیم عربی میں اس کا مطلق پتہ نہیں ہے۔

دو اور لفظ بھی ذکر کے قابل ہیں، ہندو عالموں نے ستاروں کے حرکات میں اس دائرہ نصف النہار کا حساب لگایا تھا جو آبادی کے نصف حصہ سے گذرتا ہے، آبادی کا یہ نصف حصہ ان کے خیال میں جزیرہ لنکا تھا، جس کو عرب سرندیپ کہتے ہیں اور اب سیلون کہلاتا ہے، ہندوؤں کا خیال تھا کہ وہ خط استوا پر واقع ہے، خط استوا اور نصف آبادی کا یہ خط نصف النہار جس نقطہ پر ایک دوسرے کو کاٹتے ہیں اس کو عرب قبۃ الارض (زمین کا گنبد)

---

[1] بعضوں کی رائے ہے کہ اس کی اصل فارسی اوگ ہے، جیسا کہ خوارزمی نے مفاتیح العلوم صفحہ ۲۲۱ (لیڈن) میں لکھا ہے اور اسی عربی کی قدیم فارسی لغت میں بھی یہ لفظ موجود ہے، مگر خیال یہ ہے کہ خود فارسی میں بھی یہ لفظ سنسکرت ہی سے گیا ہے۔

کہتے ہیں، اہل ہند جغرافی طول بلد کا حساب اسی لنکا کے خط نصف النہار سے لگاتے تھے اور اسی لیے ابتدائی عرب جغرافیہ نویسوں نے لنکا کو قبۃ الارض کہا ہے۔

پھر چوں کہ اہل ہند کا خیال تھا کہ وہی خط جو لنکا کے نصف النہار کا ہے، وہی مالوا کے شہر اجین سے گذرتا ہے، چنانچہ سدھانت میں اسی اجین سے طول بلد کا حساب ہے، اس لیے وہ اجین سے طول بلد کا حساب نکالنے لگے، عربوں نے اسی اجین کو ایک اپنے تلفظ میں ازین کہا اور یہ خیال کیا کہ ازین ہی قبۃ الارض ہے، پھر ازین کے ''ز'' کا نقطہ اڑ کر ''ارین'' ہو گیا اور یہیں سے یہ اصطلاح پیدا ہوئی کہ ارین ہر محل اعتدال کا نام ہے جیسا کہ شریف جرجانی (مشہور مسلمان فلاسفر) نے اپنی کتاب تعریفات میں لکھا ہے۔[۱]

اور ایک اور لفظ پرانے علمائے ہئیت نے ''بذماسہ'' استعمال کیا ہے، یہ سنسکرت کا ادھما سا ہے، جس کے معنی چاند کے مہینے کے ہیں۔

بعض لوگ غلط فہمی سے یہ سمجھتے ہیں کہ عربی میں ریاضیات اور رقم کو جو ہند سے کہتے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ ہند کی طرف منسوب ہے اور تعجب ہے کہ علم کے باوجود ایک انگریزی فاضل جس نے موسیٰ خوارزمی کی کتاب الجبر والمقابلہ سنہ ۱۸۳۱ء میں لندن سے شائع کی ہے اور جس کا نام فریڈرک روسن (F.Rosen) ہے، وہ بھی اسی غلطی میں مبتلا ہونا چاہتا ہے،[۲] حالاں کہ یہ فارسی لفظ ''اندازہ'' کا معرب ہے، جس کا عربی میں مصدری استعمال ہندزہ اور ہندسہ ہے،[۳] اور یہ اصل میں انجینیرنگ کے معنی میں ہے، بعد کو متاخرین کی غلطی سے فارسی اور اردو میں ہندسہ بولنے لگے اور اس سے رقم مراد لینے لگے، ورنہ صحیح لفظ ہند سے (زیر کے ساتھ) نہیں، بلکہ ہندسہ (زبر کے ساتھ) ہے، اسی لیے عربی میں مہندس انجینئر کو کہتے ہیں،

---

[۱] دیکھو لکچر مذکور ص ۱۵۵ و ۱۶۸ مع حاشیہ، نیز دیکھو سراط السبیل، مسٹر آرنلڈ لفظ جیب اور اوج اور تعریفات جرجانی صفحہ ۷ مطبوعہ مصر سنہ ۱۳۰۶ھ۔ [۲] الجبر والمقابلہ خوارزمی، مقدمہ انگریزی ص ۱۹۶ و ۱۹۷ سنہ ۱۸۳۱ء (لندن) [۳] مفاتیح العلوم محمد خوارزمی ص ۲۰۲ (لیڈن)۔

حساب اور رقم جاننے والے کو نہیں۔

ہندو اور دو موجودہ تحقیقات

عربوں نے ہندی علم ہئیت کے جو مسئلے نقل کیے ہیں، ان میں دو باتیں موجودہ تحقیقات کے عین مطابق ہیں، برہمگیت نے سال کے ۳۶۵ دن، ۶ گھنٹے، ۱۲ منٹ اور ۹ سکنڈ قرار دیے ہیں اور موجودہ تحقیق سے ۳۶۵ دن، ۶ گھنٹے، ۹ منٹ، ۹، ۲۳/۱۰۰ سکنڈ ہیں، اسی طرح زمین کی حرکت کا مسئلہ ہے، آریہ بھٹ اور اس کے طرف دار زمین کی حرکت کے قائل تھے اور برہمگیت نے ان اعتراضات کے صحیح ہونے سے انکار کیا ہے، جو اس مسئلہ میں آریہ بھٹ پر کیے جاتے ہیں اور بعینہ یہی نظریہ آج کل لوگوں میں مقبول ہے۔

طب

تیسرا فن جو ہندوستان سے عربوں کو ملا وہ طب ہے، طب کی بعض کتابیں سریانی اور یونانی کے ذریعہ سے امویہ خاندان ہی کے زمانہ میں عربی میں منتقل ہو چکی تھیں، [۱] مگر عراق میں عباسیہ کے زمانہ حکومت میں اس کو اور بھی ترقی ہوئی اور اس کے آغاز کا واقعہ جیسا کہ پہلے گذر چکا ہے یہ ہوا کہ ہارون الرشید کے علاج کے لیے ہندوستان سے منکہ یا مانک نام وید طلب کیا گیا، اس کے علاج سے خلیفہ کو صحت ہوئی، اس طرح ہندوستانی طب کی طرف سلطنت کی توجہ ہوئی اور برامکہ نے اس میں خاطر خواہ حصہ لیا، چنانچہ برامکہ نے اپنے شفاخانہ کا افسر اعلی ایک وید ہی کو مقرر کیا تھا [۲] اسی پر انہوں نے بس نہ کی بلکہ یحییٰ بن خالد برمکی نے ایک کارندہ کو ہندوستان اس غرض سے بھیجا کہ وہ وہاں جا کر ہندوستان کی جڑی بوٹیاں لائے، [۳] اور ایک وید کو سرکاری دارالترجمہ میں اس لیے مقرر کیا کہ وہ سنسکرت کی طبی کتابوں کا ترجمہ عربی میں کرائے۔ [۴]

---

[۱] عیون الانباء فی طبقات الاطباء تذکرہ ماسرجویہ و مختصر الاصول ابوالفرج ملطی، ص ۱۹۲ (بیروت) [۲] فہرست ابن ندیم ص ۲۴۵ ۔ [۳] ایضاً ص ۳۴۵ [۴] ایضاً ص ۲۴۵۔

اسی طرح خلیفہ موفق باللہ عباسی نے بھی تیسری صدی ہجری میں ہندوستان اس غرض سے آدمی بھیجے کہ وہ ہندوستان کی دواؤں کی تحقیقات کریں۔[۱] یہ واقعہ زخاؤ نے انڈیا کے مقدمہ میں لکھا ہے، عربی تاریخوں میں اس واقعہ پر خود میری نظر نہیں پڑی ہے، البتہ ایک ضمنی تذکرہ میں یہ ملا ہے کہ خلیفہ معتضد باللہ عباسی (سنہ ۲۷۹۔ سنہ ۲۸۶ھ) نے احمد بن خفی دیلمی کو جو علم حساب و اصطرلاب کا ماہر تھا، چند باتوں کی تحقیقات کے لیے ہندوستان بھیجا تھا،[۲] پھر یہ بھی معلوم ہے کہ خلیفہ معتضد باللہ کے تعلقات اور ذرائع علم سندھ کے ساتھ قائم تھے، چنانچہ شوال سنہ ۲۸۰ھ میں جب دیبل (سندھ کی بندرگاہ) میں بہت بڑا چندر گرہن لگا اور ساتھ ہی زلزلہ آیا جس میں ڈیڑھ لاکھ آدمی دب کر مر گئے تھے، تو پرچہ نویسوں نے فوراً دربار خلافت میں اس کی خبر دی۔[۳]

طبی کتابوں کے ترجمے

عربی زبان میں سنسکرت کی جن طبی کتابوں کے ترجمے ہوئے ان میں دو کتابیں بہت مشہور ہیں، ایک ششرت کی کتاب جس کو عرب ''سسرو'' کہتے ہیں، یہ کتاب دس بابوں میں تھی، اس میں بیماریوں کے علامات اور ان کے علاج و دوا کی تفصیل ہے، یحییٰ بن خالد برمکی کے حکم سے منکہ نے اس کا ترجمہ کیا تاکہ برامکہ کے شفاخانہ میں وہ ایک طبی دستور العمل کا کام دے، دوسری کتاب چرک کی کتاب ہے جو ہندوستان میں طب کا بہت بڑا ماہر اور رشی گذرا ہے، یہ کتاب پہلے فارسی میں ترجمہ کی گئی پھر عبداللہ بن علی نے اس کو فارسی سے عربی میں منتقل کیا۔[۴]

تیسری کتاب کا نام ابن ندیم میں سندستاق اور یعقوبی کی مطبوعہ متن میں

---

[۱] مقدمہ ترجمہ انگریزی انڈیا، زخاؤ ص ۳۰۔ [۲] سوانح حسین ابن منصور علاج از طبقات ابن باکویہ شیرازی مرتبہ موسیولوئی میسگنن Louis Massignon پیرس، سنہ ۱۹۱۴ صفحہ ۴۴۔ [۳] تاریخ الخلفاء سیوطی صفحہ ۳۸۰ (کلکتہ) [۴] ابن ندیم صفحہ ۳۰۳

ہندوستان اور اسی کتاب کے ایک نسخہ میں سندھستان ہے، اس کی اصل سنسکرت میں شاید سدھستان ہے یا سندیسن، ابن ندیم نے عربی میں اس کے معنی ''خلاصہ کامیابی'' اور یعقوبی نے ''صورت کامیابی'' کے بتائے ہیں، میرے خیال میں یعقوبی کا نسخہ صحیح معلوم ہوتا ہے، بہر حال شفاخانہ بغداد کے افسر اعلی ابن دہن نے اس کا ترجمہ کیا تھا۔ [۱]

چوتھی کتاب کا نام یعقوبی نے ندان بتایا ہے، ابن ندیم نے اس کا ذکر نہیں کیا، اس میں چار سو چار بیماریوں کی صرف پہچان کا بیان ہے، علاج کا نہیں۔ [۲]

ایک کتاب جڑی بوٹیوں کے مختلف ناموں کے بیان میں ترجمہ ہوئی، جن میں سے ایک ایک جڑی کے دس دس نام بیان کیے گئے تھے، اس کو منکہ پنڈت نے سلیمان بن اسحاق کے لیے عربی میں ترجمہ کیا۔ [۳]

ایک اور کتاب جس میں ہندی اور یونانی طبیبوں کی دواؤں کے سرد و گرم ہونے، دواؤں کی قوتوں اور سال کے موسموں کی تقسیم میں جو اختلافات ہیں ان کی تفصیل تھی ترجمہ ہوئی۔ [۴]

ابن ندیم نے طب ہندی کی ایک اور کتاب کا نام استانگر لکھا ہے، جس کا ترجمہ ابن دہن نے کیا تھا۔

نوکشنل (نوشنل؟) نام ایک وید کی دو کتابوں کے ترجمے کیے گئے، ان میں سے ایک میں سو بیماریوں اور سو دواؤں کا ذکر تھا اور دوسری میں بیماریوں کے وہم اور اسباب کا بیان تھا۔

ایک ہندو پنڈتہ (عورت) رؤسا نامی کی ایک کتاب کا ترجمہ ہوا جس میں خاص عورتوں کی بیماریوں کے علاج درج تھے۔

ایک اور کتاب حاملہ عورتوں کے علاج میں۔

---

[۱] ابن ندیم ص ۳۰۳ و یعقوبی اول ص ۱۰۵ ۔ [۲] یعقوبی اول صفحہ ۱۰۵۔ [۳] ابن ندیم ص ۳۰۳ و یعقوبی اول صفحہ ۱۰۵۔ [۴] یعقوبی اول صفحہ ۱۰۵۔

ایک مختصر کتاب جڑی بوٹیوں کے حال میں۔

ایک کتاب نشہ کے بیان میں۔ ۱

مسعودی نے طب کی ایک کتاب کا نام اور حال اس طرح لکھا ہے کہ ''راجہ کورش کے لیے طب کی ایک بڑی کتاب لکھی گئی تھی جس میں بیماریوں کے اسباب اور دوا اور علاج اور دواؤں کی پہچان اور اس میں بوٹیوں کی شکل وصورت کی تصویر بنائی گئی تھی''۔ ۲

بس جانے والی چیزوں کے بیان میں ابن ندیم نے عطر کا ذکر کیا ہے جو بہت ممکن ہے کہ اتری نام ایک وید کی طرف منسوب ہو، ایک اور پنڈت کا نام سنوبرم ابن ندیم میں ہے، ۳ اس کی اصل شاید ستیاورمن ہو، جس کی کتاب ستیا کا نام بیرونی نے لیا ہے۔ ۴

کتابوں کے علاوہ سنسکرت اور ہندوستان کے ان باقی ماندہ اثرات کا ذکر کرنا ہے جو عربی طب میں اب تک موجود ہیں۔

ان میں ان اثرات کا ذکر نہیں، جو ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں کے زمانہ میں طب عربی پر پڑے، کہ وہ ایک الگ مضمون ہے، بلکہ ان اثرات سے بحث ہے جو چوتھی صدی ہجری تک کی عربی طب پر مؤثر ہوئے ہیں، اس سلسلہ میں سب سے پہلے تو وہ دوائیں ہیں جو ہندوستان سے عرب گئیں اور برامکہ اور خلفاء نے ان کی تحقیقات کے لیے ہندوستان آدمی بھیجے، ان میں بہت سی دواؤں کے نام نہ صرف پیدائش کی جگہ کے لحاظ سے بلکہ زبان کے لحاظ سے بھی ہندی ہیں اور کم از کم ایک دوا ایسی ہے جس کا نام ہندوستان کی نسبت سے خود پیغمبر اسلام علیہ السلام کے زمانہ میں عرب میں سنائی دیتا ہے، یعنی قسط ہندی ۵ اور زنجبیل (زرنجابیرا) یعنی سونٹھ کا لفظ خود قرآن میں ہے، اس قسم کی کچھ اور دواؤں کے نام تجارتی تعلقات کے باب میں ہم نے دے دیے ہیں۔

---

۱ اوپر کی سات کتابوں کا ذکر ابن ندیم صفحہ ۳۰۳ میں ہے۔ ۲ مسعودی جلد اول صفحہ ۱۶۲ (پیرس) ۳ ابن ندیم صفحہ ۳۰۵۔ ۴ زخاؤ کی کتاب انڈیا کا مقدمہ صفحہ ۳۳۔ ۵ صحیح بخاری ج ۲ ص ۸۴۹ کتاب المرض۔

عربی میں دو لفظ جن میں ایک دوا کا اور ایک غذا کا نام ہے سب سے زیادہ عجیب ہیں، دوا میں اطریفل جو اس قدر مشہور ہے اور ہر طبیب اور ہر مریض کی زبان پر ہے، محمد خوارزمی نے چوتھی صدی میں لکھا ہے کہ یہ ''ہندی لفظ تری پھل'' ہے کہ یہ تین پھلوں 'ہلیلہ'، 'بلیلہ' اور 'آملہ' سے بنتا ہے'' [۱] ایک اور اسی قسم کی دوا کا نام ایجات ہے، خوارزمی کہتا ہے ''کہ انبہ (آم) ہندوستان میں ایک پھل ہوتا ہے اس کو شہد، لیموں اور ہلیلہ میں دے کر انیجات تیار کیا جاتا ہے، غالباً اس کو گڑانبہ یا آموں کا اچار یا مربّٰی کہنا چاہیے، لیکن ان سب سے زیادہ عجیب لفظ ''بہطہ'' ہے جس کی تفسیر خوارزمی نے یہ بتائی ہے کہ ''یہ بیماروں کی غذا کی قسم ہے، یہ لفظ سندھی ہے، یہ دودھ اور گھی میں چاول کو پکا کر تیار ہوتا ہے'' [۲] آپ سمجھے؟ یہ ہمارا ہندوستانی بھات ہے جو عربوں کے نزدیک بیماروں کے لیے ایک نرم اور ہلکی غذا ہوئی، اس کو اب کھیر سمجھیے یا فیرنی۔

بیطاری

جانوروں کے علاج میں شاناق یا چانک پنڈت کی کتاب ترجمہ ہوئی۔ [۳]

نجوم، جوتش، جفر اور رمل

سب کو معلوم ہے کہ یہ چیزیں ہندوستان سے کس قدر تعلق رکھتی ہیں، دولت عباسیہ کے دوسرے خلیفہ منصور ہی کے وقت سے جو سنہ ۱۴۷ھ میں تخت نشین ہوا عربی میں ان چیزوں کا رواج ہوا، منصور کو ان باتوں سے بڑی دلچسپی تھی، چنانچہ بغداد کا شہر جب اس نے بنوایا تو اس کی ہر چیز زائچہ کھینچ کھینچ کر تیار کی گئی، دربار پر پہلے ایرانی منجموں کا قبضہ تھا، پھر ہندو جوتشیوں نے اپنا عمل دخل جمایا، معلوم ہوتا ہے کہ منصور ہی کے زمانہ میں اس فن پر ہندی کتابیں عربی میں ترجمہ ہوئی، ان جوتشی پنڈتوں میں سے عربوں میں سب سے مشہور نام کنکہ پنڈت کا ہے، ابن ابی اصیبعہ نے لکھا ہے کہ یہ ایک مشہور اور نامی طبیب تھا۔ [۴]

---

[۱] مفاتیح العلوم خوارزمی ص ۱۸۶۔ [۲] ایضاً ص ۱۷۷ [۳] ایضاً ص ۱۶۷ [۴] عیون الانباء فی طبقات الاطباء ج ۲ ص ۳۳ (مصر)

زخاؤ کی تحقیق کی بنا پر اس نام کی ہندی اصلیت کنکنایا ہوگی کیوں کہ اس نام کا مشہور طبیب ہندوستان میں پہلے گذر چکا ہے جس کا نام ہندوستانی دواؤں میں سند ہے۔ [۱]

ابن ندیم نے عربی میں اس پنڈت کی چار کتابوں کا ذکر کیا ہے۔ [۲]

۱۔ کتاب النمو دار فی الامبار (عمروں کے بیان میں کتاب)۔

۲۔ کتاب اسرار الموالید (پیدایشوں کے بھید) جاتک۔

۳۔ کتاب القرانات الکبیر (بڑے قران یا بڑے لگن کے بیان میں)۔

۴۔ کتاب القرانات الصغیر (چھوٹے لگن کے بیان میں)

ابن ابی اصیبعہ کا بیان ہے کہ یہ کتاب طب میں ہے مگر ابن ندیم نے اس کو نجوم ہی میں ذکر کیا ہے، یہ ممکن ہے کہ دونوں میں ہو کیوں کہ پرانی طب میں نجوم کی بہت سی باتیں داخل تھیں، ابن ابی اصیبعہ [۳] نے اس کی دو کتابوں کا اور نام لیا ہے۔

۵۔ کتاب فی التوہم (مسمورزم کے بیان میں)۔

۶۔ کتاب فی احداث العالم والدور فی القران (دنیا کے واقعات اور ستاروں کے لگن میں چکر) یہی مصنف مسلمان منجم ابومعشر بلخی سنہ ۲۷۲ھ (سنہ ۸۸۶ء) کے حوالہ سے نقل کرتا ہے کہ ''یہ کنکہ ہندوستان کے تمام پنڈتوں کے نزدیک جوتش میں سب سے بڑا ہے''۔

عطارد بن محمد ایک مسلمان منجم نے جو غالباً دوسری صدی ہجری میں ہوا، ہندی جفر میں ایک کتاب لکھی تھی [۴] اس کے علاوہ ابن ندیم نے تین اور ہندو جوتشیوں کے نام لیے ہیں۔ [۵]

۱۔ جودر ہندی، اس کی کتاب کا نام کتاب الموالید (پیدایشوں کی کتاب) ہے۔

۲۔ نیک یا نایک (نیق) ہندی، اس کی کتاب کا نام کتاب اسرار المسائل

---

[۱] مقدمہ انڈیاص ۳۲۔ [۲] الفہرست، ص ۲۷۰ [۳] عیون الانباء فی طبقات الاطباء ج ۲ ص ۳۳ (مصر)

[۴] ابن ندیم ص ۲۷۸ [۵] ایضاً ص ۲۷۱۔

(سوالوں کے بھید) ہے۔

۳۔ سنگھل ہندی (منجھل) اس کی کتاب کا نام کتاب المواليد الكبير (پیدایشوں کی بڑی کتاب) سنگھل کا نام بیرونی نے بھی نجوم کے بیان میں لیا ہے۔[۱]

ہندوستان کی کسی زبان سے ایک کتاب ہتھیلی کی لکیروں اور ہاتھوں کو دیکھ کر حال بتانے کی عربی میں ترجمہ ہوئی[۲] نیز ایک اور کتاب ''زجر الہند'' ہندی فال پر[۳] ہے۔

سانپوں کا علم

ہندوستان کے لوگ سانپوں کے اقسام اور ان کے جھاڑ پھونک اور منتر میں مشہور ہیں اور اس کا نام ان کے ہاں ''سرپ ودیا'' ہے، رائے نامی ایک پنڈت کی کتاب اس فن میں ترجمہ ہوئی جس میں سانپوں کے اقسام پر ان کے زہروں کا بیان تھا،[۴] عربی میں ایک اور ہندی پنڈت کی کتاب کا ذکر ہے جو اسی فن پر تھی۔[۵]

زہروں کا علم

ہندوستان کو اس فن میں بھی کمال تھا، زکریا قزوینی نے آثار البلاد میں ''ہند'' کے ذکر میں ''بیش'' نام ایک جڑی کا اور راجاؤں میں باہم اس کے ذریعہ ایک دوسرے کو دوستی کے پردہ میں مارنے کا عجیب قصہ لکھا ہے، یہ بیش لفظ ہندی کا ''بش'' ہے جس کے معنی زہر کے ہیں، بہرحال بادشاہوں کو اپنی حفاظت اور اپنی جان بچانے کے لئے اس علم سے واقفیت کی بڑی ضرورت رہتی تھی، عربی میں چانک یا شاناق پنڈت کی کتاب کا جو لڑائی پر ہے نام پہلے آچکا ہے، جس کا آخری باب ''کھانا اور زہر تھا'' معلوم ہوتا ہے کہ اس کے علاوہ خاص زہروں کے بیان میں بھی اس کی کوئی کتاب تھی جو ساتویں صدی ہجری (تیرہویں صدی عیسوی) تک عربی میں موجود تھی، کیوں کہ ابن ابی اصیبعہ نے سنہ ۶۶۸ھ (سنہ ۱۲۷۰ء) نے

---

[۱] کتاب الہند صفحہ ۷۶ ۔ [۲] ابن ندیم ص ۳۱۴ ۔ [۳] ایضاً [۴] ایضاً ص ۳۰۳ [۵] عیون الانباء فی طبقات الاطباء ص ۳۴ (مصر)

اس کتاب کا پورا حال اس طرح لکھا ہے کہ ''یہ کتاب پانچ بابوں میں ہے، منکہ یا مانک پنڈت نے یحییٰ بن خالد برمکی کے لیے فارسی میں ابوحاتم بلخی کی مدد سے ترجمہ کیا، پھر عباس بن سعید چودھری نے اس کا دوبارہ ترجمہ خلیفہ مامون الرشید (سنہ ۲۱۸ھ) کے لیے کیا'' [۱]

اسی زہروں کے فن پر مصنف کا نام لیے بغیر ایک کتاب کا ذکر جو ہندی سے عربی میں ترجمہ ہوئی، ابن ندیم کی فہرست میں بھی موجود ہے۔ [۲]

موسیقی

جاحظ (سنہ ۲۵۵ھ) کا بیان گذر چکا ہے، جس میں اس نے ہندوستان کی موسیقی کی تعریف کی ہے اور خاص طور سے بک تارے کا ذکر کیا ہے، بغداد کی تصنیفات میں ہندی موسیقی پر کسی کتاب کا نام نہیں ملتا لیکن اسپین کے ایک علمی مؤرخ قاضی صاعد اندلسی سنہ ۴۶۲ھ (سنہ ۱۰۷۰ء) نے لکھا ہے کہ ''موسیقی میں ہندستان کی ایک کتاب نافرہم تک پہنچی ہے جس کے لغوی معنی ''دانائی کے پھل'' کے ہیں اور جس میں راگوں اور سروں کا بیان ہے'' [۳] عجب نہیں کہ یہ فارسی کا ''نوبر'' (نیا پھل) نام ہو اور فارسی ترجمہ کے ذریعہ سے عربی میں یہ کتاب منتقل ہوئی ہو لیکن میرے ایک ہندو دوست نافر کی نسبت کہتے ہیں کہ وہ ''ناد'' ہوگا جو سنسکرت میں آواز کو کہتے ہیں۔

مہابھارت

ہندوستان کی قدیم تاریخ میں ایک فارسی کتاب مجمل التواریخ پیرس لائبریری میں ہے جس میں بہت کچھ مہابھارت کے قصے ہیں، اس کتاب کے مقدمہ میں ہے کہ اس کو سنسکرت (ہندوانی) زبان سے ابوصالح بن شعیب نے عربی میں ترجمہ کیا تھا پھر سنہ ۴۱۷ھ میں ابوالحسن علی جبلی نے جو کسی دیلمی امیر کے کتب خانہ کا مہتمم تھا اس کا عربی میں ترجمہ کیا،

---

[۱] عیون الانباء فی طبقات الاطباء ص ۳۳ [۲] ص ۳۱۷ [۳] طبقات الامم قاضی صاعد اندلسی ص ۱۴ (بیروت)

الیٹ صاحب نے اس کا کسی قدر خلاصہ دیا ہے۔ [۱]

سیاست جنگ اور راجنیت

اس فن میں ہندی زبان (سنسکرت یا پالی؟) سے عربی میں دو ہندو فاضلوں کی کتابیں عربی میں ترجمہ ہوئیں، ان میں سے ایک کا نام عرب شاناق بتاتے ہیں اور دوسرے کا باکیر یا باجیر، شاید پہلا نام چانک ہو اور دوسرا دیا گیر، چانک یا شاناک ہندی کی کتاب کا مضمون یہ ہے: ''لڑائی کا انتظام اور بادشاہ کو کیسے آدمی چننا چاہیے اور سواروں کی ترتیب اور کھانا اور زہر'' [۲] اور باجیر یا ویا گیر کی کتاب ''تلواروں کی پہچان اور اس کی خوبیوں اور اس کے نشانات'' میں ہے [۳] سنسکرت سے ایک اور کتاب کا عربی میں ترجمہ ہوا جس کا عربی نام ''ادب الملک''، یعنی ''سلطنت کے طریقے'' ہے، اس کتاب کے عربی مترجم کا نام ابوصالح بن شعیب ہے، زمانہ کا پتہ نہیں ہے، اس وقت اس کا صرف فارسی ترجمہ موجود ہے، یہ ترجمہ سنہ ۴۱۷ھ میں ابوالحسن بن علی جبلی نے کیا تھا، جو ایک دیلمی امیر کے کتب خانہ کا مہتمم تھا۔ [۴]

کیمیا

پرانی کیمیا کی اصلیت جو کچھ ہو مگر اس فن میں ایک ہندو فاضل کی کتاب کے ترجمہ کا پتہ ابن ندیم میں ملتا ہے [۵] اور مشہور عرب کیمیا ساز جابر بن حیان کی ایک کتاب خاطف بھی اسی ہندی نسبت کے ساتھ مذکور ہے، [۶] لیکن اس ہندی فاضل کا نام بہت مشکوک ہے۔

حدود منطق

فہرست ابن ندیم (سنہ ۳۷۷ھ) میں ایک عربی کتاب کا جو ہندی سے ترجمہ ہوئی اس طرح ذکر ہے: ''کتاب حدود منطق الہند'' [۷] (ہندوستان کی منطق کے حدود)

---

[۱] تاریخ ہند ایلیٹ جلد اول ص ۱۰۰۔ [۲] ابن ندیم ص ۳۱۵ ۔ [۳] ایضاً۔ [۴] ایلیٹ جلد اول ص ۱۱۲

[۵] ابن ندیم ص ۳۵۳۔ [۶] ایضاً ص ۳۵۹۔ [۷] ایضاً ص ۳۰۵۔

لیکن یعقوبی (سنہ ۲۷۸ھ) نے جو ابن ندیم سے سو برس پہلے گذرا ہے اس کتاب کا ذکر منطق وفلسفہ کی کتابوں کے ضمن میں اس نام سے کیا ہے ''کتاب ''طوفانی علم حدود المنطق'' [۱] (طوقا تویا) کی کتاب منطق کے حدود کے علم میں) بحث یہ ہے کہ اس منطق سے علم منطق کی اصطلاح مراد ہے، جس کو نیا یہ (لاجک) کہتے ہیں یا اس لفظ کے لغوی معنی مراد ہیں، یعنی بولذا اور کتاب محض قصہ کہانی ہو یا ادب واخلاق میں ہو اور اس سے مقصود یہ ہو کہ انسان کے بولنے کے حدود بتانے والی کتاب کہ کہاں بولنا اور کہاں نہ بولنا چاہیے اور کس طرح بولنا چاہیے، ابن ندیم نے اس کتاب کا ذکر اس عنوان کے نیچے کیا ہے: ''ان ہندی کتابوں کے نام جو قصہ کہانی اور افسانہ ہیں''، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ منطق میں نہ تھی۔

معانی و بیان

جاحظ (سنہ ۲۵۵ھ) نے اپنی کتاب البیان والتبیین میں لکھا ہے [۲] کہ ''جس زمانہ میں یحییٰ بن خالد برمکی نے بہت سے ہندو پنڈتوں کو بلوایا تھا، معمر نے ان میں سے ایک سے پوچھا کہ اہل ہند کے نزدیک بلاغت کس کو کہتے ہیں؟ اس نے کہا میرے پاس اس مضمون پر ایک چھوٹا سا رسالہ ہے، لیکن میں اس کا ترجمہ نہیں کر سکتا اور نہ یہ فن میں جانتا ہوں، معمر کا بیان ہے کہ میں اس مختصر رسالہ کو لے کر مترجموں کے پاس گیا، انہوں نے اس کا یہ ترجمہ کیا، اس کے بعد جاحظ نے اس رسالہ کا خلاصہ ایک صفحہ میں دیا ہے، جس میں یہ بحث ہے کہ مقرر کو کیسا ہونا چاہیے اور کس وقت کے لیے کیسی تقریر مناسب ہے''۔

منتر، کرتب اور جادو

ہندوستان کا یہ مشہور پرانا فن ہے اور اکثر عربی کتابوں میں جہاں ہندوستان کی خصوصیتوں کا ذکر ہے یہاں کی کرتبوں، بازیگروں اور جادوگروں کا ذکر خاص طور سے کیا گیا ہے، ابن ندیم کہتا ہے ''اہل ہند کو جادو اور منتر کا بہت اعتقاد ہے''، پھر کہتا ہے کہ ''اہل ہند علم

---

[۱] یعقوبی ص ۱۰۵ [۲] کتاب البیان والتبیین جلد اول ص ۴۰ (مصر)

تو ہم میں خاص کمال رکھتے ہیں اور اس فن میں ان کی کتابیں ہیں جن میں سے کچھ کا عربی میں ترجمہ ہوا ہے''، علم تو ہم سے مقصود شاید وہی چیز ہے جس کو آج مسمرزم کہتے ہیں [۱] یعقوبی نے اس کے یہ معنی لکھے ہیں کہ'' جیسا کہ خیال کر کے یقین دلایا جائے ویسا ہی ہو'' [۲] اور لکھا ہے کہ کیبن نام ایک راجہ اس کا موجد ہے۔

ابن ندیم ایک ہندو مصنف کا ذکر کرتا ہے جس کا نام اڈیٹر سے بھی پڑھا نہیں گیا اور اسی طرح لکیر بنا کر اس نے چھوڑ دیا ہے، بظاہر'' سیسہ ہندی'' معلوم ہوتا ہے، پھر لکھتا ہے کہ'' یہ پرانے لوگوں میں ہے اس کا طریقہ نیرنگ و نظر بند میں ہندوستان کا طریقہ ہے، اس کی ایک کتاب ہے جس میں توہم والوں (مسمرائزر؟) کا طریقہ اختیار کیا ہے۔ [۳]

کہانی اور افسانے

اس ضمن میں ہندوستان کی کئی کتابیں عربی میں ترجمہ ہوئیں جن میں سے دو کے نام سندباد حکیم (پنڈت) کی کتاب ہے، اس کے دو نسخے ہیں، ایک چھوٹا، دوسرا بڑا، اس کتاب کے متعلق بعضوں کا خیال ہے کہ وہ ایرانیوں کی تصنیف ہے مگر ابن ندیم کہتا ہے کہ'' صحیح یہ ہے کہ یہ ہندوستان کی تصنیف ہے'' یہ ممکن ہے کہ بعض دوسری کتابوں کی طرح یہ کتاب بھی پہلے فارسی میں ترجمہ ہوئی ہو اور پھر فارسی سے عربی میں منتقل ہوئی ہو اور اس لیے لوگوں کو اس کے ایرانی ہونے کا دھوکا ہوا ہو۔

الف لیلہ میں سند باد بری اور بحری کے نام دو قصے ہیں، جن میں سے ایک میں سندباد نام ایک تاجر کے دریائی سفر کے اور دوسرے میں خشکی کے سفر کے عجیب و غریب واقعات درج ہیں، اس سندباد کے لفظ سے بعض صاحبوں کو یہ شبہ ہوا [۴] کہ وہ ہندی قصہ یہی ہے مگر یہ صحیح نہیں ہے، کیوں کہ اول تو یہ حکیم سندباد [۵] کے قصے اور الف لیلہ میں تاجر سندباد کے

---

[۱] الفہرست ص ۳۰۹۔ [۲] یعقوبی ج ۱ ص ۹۷۔ [۳] ابن ندیم ص ۳۱۲ [۴] رسائل شبلی ص ۲۶۳ طبع اول مضمون تراجم [۵] فہرست ص ۳۰۵ سطر ۲ و ۱۰ اور یعقوبی ج ۱ ص ۱۰۵۔

قصے ہیں، دوسرے الف لیلہ کے سند باد کے سفر کے جو قصے ہیں وہ ہندو ذہنیت اور حالات کے قطعاً موافق نہیں، پھر مسعودی [۱] نے اس واقعہ کے اجزا یہ لکھے ہیں، ''سات وزیروں، ایک گرو، ایک لڑکا، ایک رانی، الی کہانی''، یہ الف لیلہ کے سند باد پر چسپاں ہیں۔

ان کے علاوہ ہندی کی چند اور کہانیاں بھی عربوں نے اپنی زبان میں نقل کرائیں جن میں سے ایک دیپک ہندی کی کہانی ہے، جس میں ایک عورت اور مرد کا قصہ ہے، ایک حضرت آدم کے زمین میں آنے کی کہانی ہے [۲] معلوم نہیں اس کہانی سے کون سی دو یونانی کہانی کی طرف اشارہ ہے، اسی طرح ایک راجہ کی کہانی ہے، جس میں لڑنے اور تیرنے کا بیان ہے، ایک اور کہانی میں دو ہندیوں کا حال ہے، جن میں سے ایک سخی داتا اور دوسرا کنجوس تھا، دونوں کا سخاوت اور کنجوس پن میں مناظرہ اور راجہ کا پھر فیصلہ ہے، [۳] ایک اور کتاب تریاچتر (عورتوں کے فریب) میں ترجمہ ہوئی، اس کے مصنف کا نام راجہ کوش لکھا ہے۔ [۴]

ایک اور کتاب علم الہند (حکم الہند؟) کا بھی پتہ چلتا ہے جس کا پہلے نثر میں ترجمہ ہوا تھا، پھر ابان شاعر [۵] نے اس کو نظم میں منتقل کیا، ہندوستان کے متعدد قصوں اور کہانیوں کے حوالہ اخوان الصفا کے رسائل میں ملتے ہیں۔

اخلاق و حکمت

پرانے حکیموں کا دستور تھا کہ وہ اخلاق، حکمت اور دانائی کی باتیں قصوں کہانیوں اور تمثیلوں میں بیان کیا کرتے تھے اور کتوں، چوہوں، بلیوں، کوؤں، کی زبانوں سے انسانوں کو سمجھاتے تھے، سنسکرت کی ایک خاص کتاب جس نے فارسی اور عربی میں اس

---

[۱] تاریخ مروج الذہب مسعودی ج ۱ ص ۱۶۲ (لیڈن) [۲] فہرست ابن ندیم ص ۳۰۵۔ [۳] ایضاً ص ۳۱۶
[۴] تاریخ یعقوبی جلد اول ص ۱۰۵۔ [۵] ابن ندیم ص ۱۱۹ غالباً یہ کتاب وہی کلیلہ دمنہ ہے جس کا ذکر آگے آتا ہے

حیثیت سے خاص شہرت حاصل کی کلیلہ دمنہ ہے، جس کا بیرونی کے بیان کے مطابق سنسکرت نام ''پنچ تنتر'' ہے، یہ کتاب اسلام سے پہلے سنسکرت سے ایران کے ساسانی باشاہوں کے زمانہ میں فارسی میں ترجمہ ہوئی، پھر عبداللہ بن مقفع نے دوسری صدی ہجری کے وسط میں عربی میں اس کو منتقل کیا، اس کتاب نے عربی میں اتنی شہرت حاصل کی اور سلاطین اورامرا نے اس کی اتنی قدر کی کہ عربی سے فارسی میں، فارسی سے عربی میں، نظم سے نثر میں اور نثر سے نظم میں، اس کی متعدد نقلیں ہوتیں رہیں اور مترجم، شاعر اور نثار اس کے ترجمہ نظم اور انشا میں اپنا جوہر دکھا دکھا کر مسلمان بادشاہوں سے گراں قدر انعام پاتے رہے، دوسری صدی کے آخر میں ابان نام عربی کے ایک شاعر نے جب اس کا عربی نظم میں ترجمہ کر کے ہارون الرشید کے وزیر جعفر برمکی کی خدمت میں پہونچ گیا تو اس نے اس کو ایک لاکھ درہم انعام دیا[1] عربی زبان سے اس کتاب کے ترجمے دنیا بھر کی زبانوں میں ہوئے، یورپ، ایشیا اور افریقہ کی کوئی مہذب زبان نہیں جس میں اس کا ترجمہ نہ ہوا، اس کتاب کے تراجم اور نسخوں کے الٹ پھیر کی خود ایک مستقل تاریخ ہے، اردو میں ڈاکٹر سید علی بلگرامی مرحوم نے مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس علی گڑھ منعقدہ سنہ ۱۸۹۱ء میں اس پر ایک مفصل محققانہ لکچر دیا ہے، اس کے متعلق دوسرا مضمون راقم کا ہے جو علی گڑھ کے منتھلی میگزین میں شاید سنہ ۱۹۰۵ء یا اس کے ایک آدھ سال آگے پیچھے شائع ہوا ہے۔

اس کتاب کا مصنف بیدیا پنڈت اور جس راجہ کے لیے لکھی اس کا نام دابشلیم بتایا گیا ہے، بادشاہوں کو جن باتوں کی ضرورت ہے جانوروں کے قصوں اور کہانیوں کے ذریعہ سے دس بابوں میں ان کی تعلیم دی گئی ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دابشلیم جس راجہ کا نام بتایا گیا ہے وہ گجرات کا راجہ تھا، کیوں کہ چوتھی صدی ہجری (دسویں صدی عیسوی) کے عرب سیاح ابن حرقل نے گجرات کے راجہ ولبھ رائے کا نام لے کر لکھا ہے کہ ''تمثیلوں والی کتاب

---

[1] کتاب الوزرا والکتاب جہشیاری، مطبوعہ ویانا (السٹریا) سنہ ۱۹۲۶ء ص ۲۵۹

(کتاب المثال) والا راجہ" [۱] اور عربی میں تمثیلوں والی کتاب یہی کلیلہ دمنہ سمجھی جاتی ہے، یعقوبی نے لکھا ہے کہ راجہ داہشلیم کے عہد میں بیدیا پنڈت نے یہ کتاب لکھی [۲] اور فرشتہ میں ہے کہ سلطان محمود کے حملہ گجرات کے وقت گجرات کے معزول راجہ کے خاندان کا لقب داہشلیم تھا۔

پروفیسر زخاؤ کی غلطی

انڈیا کے مقدمہ میں پروفیسر زخاؤ نے ابن ندیم کے حوالہ سے کتاب بیدیافی الحکمۃ (بیدیا کی کتاب دانائی میں) کا نام لیا ہے اور اس کی تحقیق یہ کی ہے کہ بیدیا اصل میں ویدویاس ہے، جو ویدانت کے بانی تھے، اس لیے دانائی کے فن میں بیدیا کی کتاب سے مراد ویدانت ہے، پھر اس غلط قیاس پر ایک اور قیاس کھڑا کر لیا کہ مسلمانوں میں وحدت وجود کا فلسفہ اسی ویدویاس ویدانت کے ترجمہ سے آیا، [۳] ہم کو اس سے انکار نہیں کہ بعد کے مسلمان صوفیوں پر ویدانت کا اثر نہیں پڑا لیکن اس سے انکار ہے کہ اس قدیم عہد میں ویدانت سے عربوں اور مسلمانوں کو کسی قسم کی واقفیت تھی، ابتدائی مسلمان صوفیوں کی وحدت وجود پر اسکندریا کے نیوافلاطونی فلسفہ کا اثر البتہ پڑا ہے، بہرحال اس مسئلہ کی تاریخ سے یہاں بحث نہیں، بلکہ ابن ندیم کے اس فقرہ سے فاضل مستشرق کو جو دھوکا ہوا ہے اس کو دور کرنا مقصود ہے، عربی میں حکمت، دانائی، عقل مندی، اور تمثیلوں کے ذریعہ سے جو عقل اور نصیحت کی باتیں سمجھائی جاتی ہیں ان کو حکمت کہتے ہیں، بیدیا کی کتاب سے مراد یہی کلیلہ دمنہ والی کتاب ہے جس کا مصنف اس کے فارسی ترجمہ کے شروع میں بیدیا پنڈت بتایا گیا ہے [۴] اور جس کا موضوع قصوں اور تمثیلوں میں عقل اور حکمت کی باتیں سکھاتا ہے، اسی لیے ابن ندیم نے بیدیا کی کتاب حکمت کا نام قصوں اور افسانوں کے ضمن میں لیا ہے، فلسفہ کے ضمن میں نہیں لیا ہے۔

---

[۱] سفرنامہ ابن حوقل ص ۲۲۷، [۲] جلد اول ص ۹۷ [۳] مقدمہ انڈیا ص ۳۳، [۴] یعقوبی جلد اول ص ۹۷

بہر حال یہ وہ اہم کتاب ہے جس کو ہندوستان کے دماغ نے پیدا کیا اور عربوں کی کوششوں نے اس کو دنیا کے گوشہ گوشہ میں پھیلا دیا، بیرونی لکھتا ہے کہ عبداللہ بن مقفع جو مانی (مجوسی فرقہ) مذہب کا پیرو تھا اس نے اپنے خیال و اعتقاد کے مطابق اصل کتاب کے ترجمہ میں تحریفیں کی ہیں، میری دلی خواہش تھی کہ اس کی اصل کتاب پنج تنتر سے صحیح اور ایماندارانہ ترجمہ کرنے کا مجھے موقع مل سکتا،[1] مگر معلوم ہوتا ہے کہ بیرونی کو اس کا موقع نہ مل سکا، یہ کتاب عربی میں عام ہے اور بچوں کے نصاب میں آج کل بھی کہیں کہیں داخل ہے۔

ہندی حکمت و دانش کی دوسری کتاب ''بوذاسف و بلوہر'' ہے جس کی شہرت گو کلیلہ دمنہ سے کم ہے مگر اس کی اہمیت اور بلندی اس سے کہیں بہت بڑھ کر ہے، ابن ندیم نے اس کا ذکر ان ہندی افسانوں میں کیا ہے جو عربی میں ترجمہ ہوئے ہیں، اس میں تو کوئی شک ہی نہیں کہ بوذاسف سے بدھ مطلب ہے، پرانی فارسی میں دال کی جگہ ذال لکھتے تھے، اس لیے بوداسف کی جگہ بوذاسف ہوگیا، اخیر حرف سف بقول زخاؤ ستو ہے، بودھی ستو کا بوذاسف ہوگیا ہے کہ خاص قسم کے واؤ جیسے رومن کی V عربی میں ف ہو جاتی ہے اور بلوہر کی اصل زخاؤ صاحب ''پروھیتر'' سمجھتے ہیں، جس کے معنی گرو کے ہیں، اس کتاب میں بدھ کی پیدائش، تربیت اور پھر ایک اتفاقی واقعہ سے اس کا دنیا سے بیزار ہونا اور اس کی خبر سن کر سراندیپ کے ایک جوگی (فقیر) کا سوداگر کے لباس میں اس کے پاس آنا اور تلمیح و اشارہ میں اور حکایتوں اور تمثیلوں میں شاگرد و استاد کا دنیا کے سربستہ رازوں اور کائنات کے لاینحل عقدوں پر تشفی بخش بات چیت اور سوال و جواب ہے، یہ کتاب عربی زبان سے مختلف زبانوں میں پھیلی اور مذہبی حلقوں میں اس قدر پسند کی گئی کہ عیسائیوں نے اس کو اپنے مقدس ولی کی طرف منسوب کرلیا۔ مسلمانوں کے ایک فرقہ نے اس کے بڑے حصہ کو لے کر اپنے امام کی تصنیف بتایا۔ اخوان الصفا جو چوتھی صدی کی ایک نیم مذہبی اور نیم فلسفیانہ کتاب

[1] کتاب الہند ص ۲۷۶ (لندن)

ہے اور جس کی اس حیثیت سے ایک خاص اہمیت ہے کہ ایک خاص نظام تخیل (یا اسکول آف تھاٹ) کے طریق پر یہ کتاب چوتھی صدی میں ایک پوشیدہ انجمن نے راز دارانہ طریقہ پر لکھی تھی اور اسلام کے ایک خاص فرقہ کے نزدیک وہ ایک مذہبی صحیفہ کی حیثیت رکھتی ہے، اس کتاب میں بھی اس بوذاسف و بلوہر کی کتاب کے مختلف ابواب داخل ہیں، تیس برس ہوئے کہ مولوی عبدالغنی صاحب وارثی بہاری مرحوم نے اس کا عربی سے نہایت سلیس اردو میں ترجمہ کیا تھا، مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب اس کتاب کا یہ اردو ترجمہ چھپا اور میرے نگراں عزیز کے پاس یہ آئی تو اس وقت میں عربی کی معمولی کتابیں پڑھتا تھا، میں نے ان سے اس کتاب کے دیکھنے کی خواہش ظاہر کی مگر انہوں نے یہ کہہ کر دینے سے انکار کیا کہ تم اس کو پڑھ کر دنیا سے بیزار ہو جاؤ گے اور لکھنا پڑھنا چھوڑ دو گے، اس فقرہ نے میرے شوق کو ''ارتکاب جرم'' پر آمادہ کر دیا، رات کو جب وہ سو گئے تو ان کی میز پر سے میں یہ کتاب چپکے سے اٹھالایا اور صبح ہوتے ہوتے اس کو ختم کر کے پھر میز پر جا کر رکھ دیا، وہ دن ہے کہ اور آج کا دن ہے کہ میری نظر میں وہ کتاب دنیا کی ان چند کتابوں میں سے ہے جن کی تاثیر گنہ گاروں کے دلوں میں بھی گھر کر لیتی ہے، اس میں بعض ایسی مؤثر مثالیں بھی ہیں جو آج مسیح کے کلام میں ہم کو ملتی ہیں اور ہم نہیں کہہ سکتے کہ موسیٰ کس سمندر کی تہہ سے پہلے نکلے ہیں۔

خاتمہ پر ان دو مسلمان فاضلوں کا ذکر کرنا ہے جو سیر و سیاحت کی غرض سے نہیں بلکہ ہندوستان کے علم و فن کی گنگا سے سیراب ہونے کے لیے اس ملک میں آئے اور کامیاب واپس گئے۔

تنوخی

ان میں پہلا شخص محمد بن اسماعیل تنوخی ہے، غالباً اس کا زمانہ تیسری صدی ہجری (نویں صدی عیسوی) کا ہوگا، یہ نجوم اور ہیئت کا مشہور عالم تھا، یہاں وہ اپنے فن کے متعلق بہت سے نادر معلومات لے کر واپس گیا۔[1]

---

[1] طبقات الامم قاضی صاعد اندلسی ص ۵۶ بیروت، و اخبار الحکما قبطی ص ۸۵ (مصر)۔

افسوس ہے کہ اس فاضل کے حالات کا کچھ زیادہ علم نہیں اور اگر اسپین کا ایک مسلمان مؤرخ قاضی صاعد اس کا ذکر نہ کرتا تو شاید اس کا نام بھی نہ معلوم ہوتا۔

بیرونی

دوسرا فاضل مشہور حکیم و ریاضی داں خوارزم کا ابوریحان بیرونی ہے، اس فاضل کو دنیا کی مختلف قوموں کے خیالات، معتقدات اور مسائل جاننے کا خاص شوق تھا، چنانچہ اس کی تصانیف میں سے شاید ہی کوئی کتاب ایسی ہو جس سے اس کے اس ذوق کا پتہ نہ چلتا ہو، اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ وہ ہندوستان سے پہلے بھی ہندوستان اور اس کے علوم کے متعلق پہلے مصنّفین کے ذریعہ سے بہت کچھ واقف تھا، اس کے زمانہ تک عربی علوم اور مسلمانوں کی علمی تحقیقات درجہ کمال کو پہنچ گئی تھی اور جن علوم کو انہوں نے ہندوؤں، ایرانیوں اور یونانیوں سے سیکھا تھا، ان کو ترقی دے کر بہت کچھ بڑھا دیا تھا، بہت سے غلط مسئلوں کی تصحیح اور ناقص باتوں کی تکمیل کر چکے تھے، اس لیے بیرونی کو جدت پسندی کے سوا ہندوستان کے علوم کے سیکھنے کی کوئی اور وجہ نہ تھی۔

بہر حال یہ صاف نہیں معلوم ہوتا کہ وہ ہندوستان کب آیا اور یہاں کتنے دن رہا اور کہاں کہاں پھرا مگر اتنا معلوم ہے کہ سنہ ۴۰۸ ھ میں خوارزم سے غزنیں آیا تھا اور سنہ ۴۲۳ ھ میں غزنیں میں اس نے کتاب الہند ختم کی، سلطان محمود اس سے تین سال پہلے سنہ ۴۲۰ ھ میں وفات پا چکا تھا، اب اس کے ہندوستان کے قیام کا زمانہ سنہ ۴۰۸ ھ سے ۴۲۲ ھ تک معلوم ہوتا ہے، جو بارہ تیرہ برس کا زمانہ ہے، فارسی میں حکما اور فلاسفہ کی تاریخ میں ایک کتاب درۃ الاخبار ہے، جو علی بن زید بیہقی (المتوفی سنہ ۵۶۵ ھ) کی عربی کتاب تتمہ صوان الحکمۃ کا ترجمہ ہے، اس میں لکھا ہے کہ "اس نے ۴۰ برس ہندوستان میں گذارے"، اگر یہ مدت صحیح ہو[1] تو گویا ہندوستان میں اس نے پہلا قدم سنہ ۳۸۳ ھ میں رکھا جب غزنیوں کا وجود بھی نہ

---

[1] یہ کتاب اورینٹل کالم میگزین لاہور بابت فروری سنہ ۱۹۲۹ء کے ضمیمہ میں شائع ہونی شروع ہوئی ہے، اصل کتاب میں صرف "دربار" ہے مگر ایڈیٹر نے اصل کتاب تتمہ سے لے کر اس کے بعد "ہند" کا لفظ بڑھا دیا ہے۔

تھا، مگر بیرونی کی زندگی کی مختلف تاریخوں کے ملانے سے اتنا پہلے اس کا ہندوستان آنا صحیح نہیں معلوم ہوتا، گو اس کا سفر ہندوستان میں پنجاب اور سندھ سے آگے نہیں بڑھا، [۱] مگر ہندوستان کا جو جغرافیہ اس نے کتاب الہند میں لکھا ہے اس میں اس نے پورے ہندوستان کو ناپ دیا ہے اور اپنی دسری کتاب قانون مسعودی میں جو اس کے چند سال بعد اس نے لکھی ہے اس میں ہندوستان کے تمام بڑے بڑے شہروں کا طول بلد اور عرض بلد اس نے لکھا ہے۔

بہر حال وہ ہندوستان میں اس وقت داخل ہوا (جب ہندوستان کی سرزمین سلطان محمود کے حملوں سے زیروزبر ہو رہی تھی، مگر عین اسی وقت علم وفن کا دوسرا سلطان تن تنہا نہایت اطمینان اور چین سے ہندوستان کی علمی فتوحات میں مصروف تھا اور اسی سیاسی لڑائی بھڑائی اور خلفشار پر دل ہی دل میں جل رہا تھا، [۲] اس نے کتاب الہند لکھ کر جیسا کہ ڈاکٹر زخاؤ نے کہا ہے ایک طرف مسلمانوں کو یہ فخر بخشا کہ ان کے ایک فرد نے ایک ایسی کتاب لکھی جس نے یونانی سفیروں اور چینی سیاحوں کے ہندوستان کے متعلق بیانات کو تقویم پارینہ بنا دیا، دوسری طرف ہندوستان پر یہ احسان کیا کہ اس کے پرانے تمدن، پرانے علوم اور پرانے خیالات کو دنیا میں قائم اور باقی رکھا، اس وقت کے ہندوستان کے علمی غرور کے متعلق بیرونی کا یہ فقرہ یاد رکھنے کے قابل ہے، لکھتا ہے کہ ''ہندوؤں کو اپنے سوا اوروں کی واقفیت کچھ نہیں ہے، ان کو یہ پختہ یقین ہے کہ دنیا میں ان کے دیس کے سوا کوئی اور دیس نہیں اور نہ اور کوئی قوم اس دنیا میں بسنے والی ہے اور نہ ان کے سوا کسی کے پاس علم ہے، یہاں تک کہ جب ان کو خراسان اور فارس کے کسی عالم کا نام بتایا جاتا ہے تو اس بتانے والے کو جاہل و نادان سمجھتے ہیں''، پھر کہتا ہے کہ ''اگر یہ لوگ دوسری قوموں سے ملیں جلیں تو ان کا یہ خیال درست ہو سکتا ہے'' پھر کہتا ہے کہ ''اگلے ہندو پنڈت ایسے نہ تھے، وہ دوسری قوموں سے بھی فائدہ اٹھانے میں کمی نہیں کرتے تھے، چنانچہ وراہ میر کہتا ہے کہ ''یونانی اگرنا پاک اور ملیچھ ہیں

---

[۱] کتاب الہند ص ۱۱ (لندن) [۲] کتاب الہند بیرونی کا مقدمہ۔

تب بھی ان کی عزت ان کے علم کے سبب سے کرنی چاہیے''، آگے چل کر بیرونی کہتا ہے کہ ''جب تک مجھے ان کی زبان نہیں آتی تھی تو ان کے سامنے میں شاگردوں کی طرح بیٹھتا تھا لیکن جب ان کی کچھ زبان آ گئی اور میں نے ہیئت اور حساب میں ان کو مسائل اور دلائل اور تحقیقات بتانی شروع کی تو وہ حیرت میں آ گئے اور خود مجھ سے سیکھنے لگے اور تعجب سے پوچھنے لگے کہ تم کس پنڈت کے شاگرد ہو؟ پھر جب میں نے ان کی علمی حیثیت کی کمزوری دکھانی شروع کی تو وہ مجھے جادوگر یا غیب جاننے والا سمجھنے لگے اور ودیا ساگر کہنے لگے''۔[۱]

بیرونی کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان علمی سفارت کا کام انجام دیا، اس نے عربوں اور ایرانیوں کو ہندوؤں کے علوم سے اور ہندوؤں کو عربوں اور ایرانیوں کی تحقیقات سے آگاہ کیا، اس نے عربی جاننے والوں کے لیے سنسکرت سے اور سنسکرت جاننے والوں کے لیے عربی سے کتابیں ترجمہ کیں اور اس طرح وہ قرض ادا کیا جو ہندوستان کا مدت سے عربی زبان کے علوم وفنون پر چلا آ رہا تھا، اس نے ہندوستان کے متعلق تین قسم کی کتابیں لکھیں، ایک عربی سے سنسکرت میں، دوسری سنسکرت سے عربی میں اور تیسری ہندی علوم اور مسئلوں کی چھان بین اور جانچ پڑتال میں۔

اس کی وہ کتابیں جو اس نے ہندوؤں کے لیے لکھیں یہ ہیں:

۱۔ ہندوستان کے جوتشیوں کے سوالات کے جواب۔

۲۔ کشمیر کے پنڈتوں کے دس سوالوں کے جواب اور ان کے شبہوں کا حل۔

۳۔ اصطرلاب پر ایک رسالہ۔

۴۔ بطلیموس کی مجسطی کا ترجمہ۔

۵۔ اقلیدس کے مقالے۔

۶۔ ہیئت پر ایک کتاب۔

---

[۱] کتاب الہند ص ۱۲۔

اس کی دوسری قسم کی کتابیں جو عربی جاننے والوں کے لیے اس نے لکھیں یہ ہیں:

۱۔ کتاب الہند، ہندوؤں کے عقائد، علوم اور تحقیقات کا خلاصہ۔

۲۔ برہم گیت کی پانچ سی دھانت (سندھانت) کا عربی میں ترجمہ

۳۔ برہم گیت کی برہم سندھات کا ترجمہ۔

۴۔ چندر گرہن اور سورج گرہن پر ہندی تحقیقات کا ترجمہ۔

۵۔ ہندوستان کی رقم (انک) کے حساب وشمار میں۔

۶۔ حساب سکھانے میں ہندوستان کے نقوش کی کیفیت۔

۷۔ ہندی اربعہ متناسبہ (نرے راشک) کا ترجمہ۔

۸۔ سانکھیہ کا ترجمہ۔ (فلسفہ)

۹۔ پتنجلی کا ترجمہ۔

۱۰۔ وراہ میر کی کتاب لکھو جانکم کا ترجمہ (ولادت کے بیان میں)۔

۱۱۔ وسودیر کے دوبارہ دنیا میں آنے پر ایک رسالہ وغیرہ۔

تیسری قسم کی کتابیں یہ ہیں:

۱۔ سدھانت، آریہ بھٹ اور کھنڈیا کھنڈ، جو ہندی ہیئت کی کتابیں سنسکرت سے عربی میں ترجمہ ہوئی تھیں ان میں مصنفوں یا مترجموں سے جو غلطیاں ہوئیں ان کی تصحیح۔

۲۔ خاص سدھانت پر پانچ سو صفحوں کی ایک کتاب جس کا نام جوامع الموجود بخواطر الہنود ہے۔

۳۔ اس بیان میں ایک رسالہ کہ اعداد کے لکھنے کا طریقہ باعتبار ہندی کے عربی میں زیادہ صحیح ہے۔

۴۔ ہندی اصول پر جوتش کے بعض اصول کی تصحیح (فی الرشاد الی تصحیح المبادی علی النمو دارات) قانون مسعودی کے پانچویں مقالہ میں بیرونی نے ہندوستان کے حسب ذیل

شہروں کا طول بلد اور عرض بلد بتایا ہے، لوہاور (لاہور) ارستان (ارستیان) جو کشمیر کا پایہ تخت تھا، نیپال (کہتا ہے کہ یہ ہندوستان اور تبت کے بیچ میں ایک کمین گاہ ہے) ریہند (وادی سندھ میں ہندوستان کا خاص شہر تھا) سیالکوٹ، ملتان، تیز (بلوچستان کا بندر) سومنات (سومناتھ) نہلوالہ (نہروالہ) کھمبایت، وہار (مالوہ) اوزین (اجین)، بھروچ وسط ہندوستان میں کانجر، ماتورہ (متھرا) قنوج (کہتا ہے کہ قنوج کی سلطنت ملک کے بیچ کا حصہ ہے اور بڑے بڑے راجاؤں کی راجدھانی رہا ہے، گنگا کے پچھم ہے) ماری (یہ سلطنت قنوج کی موجودہ راجدھانی ہے) گوالیار کا قلعہ، لوبرانی دیبل (سندھ کا بندر) کجوراہہ اجودھہ (اجودھیا) بانارس (بنارس، کہتا ہے کہ یہ مقدس شہر ہے اور وہیں آج ہندوؤں کے علوم ہیں) جزیرہ لنکا، جمکوٹ، تنجاور، سنگلدیپ، منکری (مہانگری؟)۔

ہندوستان میں بیرونی نے ایک اور عظیم الشان کارنامہ انجام دیا ہے، یعنی زمین کا دور ناپنا، عربوں میں زمین کے دور کی پیمایش مامون الرشید نے تیسری صدی ہجری کے شروع میں کرائی تھی، جس پر اب دوسو برس گذر چکے تھے، بیرونی کو اس کی تحقیق کا بڑا شوق تھا، ایسے موقع کا میدان اس کو خوارزم یا افغانستان میں نہیں ملا، ہندوستان میں اس کو اتفاق سے ایسا میدان مل گیا، جس کے ایک طرف پہاڑ بھی تھا، چنانچہ اس نے اسی میدان میں اپنے ہندسی قاعدہ کے مطابق زمین کے دور کی پیمایش کی۔[۱]

علم ہئیت اور فلکیات کے متعلق ہندوستان اور سنسکرت کا پورا قرض مسلمانوں نے اکبر اور محمد شاہ کے زمانہ میں ادا کیا، اکبر نے زیج الغ بیگی کا جو اسلامی فلکی تحقیقات اور تیموری رصد خانہ واقع مرافہ کے تازہ مشاہدات کا مجموعہ تھا، سنسکرت میں ترجمہ کرایا[۲] اور محمد شاہ کے زمانہ میں راجہ جے سنگھ نے جب دہلی بنارس اور جے پور میں رصد خانے قائم کرائے تو عربی کی اونچی علم ہیئت کی کتابیں سنسکرت میں ترجمہ کرائی۔[۳]

---

[۱] قانون مسعودی، اس کا علمی نسخہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے کتب خانہ میں نظر سے گذرا۔ [۲] آئین اکبری۔
[۳] سبحۃ المرجان فی تاریخ ہندوستان آرنلڈ بلگرامی۔

سنجیدہ کھیل

علم اور فن کے ٹھوس اصطلاحات اور مضامین پر بحث سنتے سنتے شاید حاضرین کی طبیعتیں گھبرا گئی ہوں، اس لیے خاتمہ میں کھیل کی بساط بچھاتا ہوں کہ آخر میں تھوڑی دیر کہنے والے اور سننے والے دونوں کے لیے تفریح رہے، دنیا کے دو کھیل مشہور ہیں یعنی شطرنج اور چوسر (نرد) دونوں ہی ہندوستان کے دماغ کی ایجاد ہیں، عرب مصنفوں میں سب سے بہتر اس مضمون پر یعقوبی نے لکھا ہے، اس نے بتایا ہے کہ یہ محض کھیل نہیں ہیں بلکہ حساب اور ہیئت کے نازک مسئلوں پر اس کی بنیاد ہے، پھر اس نے ان مسئلوں کی تشریح کی ہے کہ یہ بساط درحقیقت انقلاب روزگار کا نقشہ ہے، اس کے خانے آسمانی بروج ۳۶۰ دن، ہر دن کے ۲۴ گھنٹے، ۱۲ گھنٹوں کا دن، اور ۱۲ گھنٹوں کی رات کا پورا نقشہ چوسر کی بساط چوسر کے نشانات اور چوسر کے کھیل میں ہے اور شطرنج کی بنیاد کل ۶۴ خانوں، پھر ۳۲، پھر ۱۶، پھر ۸، پھر ۴ پر ہے، لیکن ان حسابی داؤں پیچوں کے علاوہ اس نکتہ پر بہت کم غور کیا گیا ہے کہ یہ دونوں کھیل ہندوستان کے دو مذہبی یا فلسفیانہ مسلکوں یا اسکولوں کی تشریح ہیں، چوسر اس ثبوت میں ہے کہ انسان محض مجبور ہے اور آسمان اور ستاروں کی گردشیں جو کچھ چاہتی ہیں وہ اس سے کراتی ہیں، دنیا کے میدان میں کوئی قدم خود اس کے ارادہ اور نیت سے نہیں اٹھتا، بلکہ کوئی اور ہے جو اس سے جبراً یہ قدم اٹھواتا ہے،

ع دو دست دیگرے است سپید و سیاہ ما

اس کے برخلاف شطرنج اس بات کا ثبوت ہے کہ دنیا میں جو کچھ ہے وہ انسان کی ذاتی کوششوں کا نتیجہ ہے، اس کی ہار جیت اور کامیابی یا ناکامی اسی کے دل و دماغ سمجھ بوجھ اور دوڑ دھوپ پر ہے، الغرض یہ دونوں کھیل دنیا کے ناقابل فیصل مسائل کے عملی فیصلے ہیں، یعقوبی نے لکھا ہے کہ پہلے ایک پنڈت نے چوسر بنا کر ایک راجہ کے نذر کیا تھا اور اس میں جبر کے مسئلہ کی اس کو تلقین کی تھی، اس کے بعد دوسرے پنڈت نے شطرنج بنا کر پیش کی، جس

میں اختیار کے مسئلہ کا ثبوت ہے، الغرض ان دونوں کھیلوں نے ثابت کر دیا کہ جس طرح انسان اپنی سنجیدہ منطق اور فلسفیانہ دلیلوں سے جبر و اختیار کے مسئلہ کو حل نہیں کر سکا ہے اسی طرح عملی کھیلوں کی دلیلوں سے بھی وہ قدرت کے اس کھیل کا پتہ نہیں پا سکتا۔

شطرنج کے موجد نے راجہ بارانی (دوروایتیں ہیں) سے جو انعام مانگا تھا وہ بھی حیرت انگیز حسابی کھیل ہے، موجد نے انعام یہ مانگا کہ شطرنج کے پہلے خانہ میں ایک گیہوں کا دانہ رکھا جائے، پھر ہر خانہ میں پہلے خانہ سے دو چند کیا جائے، یہاں تک کہ سب خانے پورے ہو جائیں، بظاہر راجہ نے اس کو بہت معمولی انعام سمجھا مگر جب اس کا حساب لگایا گیا تو اتنی بڑی رقم ہوگئی کہ اس کا عطا کرنا راجہ کے بس میں نہ تھا، یعقوبی اور مسعودی نے اس کا پورا حساب لگا کر بتایا ہے [۱] مگر اس کو یہاں نقل کرنا پھر کھیل کی بساط کو حساب و ریاضی کی درسگاہ بنا دیتا ہے۔

یہ دونوں کھیل پہلی ہی صدی ہجری میں ایران سے عرب پہنچ چکے تھے اور ان سب میں نرد یعنی چوسر بہت پہلے پہنچ چکا تھا، کیوں کہ اس کا ذکر احادیث میں موجود ہے اور شطرنج اس کے بعد دوسری صدی میں غالباً عباسی دور میں عرب تک پہنچی ہے۔ کیوں کہ اس کے متعلق دوسری صدی کے مجتہدین اسلام کی رائیں موجود ہیں۔ لفظ شطرنج کی نسبت اہل ایران کا دعویٰ ہے کہ یہ ان کی ملکیت ہے اور اس کی اصل ''ہشت رنج'' ہے [۲] کہ اس میں ۸ خانے ہوتے ہیں مگر یہ ایرانیوں کی کھلی زبردستی ہے، شطرنج نام بھی ہندوستان کا مقبوضہ ہے، اس کی اصل ''چترنگ'' [۳] (چار عضو والا) ہے پھر گو اس کے سب مہروں پر شاہ (بادشاہ) فرزین (وزیر) پیادہ کہہ کر ایرانیوں نے قبضہ کر لیا ہے مگر دو چیزیں ایسی باقی ہیں جو ہندوستان کی ملکیت کی ناقابل نسخ دستاویز ہیں اور وہ ہاتھی اور رخ ہیں ہاتھی تو خیر ہندوستان

---

[۱] یہ پورا حال یعقوبی ج ۱ ص ۹۹۔۱۰۵ میں ہے، نیز دیکھو مسعودی ج ۱ ص ۱۶۰ (لندن) [۲] یعقوبی جلد اول ص ۱۰۱ (لندن) [۳] سوار السبیل فی معرفۃ الموادد الدخیل پروفیسر (اب ڈاکٹر) آرنلڈ۔

کی نشانی ہی ہے مگر رخ نام سواری بھی جس کی ہندی رتھ ہے ہندوستان سے باہر نہیں مل سکتی، اہل تحقیق کا بیان ہے کہ چترنگ کھیل کا ذکر رامائن وغیرہ میں موجود ہے [۱] ایرانیوں کے علاوہ یونانیوں، رومیوں، مصریوں یا بنیوں غرض دوسری پرانی قوموں نے بھی اس کی ملکیت کا دعویٰ کیا مگر تحقیق کی عدالت میں ہندوستان کے سوا اور کسی کا دعویٰ مسلم نہ ہو سکا [۲] اس کے ساتھ یہ نکتہ بھی فراموش نہ کرو کہ خواہ ایران میں اس کا نام پہلے ''ہشت رنج'' ہو یا ہندوستان میں ''چترنگ'' ہو مگر عربوں نے اپنی زبان میں انہیں حرفوں کو الٹ پھیر کر جو نام رکھا وہی آج اس کا نام ایران میں بھی ہے اور ہندوستان میں بھی یعنی شطرنج۔

www.KitaboSunnat.com

---

[۱] دیکھو برٹش انسائکلو پیڈیا جلد ۶ ص ۱۰۰ لفظ چس (Chess)۔ [۲] ایضاً

چوتھا باب

مذہبی تعلقات

ماخذ

اس مضمون کے معلومات کا ماخذ ان کتابوں کے علاوہ جن کا ذکر اوپر گذر چکا چار اور نئے ہیں۔

(۱) ہندوستانی مذاہب کی وہ روداد جو دوسری صدی ہجری میں یحییٰ بن خالد برمکی نے تیار کرائی تھی، جس کا خلاصہ ابن ندیم نے کتاب الفہرست میں شامل کرلیا ہے، یہی خلاصہ اس وقت دنیا میں موجود ہے۔

(۲) بیت المقدس کے ایک فاضل عرب فلسفی ومتکلم ومؤرخ مطہر بن طاہر مقدسی (سنہ ۳۳۵ھ) کی یادگار تصنیف کتاب البدء والتاریخ جو سنہ ۱۸۹۹ء میں پیرس سے چھ جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔ اس میں ایک باب ہندوستان کے مذاہب کا بھی ہے۔

(۳) تیسری چیز ابوالعباس ایران شہری کی کتاب الدیانات ہے جس کی اصل گو موجود نہیں مگر اس کے اقتباسات بیرونی کی کتاب الہند میں ہیں، اس میں زیادہ تر بودھوں کے حالات تھے۔

(۴) اس کے بعد سب سے اہم عبدالکریم شہرستانی کی (سنہ ۴۶۹ و ۵۴۹ھ) ملل ونحل ہے، جو کئی دفعہ یورپ مصر اور بمبئی میں چھپ چکی ہے۔

متفرق مضامین عبدالقاہر بغدادی سنہ ۴۲۹ھ (سنہ ۱۰۳۷ء) الفرق بین الفرق (اسلامی فرقوں کی تاریخ) مطبوعہ مصر اور مرتضیٰ زیدی کی اس کتاب المعتزلہ سے لیے گئے ہیں جس کو پروفیسر آرنلڈ نے حیدرآباد کے دائرۃ المعارف میں چھپوالیا تھا۔

عرب اور ترک و افغان اور مغل فاتحوں میں فرق

اس سے پہلے کہ ہم آگے بڑھیں ایک نکتہ کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے چوں کہ ہندوستان میں جو ترک و افغان و مغل فاتح آئے وہ مسلمان تھے، اس لیے ان کی تمام کارروائیوں کا ذمہ دار اسلام سمجھا جاتا ہے، حالاں کہ اس حقیقت سے ہم سب کو واقف ہونا چاہیے تھا کہ ترک فاتح جو ہندوستان آئے خاص خاص افسروں یا عہدہ داروں کو چھوڑ کر قوم کی مجموعی حیثیت سے وہ اسلام کے نمائندے نہ تھے اور نہ ان کے اصول سلطنت کو اسلام کی طرز حکومت اور اصول فرمانروائی سے کوئی مناسبت تھی ان کے ترک افسر زیادہ تر نومسلم غلام تھے جن کو اسلام کی صلح و جنگ کے قوانین سے شاید واقفیت بھی نہ تھی۔

غزنویہ سلطنت جس ملک میں آکر قائم ہوئی وہ اسلامی حدود سلطنت کا سب سے آخری گوشہ تھا۔ وہاں اسلام نے ابھی پورا قدم بھی نہیں جمایا تھا، سلطان محمود کی فوج میں جو سپاہی بھرتی ہو کر آئے وہ غزنی خلجی ترکوں اور افغانوں کے مختلف قبائل تھے، ہندو بھی اس کی فوج میں داخل تھے [۱] ترک قبائل کا یہ حال تھا کہ وہ بیشتر مسلمان نہ تھے، وہ غلاموں کی حیثیت سے ہزارہا کی تعداد میں فروخت ہوتے تھے اور سلاطین اور امراء ان کو خرید کر اور مسلمان بنا کر فوج میں بھرتی کرتے تھے یا وہ خود لوٹ مار کے شوق میں وسط ایشیا سے نکل کر اسلامی ممالک میں آتے تھے اور مسلمان ہو کر مختلف بادشاہوں اور امیروں کی فوج میں بھرتی ہوتے تھے اور آگے چل کر بڑے بڑے افسر ہو جاتے تھے، یہاں تک کہ بادشاہ بن جاتے تھے، الپ تگین اور سبکتگین جو اس غزنوی سلطنت کے بانی تھے اسی قسم کے ترک غلام تھے، سلطان غوری کے جانشین ایلتمش وغیرہ بھی ایسے ہی تھے، سلجوقی ترک جو چند برسوں کے بعد عظیم الشان سلجوقی سلطنت کے بانی ہوئے، اسی زمانے میں اسلامی ملک میں آکر مسلمان

---

[۱] کامل ابن اثیر ج ۹ ص ۱۳۵ بریل (لیڈن) سنہ ۱۸۶۲ء۔

ہوئے، یہی حال سلطان محمود کی فوج کا بھی تھا، ترکستان اور ماوراء النہر ترک رضا کار[۱] اس کی فوج میں داخل ہو گئے تھے جو زیادہ تر[۲] اسی زمانے میں مسلمان ہوئے تھے۔

مغل ابھی تک مسلمان ہی نہیں ہوئے تھے، وہ ساتویں صدی ہجری تک کافر سمجھے جاتے تھے، علاء الدین خلجی (المتوفی سنہ ۷۱۶ھ) تک فوج میں مغل مسلمان کر کے نوکر رکھے جاتے تھے، چنانچہ علاء الدین خلجی کے حکم سے دہلی میں بیک وقت چودہ پندرہ ہزار نومسلم مغل سپاہی قتل کیے گئے[۳]۔

افغانوں کے بڑے بڑے شہروں میں گو اسلام تھا مگر خود افغان اب تک مسلمان نہ تھے، کافر ہی سمجھے جاتے تھے[۴] گو خاص کابل کے بادشاہ نے تیسری صدی کے شروع میں یعنی غزنویوں سے سو برس پہلے اسلام کا اظہار کیا تھا[۵] لیکن افغانوں کے اکثر قبائل محمود غزنوی ہی کے زمانے میں مسلمان ہونے شروع ہوئے تھے۔[۶]

ان کے علاوہ غوری قبائل چوتھی صدی کے وسط تک یعنی غزنویوں کی پیدائش کے بعد تک مسلمان نہیں ہوئے تھے[۷]، پھر سلطان محمود سے پہلے اس وقت تک ان اطراف میں نہ اسلامی درسگاہیں تھیں نہ اسلامی تعلیمات کا رواج ہوا تھا، اور نہ مسلمان علما پھیلے تھے، ان اسباب سے ان قوموں کے اس وقت کے طور طریق اصول جنگ اور طرز عمل کو اسلام نہیں کہا جا سکتا۔

برخلاف اس کے وہ عرب فاتح جو ایک صدی کے اندر اندر ایک طرف شام کی سرحد عبور کر کے مصر اور شمالی افریقہ کے راستے سے اسپین تک پہنچ چکے تھے اور دوسری طرف

---

[۱] تاریخ فرشتہ ج ۱ ص ۲۹ و ۳۲ نولکشور۔ [۲] ایضاً ص ۲۴ [۳] فرشتہ جلد اول ص ۱۲۰ نولکشور۔ [۴] کامل ابن اثیر جلد ۹ ص ۲۱۸۔ [۵] فتوح البلدان بلاذری ص ۴۰۲۔ (لیڈن)۔ [۶] کامل ابن اثیر جلد ۹ ص ۲۱۸ (لیڈن) [۷] سفرنامہ ابن حوقل ص ۳۶۳ و کامل ابن اثیر جلد ۹ ص ۱۵۶ (لیڈن) و تاریخ بیہقی مطبوعہ کلکتہ ص ۱۲۷۔

عراق کے راستے سے خراسان تک و ایران و ترکستان کو طے کر کے ایک سمت میں کاشغر اور دوسری سمت میں سندھ تک فتح کر چکے تھے، وہ لوگ تھے جن میں اسلام کی تعلیمات زندہ تھیں، اسلام کا قانون جنگ عمل میں تھا، کہیں کہیں افسروں میں بعض ایسے بزرگوار بھی تھے، جنہوں نے پیغمبر اسلام کی صحبت اٹھائی تھی اور ایسے تو بکثرت تھے جنہوں نے صحابہ کا فیض پایا تھا، اس لیے ان کے طور طریق اصول حکومت اور طرز سلطنت خیبر سے آنے والی قوموں سے بالکل مختلف تھے۔

سنہ ۹۳ء میں قتیبہ نے سمرقند فتح کیا، اس زمانے میں ان اطراف کے رہنے والے بدھ مت کے پیرو تھے، قتیبہ نے کسی وجہ سے (شاید مالی دقت سے) مجبور ہو کر ان کے بتوں کو جلا کر ان سے سونا چاندی کا تھوک نکالنا ضروری سمجھا، تو یہ نہیں کیا کہ ان کو زبردستی توڑ کر جلا دیا ہو بلکہ صفائی کے ساتھ خود صلح کے شرائط میں اس نے یہ ایک دفعہ طے کرالی تھی کہ یہ بت مسلمانوں کے قبضہ تصرف میں آئیں گے، چنانچہ فریق ثانی نے اس کو منظور کیا لیکن جب جلانے کا وقت آیا تو ترک بادشاہ نے کہا کہ آپ کا میں احسان مند ہوں اس لئے میں آپ کو متنبہ کرتا ہوں کہ آپ ان کو نہ جلائیں، کیوں کہ ان میں بعض ایسے بت ہیں کہ یہ جلائے گئے تو آپ کی تباہی یقینی ہے، قتیبہ نے کہا، اگر ایسا ہے تو میں خود اپنے ہاتھ سے ان کو جلاؤں گا، چنانچہ خود اپنے ہاتھ سے ان میں آگ لگائی، لیکن جب اس کا کوئی برا نتیجہ ظاہر نہ ہوا تو بہت سے ترک بت پرستی سے بدعقیدہ ہو کر مسلمان ہو گئے۔[1]

عربوں نے خلفائے راشدین اور صحابہ کرام کے زمانہ میں دوران جنگ کے اتفاقی واقعات کو چھوڑ جن قوموں سے معاہدہ کیا یا صلح کی ان کی عبادت گاہوں کو ٹھیس بھی لگنے نہ دی ایران کے آتشکدے ویسے ہی روشن رہے، فلسطین و شام اور مصر و عراق کے گرجے جو بتوں

---

[1] یہ مفصل واقعہ تاریخ طبری جلد ۸ ص ۱۲۴۶ (لیڈن) اور کامل ابن اثیر جلد ۴ ص ۴۰۴ (لیڈن) میں ہے اور اخیر ٹکڑا فتوح البلدان بلاذری (لیڈن) ص ۴۲۱ میں ہے۔

اور مجسموں سے پٹے پڑے تھے، ویسے ہی ناقوسوں کی آوازوں سے گونجتے رہے، حالاں کہ یہ نو مسلم ترک فاتح ان سے زیادہ دین و مذہب کے پرجوش غازی اور شریعت کے سچے پیروکار نہ تھے اور نہ ہو سکتے تھے۔

عرب اگر غیر مسلموں سے جزیہ لیتے تھے تو اس کے علاوہ کوئی اور محصول پیداوار کے خراج کے سوا ان سے نہیں وصول کرتے تھے، لیکن ترک، افغان اور مغل دین داری کے جزیہ میں آکر غیر مسلم رعایا سے جزیہ وصول کرتے تھے وہ اس کے ساتھ اس سے دہ چند دوسرے محصول اور ٹیکس اپنی مسلمان اور غیر مسلمان رعایا سے لیتے تھے، لیکن اسلام کے اصول سلطنت میں جس کو عربوں نے قایم رکھا، اور جس پر وہ مدت تک عمل پیرا رہے صرف دو ہی قسم کے محصول تھے، مسلمانوں سے زکوٰۃ اور عشر (پیداوار کا دسواں) اور غیر مسلمانوں سے جزیہ اور خراج۔

اصول یہ ہے کہ اسلام نے دنیا کی تمام قوموں کو چار حصوں میں تقسیم کیا تھا، (۱) مسلمان (۲) اہل کتاب (یعنی وہ قومیں جو کسی ایسی آسمانی تعلیم کی پیرو ہیں جس کا ذکر قرآن میں ہے) (۳) مشابہ اہل کتاب (یعنی وہ قومیں جو کسی آسمانی تعلیم کی پیرو کی مدعی تو ہیں مگر قرآن میں ان کا نام نہیں آیا ہے، اس لئے ان کے اہل کتاب ہونے کا یقین نہیں مگر گمان ضرور ہے) اور (۴) کفار یہ وہ قومیں ہیں جو کسی آسمانی تعلیم کی پیرو نہیں، اسلام نے اپنی اسلامی حکومت میں مسلمانوں کا درجہ قومیت و وطنیت کے امتیاز کے بغیر تمام حقوق میں یکساں قرار دیا ہے، اہل کتاب کے لئے یہ ہے کہ جزیہ ادا کرنے کے بعد وہ تمام حقوق میں مسلمانوں کے برابر ہیں، ان کا ذبح کیا ہوا جانور کھایا جا سکتا ہے، ان کی لڑکیوں سے مسلمان نکاح کر سکتے ہیں، ان کے جان و مال و مذہب اور عبادت گاہوں کی حفاظت کی سلطنت ذمہ دار ہے، مشابہ اہل کتاب بھی سوا اس کے کہ مسلمان ان کا ذبیحہ نہ کھائیں گے، اور نہ ہی ان کی لڑکیوں سے نکاح کر سکتے ہیں، اور تمام ملکی حقوق میں وہ اہل کتاب بلکہ خود مسلمانوں کے

برابر ہیں، اس بنا پر جب کسی غیر قوم میں اسلام کی سلطنت قایم ہو تو سب سے پہلا فرض یہ ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ وہ قوم ان چار قسموں میں سے کس قسم کے اندر ہے، مگر افسوس ہے کہ اس کا فیصلہ خیبر والی قومیں اخیر تک نہ کر سکیں، ایک طرف تو ان کو ہندوؤں سے جزیہ لینے میں اصرار تھا جو صرف اہل کتاب اور مشابہ اہل کتاب سے قبول کیا جا سکتا ہے، اور دوسری طرف ان کے معبودوں اور ان کے مراسم کی حفاظت کا وعدہ نہیں کیا جاتا جو جزیہ لینے کے بعد ضروری ہے، انتہا یہ ہے کہ مسلمان علاء الدین خلجی (سنہ ۶۹۶ ھ) تک یہ فیصلہ نہ ہو سکا تھا کہ ہندوؤں کا شمار کس طبقہ میں ہے [1] اور یہ ساری ابتری اسی ذو عملی کا نتیجہ تھی لیکن عربوں نے سندھ میں قدم رکھنے کے ساتھ ایک مدت بھی اس کے فیصلہ میں توقف نہیں کیا کہ ان اقسام میں سے ہندوؤں کا مرتبہ اسلامی حکومت میں کیا ہے؟

عرب فاتحوں کے نزدیک ہندو مشابہ اہل کتاب تھے

سندھ کو فتح کرتے ہوئے جب عرب سپہ سالار محمد بن قاسم سندھ کے مشہور شہر الرور (الور) پہنچا تو شہر والوں نے کئی مہینہ تک حملہ آوروں کا پرزور مقابلہ کیا، پھر صلح کی، اور اس میں دو شرطیں پیش کیں، اول یہ کہ ''شہر کا کوئی آدمی قتل نہ کیا جائے، دوسرے یہ کہ ان کے بت خانوں سے کوئی تعرض نہ کیا'' محمد بن قاسم نے جس وقت ان شرطوں کو قبول کیا تو یہ الفاظ کہے:-

ماالبد الا ککنائس النصاری والیهود و بیوت نیران المجوس

(بلاذری ص ۴۳۹)

(ترجمہ) ہندوستان کا بت خانہ بھی عیسائیوں اور یہودیوں کی

---

[1] تاریخ فیروز شاہی ضیاے برنی ص ۲۹۰ و ۲۹۱ (کلکتہ) و تاریخ فرشتہ ص ۱۱۰ (نولکشور)

عبادت گاہوں اور مجوس کے آتشکدوں ہی کی طرح ہے۔

سندھ کی سب سے قدیم عربی تاریخ کے فارسی ترجمہ چچ نامہ میں یہ واقعہ اس طرح، مذکور ہے:

''محمد بن قاسم نے برہمن آباد (سندھ) کے لوگوں کی درخواست قبول کی اور ان کو اجازت دی کہ سندھ کی اس اسلامی سلطنت میں اسی حیثیت میں رہیں جس حیثیت میں عراق اور شام کے یہودی عیسائی اور پارسی رہتے ہیں''۔[1]

ایک عرب فاتح کی زبان کی یہ وہ اہم تصریح ہے کہ اس نے ہندوؤں کو وہی حیثیت دی جو بظن غالب کسی آسمانی تعلیم کے پیروں کی اسلامی قانون میں ہے اور ان کے بت خانوں کو بھی وہی درجہ دیا جو اہل کتاب یا مشابہ اہل کتاب کے معبدوں اور عبادت گاہوں کا اسلام میں ہے، سندھ کے فتوحات کی تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ عرب فاتحوں نے اپنے شرائط کا پوری طرح لحاظ رکھا، ایک بودھ مت کے پیرو نے ایک موقعہ پر ایک ہندو راجہ کو مشورہ دیا:

''ہم کو اچھی طرح معلوم ہے کہ محمد قاسم کے پاس حجاج کا فرمان ہے کہ جو امان چاہے اس کو امان دو، اس لئے ہم کو یقین ہے کہ آپ اس کو مناسب سمجھیں گے کہ ہم اس سے صلح کر لیں کیوں کہ عرب ایماندار اور اپنے معاہدوں کے پابند ہیں''[2]

دیبل سندھ کا پہلا مقام جہاں عربوں نے حملہ کیا وہاں سب سے بلند عمارت بودھوں کا بت خانہ تھا، محمد قاسم نے قلعہ والوں کو شہر کا دروازہ کھولنے پر مجبور کرنے کے لئے بت خانہ کے بلند مینارہ پر جو سب سے اونچا اور باہر سے نظر آتا تھا توپ کا گولہ پھینکا، لیکن

---

[1] چچ نامہ تاریخ الیٹ، جلد اول ص ۱۸۶ [2] ایضاً ص ۱۵۹۔

جب شہر کا پھاٹک کھل گیا تو اس بت خانہ کو برباد نہیں کیا، چنانچہ بودھوں کے فنا ہو جانے کے بعد بھی تیسری صدی ہجری تک یہ عمارت موجود تھی، خلیفہ معتصم (سنہ ۲۱۸۔۲۲۷ھ) کے زمانہ میں اس کا ایک حصہ جیل خانے کے کام میں لایا گیا [۱] محمد قاسم نے خود اس شہر میں اپنی مسجد الگ بنائی [۲] اسی طرح جب نیروں فتح کیا گیا تو مندر کے سامنے اپنی مسجد الگ قائم کی [۳]

ملتان کا بت خانہ: اسی طرح ملتان کا عظیم الشان بت خانہ شہر کے فتح ہونے کے بعد بھی صحیح و سالم رہا بلکہ عربوں کی تین سو برس کی حکومت میں بھی وہ بعینہ قائم رہا اور تین صدیوں تک برابر وہ عرب سیاحوں کی دلچسپیوں کا مرکز رہا، اخیر شخص جس نے اس کا حال بیان کیا ہے (بشاری) وہ سنہ ۳۷۵ھ کے قریب میں اس کو دیکھا گیا ہے، اہل عرب نے اس بت خانہ کے وجود سے سیاسی اور مالی دونوں فائدے اٹھائے، سیاسی یہ کہ جب کوئی راجہ ملتان پر حملہ کی تیاری کرتا تو عرب امیر اس کو یہ کہہ کر ڈرا دیتا کہ اگر تم نے ادھر کا قصد کیا تو ہم اس مندر کو خاک میں ملا دیں گے، یہ سن کر حملہ آور رک جاتے اور مالی فائدہ یہ اٹھایا کہ تمام ہندوستان سے لوگ اس مندر کے جاترے کو آتے تھے اور وہاں جا کر نذر پیش کیا کرتے تھے، عرب امیر اس رقم کو خزانہ میں داخل کرتے تھے اور اسی سے اس مندر کے مصارف اور یہاں کے پجاریوں کی تنخواہیں ادا کرتے تھے [۴]

عرب سیاحوں نے ملتان کے اس بت خانہ کی پوری کیفیت بیان کی ہے، اس مندر میں افراط سے سونا چاندی تھی، دو دو سو اشرفیوں کا عود یہاں جلانے کو بھیجتے تھے، جن کو پجاری عرب تاجروں کے ہاتھ بیچ ڈالتے تھے [۵] یہ مجسمہ خود بھی اتنا ہی قیمتی تھا، اس کی دونوں آنکھوں کی جگہ پر بیش قیمت پتھر جڑے تھے، سر پر سونے کا تاج تھا، [۶] الغرض سنہ ۳۷۵ھ کے قریب تک بت خانہ عرب امیروں کے زیر حکومت قائم و باقی بلکہ پوری رونق پر

---

[۱] بلاذری ص ۴۳۷ [۲] ایضاً [۳] چچ نامہ الیٹ اول ص ۱۵۸ [۴] معجم البلدان یاقوت بحوالہ اصطخری جلد ۸ ص ۲۰۱ (مصر) [۵] سفرنامہ ابوزید سیرافی ص ۱۲۰ [۶] سفرنامہ بشاری مقدسی معروف بہ احسن التقاسیم ص ۴۸۳ (لیڈن)

تھا، مگر جب ابوریحان بیرونی سنہ ۴۰۰ھ کے بعد یہاں آیا ہے تو اس نے اس کو بت خانہ کے بجائے جامع مسجد پایا، اس تغیر کی وجہ اس نے یہ لکھی ہے:-

''محمد بن قاسم نے جب ملتان فتح کیا تو اس کی آبادی اور دولت مندی کا سبب اسی بت خانہ کو پایا، تو اس نے اس کو اپنی حالت پر چھوڑ دیا اور اس کے گلے میں گائے کی ہڈی [1] باندھ کر یہ ثابت کیا کہ وہ اس کو کسی عقیدت کی وجہ سے نہیں چھوڑ رہا ہے اور اس نے مسلمانوں کے لئے جامع مسجد الگ بنائی، پھر جب ملتان پر قرمطی لوگ (شیعہ مسلمانوں کا ایک گمراہ فرقہ) حکمراں ہو گئے تو جلم بن شیبان نے اس بت خانہ کو توڑ دیا اور پجاریوں کو قتل کر دیا، اس کی عمارت کو جو اینٹ کی تھی اور اونچی جگہ پر تھی، جامع مسجد بنا دیا اور پہلی (محمد بن قاسم والی) جامع مسجد میں قفل لگا دیا کہ وہ بنی امیہ کی یادگار تھی اور ان سے ان کو دشمنی تھی، پھر جب سلطان محمود نے ملتان فتح کر کے قرمطیوں کو مٹا دیا تو جامع مسجد کو بند کر کے پھر (محمد بن قاسم والی) اصلی جامع مسجد کھلوا دی اور اب وہ بت خانہ کی جگہ صرف میدان ہے'' [2]

اسی سلسلے میں بلاذری نے جو تیسری صدی کے اخیر میں تھا، یہ عجیب بات لکھی ہے کہ لوگ اس بت کو حضرت ایوب کا مجسمہ گمان کرتے تھے، (صفحہ ۴۴۴):-

حقوق اور اعزاز: سندھ کے فتح ہونے کے بعد برہمنوں کا ایک وفد محمد قاسم کے پاس آیا، محمد قاسم نے اس کی عزت کی برہمنوں نے اس کے سامنے اپنا یہ مطالبہ پیش کیا کہ ہندو دستور کے مطابق ہمارا قومی درجہ دوسری ذاتوں سے اونچا رکھا جائے، محمد قاسم نے تحقیق کے بعد ان کے اس مطالبہ کو منظور کیا اور ان کو تمام عہدوں پر سرفراز کیا، برہمنوں نے اس کا خاص شکریہ

---

[1] یہ واقعہ فتوحات سندھ کی کتابوں میں کہیں مذکور نہیں، معلوم نہیں بیرونی نے کہاں سے لیا۔

[2] کتاب الہند، بیرونی ص ۵۶۔

ادا کیا اور گاؤں گاؤں پھر کر اپنے حاکموں کے گن گائے اور جوان کو حقوق ملے تھے اس کی ہر جگہ جا کر تعریفیں کیں۔[۱]

جزیہ: عرب امیر نے تمام اعلان کرا دیا کہ جو چاہے مسلمان ہو کر ہمارا بھائی بن جائے اور جو چاہے جزیہ دے کر اپنے مذہب پر قائم رہے، چنانچہ بعضوں نے اسلام قبول کر لیا اور بعض اپنے پرانے مذہب پر قائم رہے۔

چچ نامہ میں ہے:-

''ان میں جو مسلمان ہو گئے تھے، وہ غلامی اور جزیہ وغیرہ سے آزاد رہے اور جو اپنے مذہب پر قائم رہے ان کے تین درجے قائم کیے گئے، اعلیٰ طبقہ یعنی دولت مندوں سے ۴۸ درم، متوسط لوگوں سے ۲۴ درم اور نیچے طبقہ سے ۱۲ درم لیے گئے، جن لوگوں نے اسلام قبول کر لیا وہ اس سے معاف کیے گئے اور جو لوگ اپنے آبائی مذہب پر قائم رہے انہوں نے جزیہ دیا، لیکن ان کی زمینیں اور جائدادیں ان سے نہیں لی گئیں بلکہ علی حالہا انہیں کے قبضہ میں رہنے دی گئیں۔[۲]

موجودہ حساب سے ایک درم زیادہ سے زیادہ ساڑھے تین آنہ کے برابر ہے، اس لحاظ سے یہ محصول دولت مندوں سے دس روپئے، متوسطوں سے پانچ روپیے اور غریبوں سے ڈھائی روپیے سالانہ کے حساب سے وصول ہوا ہوگا اور حسب قاعدہ عورتیں، بچے، بوڑھے، مذہبی عہدے دار اور پجاری اور معذور لوگ جو کماتے نہیں، اس سے مستثنیٰ رہے ہوں گے اور مسلمانوں سے جزیہ کے بجائے ڈھائی روپیہ سیکڑہ زکوٰۃ اور زمین کی پیداوار میں، مسلمانوں سے دسواں حصہ اور غیر مسلمان سے مقررہ خراج وصول کیا گیا ہوگا، اس کے علاوہ اہل عرب سلطنت میں کوئی اور ٹیکس نہ تھا۔

---

[۱] چچ نامہ الیٹ ص ۱۸۲-۱۸۴ [۲] ایضاً ص ۱۸۲

ہندو اور مسجد: عربوں کی اس رواداری کا اثر ہندوؤں پر بہت اچھا پڑا، چنانچہ دوسری صدی ہجری میں ایک مقام پر سے جب عربوں کی حکومت اٹھ گئی اور ہندو قابض ہو گئے تو انہوں نے مسلمانوں کی مسجد کو ہاتھ نہیں لگایا، مسلمان اس میں برابر نماز پڑھتے جمعہ ادا کرتے اور جمعہ میں بدستور اپنے خلیفہ کا نام لیتے رہے۔[1]

اس کے علاوہ چوتھی صدی ہجری کے عرب سیاح اصطخری اور ابن حوقل بیان کرتے ہیں کہ کھنبایت سے چیمور تک کے علاقے گو مختلف راجاؤں کی عملداری میں ہیں مگر ہر شہر میں ہر جگہ مسلمان آباد ہیں اور ان کی مسجدیں ہیں جہاں مسلمان باجماعت نماز پڑھتے ہیں، ہندو راجاؤں کے عہد میں شہر کھنبایت کی جامع مسجد کے ٹوٹنے اور بننے کا دلچسپ قصہ آگے آتا ہے۔

ہندو مذہب کی تحقیقات: اس باہمی میل جول کا اثر یہ ہوا کہ عربوں کو ہندوؤں کے مذاہب کی تحقیقات کا شوق پیدا ہوا، چنانچہ یحییٰ برمکی نے جس کی وزارت کا زمانہ سنہ ۱۷۰ھ سے ۱۹۰ھ تک ہے ایک شخص کو ہندوستان خاص طور سے اس لیے بھیجا کہ وہ یہاں کی دوائیں اور یہاں کے مذہبوں کا حال لکھ کر لائے، اس وقت بغداد کا یہ عالم تھا کہ دنیا کے تمام مذہبوں اور عقیدوں کا وہ اکھاڑہ بنا ہوا تھا، عباسی خلفاء اور ان کے بعض فلسفہ پسند امراء کے دربار مذہبی مجلسوں اور مناظروں سے گرم رہتے تھے، اور دن اور وقت مقرر تھے، جن میں ایسی مجلسیں منعقد ہوتی تھیں، اور ہر مذہب والے کو اجازت تھی کہ وہ اپنے مذہب کی دلیلیں پیش کرے اور اسلام پر اعتراضات کرے اور جوابات سنے، ان مجلسوں اور مناظروں میں مسلمان متکلمین سب سے پیش پیش رہتے تھے اور برامکہ کا خاندان خاص طور سے ان لوگوں کی سرپرستی کرتا تھا، عجیب نہیں کی اسی وجہ سے یہ ضرورت پیش آئی ہو کہ ہندوستان کے مذہبوں سے بھی واقفیت حاصل کی جائے۔

---

[1] فتوح البلدان بلاذری ص ۴۴۶ (لیڈن)

جو شخص اس غرض سے ہندوستان بھیجا گیا تھا، اس کی بعینہ روداد غالباً محفوظ نہیں ہے، مگر ابن ندیم جس نے اپنی کتاب اس واقعہ کے ۷۰۔۸۰ برس بعد لکھی ہے، وہ ایک تحریر کا حوالہ دیتا ہے جو مشہور عرب فلاسفر یعقوب بن اسحاق کندی کے ہاتھ کی لکھی تھی اور اس پر سنہ ۳۴۹ھ کی تاریخ پڑی ہوئی تھی، اس میں یحییٰ برمکی کے ایک شخص کو ہندوستان کے مذاہب کی تحقیق کی غرض سے ہندوستان بھیجے جانے کی خبر درج تھی، اور اس پر ''ہندوستان کے مذاہب اور اعتقادات'' کا سرنامہ اور اس کے نیچے مختصر حالات لکھے ہوئے تھے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاید یہ اسی شخص کی روداد کا خلاصہ ہے۔

اس تحریر میں پہلے گجرات کے راجہ ولبھرائے کے دارالسلطنت مہانگر کے بت خانہ کا حال لکھا ہے کہ اس میں سونے، چاندی، لوہے، پیتل، ہاتھی دانت، اور ہر قسم کے بیش قیمت پتھروں اور جواہرات کے بیس ہزار بت ہیں، اور اس میں سونے کا ایک بت ۱۲ ہاتھ اونچا ہے، اور وہ سونے کے تخت پر بیٹھا ہے، یہ تخت ایک سونے کے گنبد نما کمرے میں ہے، یہ کمرہ سپید موتیوں اور سرخ، سبز، زرد اور آسمانی رنگ کے جواہرات سے مرصع ہے، سال میں ایک دفعہ اس کا میلہ ہوتا ہے، راجہ خود پیادہ وہاں جاتا اور آتا ہے، اس کے آگے سال میں ایک دن قربانی کی جاتی ہے، اور لوگ اپنی جان بھی اس پر قربان کرتے ہیں، پھر مولستان (ملتان) کے بت کا حال لکھا ہے، پھر دوسرے بتوں کا احوال ہے، اس کے بعد ہندوستان کے چند فرقوں اور ان کے بتوں کا حال بیان کیا ہے۔

۱۔ سب سے پہلے فرقہ کا نام مہا کالیہ بتایا ہے، جو مہا کالی کو پوجتے ہیں، جس کے چار ہاتھ ہوتے ہیں، آسمانی رنگ ہوتا ہے، سر پر بہت بال ہوتے ہیں، دانت نکلے ہوتے ہیں، پیٹ کھلا ہوتا ہے، پیٹھ پر ہاتھی کی کھال پڑی ہوتی ہے جس سے خون کے قطرے ٹپکتے ہیں، ایک ہاتھ میں اژدہا، دوسرے میں ڈنڈا، تیسرے میں ایک انسان کا سر، چوتھا ہاتھ اوپر اٹھا ہوا، اس کے دونوں کانوں میں دو سانپ اور اس کے بدن میں دو اژدہے لپٹے ہوئے،

سر پر کھوپڑیوں کی ہڈیوں کا تاج اور انہیں ہڈیوں کا گلے میں مالا۔

۲۔ دوسرا فرقہ الدنیکتیہ ، الادنیکتیہ (ادت بھکتی) یعنی سورج (ادت) پوجنے والے، اس کی صورت یہ ہے کہ ایک گاڑی ہے جس میں چار گھوڑے جتے ہیں، اس کے اوپر ایک بت ہے، وہ اس کو سجدہ کرتے ہیں، اس کے گرد گھومتے ہیں بخور جلاتے ہیں، باجہ بجاتے ہیں، اس پر بہت سی جائدادیں وقف ہیں، بہت سے پجاری ہیں جو اس بت خانہ اور جائداد کا انتظام کرتے ہیں، بیمار ہر طرف سے یہاں آتے ہیں اور اپنے خیال میں وہ یہاں سے اچھے ہو کر جاتے ہیں۔

۳۔ تیسرا چندر بھکتیہ (چندر بھکتی) یہ چاند کے پجاری ہیں، اس کے بت کی گاڑی چار بطون پر چلتی ہے، بت کے ہاتھ میں ایک بہت بڑا لال ہوتا ہے، جس کو چندر گپت کہتے ہیں، چودھویں رات کو جو چاند کے پورے کمال پر پہنچنے کا وقت ہے برت رکھتے ہیں اور اس رات کو اس کی پوجا کرتے ہیں اور کھانا، شراب اور دودھ اس دیوتا کے پاس لاتے ہیں، چاند کی پہلی اور چودھویں کو چھتوں پر چڑھ کر اس کو دیکھتے ہیں اور منتر اور دعا پڑھتے ہیں۔

۴۔ چوتھا فرقہ بکرنتیہ [1] نام ہے، جو اپنے کو زنجیروں میں جکڑے رہتے ہیں، سر اور داڑھی کے بال منڈاتے ہیں، ایک لنگوٹی کے سوا تمام بدن ننگا رکھتے ہیں، جو ان کے فرقہ میں آتا ہے اس کو کہتے ہیں پہلے سب کچھ دان کر دو۔

۵۔ پانچواں فرقہ گنگا پاترہ (گنگا جاتری) اس عقیدہ کے لوگ تمام ہندوستان میں پھیلے ہیں، ان کے ہاں یہ ہے کہ جو گناہ بھی انسان کرے گنگا آ کر اشنان کرنے سے وہ سب دھل جاتا ہے۔

---

[1] اس لفظ کی اصلیت اور اس فرقہ کا کچھ حال آگے آئے گا، زیر لفظ ''بھکشو'' دوسری کتابوں میں بکرنتیہ کی جگہ پیکر جبین کا لفظ ہے، بزرگ بن شہریار نے ان کا نام بیکور بتایا ہے (ص ۱۵۵) بیرونی نے ان کو مہادیو کے پجاری کہا ہے، دیکھو کتاب الہند ص ۵۸۔

۶۔ چھٹے راجپوتیہ (راجپوت) ہیں، جن کا دھرم راجاؤں کی مدد ہے، وہ سمجھتے ہیں کہ راجہ کے لیے کام آجانا بھکتی ہے۔

۷۔ ایک اور فرقہ ہے جو اپنے بال بڑھاتا ہے اور ان کو بٹ کر چہروں پر جٹا بنا کر ڈالتا ہے، ہر طرف بال بکھرے ہوتے ہیں، وہ شراب نہیں پیتے، ایک پیاز پر جاترے کو جاتے ہیں، عورتوں کو دیکھ کر بھاگتے ہیں، آبادی میں نہیں آتے۔ [۱]

ابن ندیم کے ہم عصر یا قریب زمانہ (سنہ ۳۷۵ھ) کے بیت المقدس کے ایک عرب متکلم مطہر [۲] کی کتاب البدء والتاریخ کا بیان زیادہ مفصل ہے۔

''ہندوستان میں نو سو فرقے ہیں، لیکن ان میں صرف ننانوے کا حال معلوم ہے اور یہ سب پینتالیس مذہب کے اندر ہیں اور یہ بھی چار اصول کے اندر محدود ہیں، اور ان کی اصل موٹی تقسیم دو ہے، سمنی (بودھ) اور برہمنی۔ سمنی یا تو خدا کے قائل نہیں یا ایسے خدا کے جو بے اختیار ہے، برہمنی مذہب والوں میں تین فرقہ ہیں، ایک توحید اور سزا اور جزا کا قائل ہے، مگر رسالت کا نہیں، دوسرا تناسخ کے اصول پر جزا و سزا کو مانتا ہے، لیکن نہ توحید کا قائل ہے اور نہ رسالت کا''۔ [۳]

اس کے بعد مصنف نے اہل ہند کی علمی حیثیت کا مختصر بیان کیا ہے، پھر مقدمات میں دعووں کی شہادت کے ان پرانے طریقوں کا ذکر کیا ہے جو پرانے ہندوستان میں جاری تھے، مثلاً گرم لوہے کو چھو لینا وغیرہ، اس کے بعد کہتا ہے:-

''مسلمان ان کے نزدیک ناپاک ہیں، وہ ان کو اور جس چیز کو

---

[۱] کتاب الفہرست ابن ندیم ص ۲۴۵۔ ۲۴۹ [۲] حاجی خلیفہ نے اس کتاب کا مصنف ابوزید احمد بن سہل بلخی کو قرار دیا ہے، پیرس ایڈیشن کے اڈیٹر نے چند جلدوں پر تو بلخی کا نام لکھا ہے، پھر گذشتہ بیان کی تصحیح کر کے مطہر بن طاہر کا نام لکھا ہے۔ [۳] جلد ۴ ص ۹۔ ۱۹ (پیرس)، تیسرے فرقہ کا ذکر چھوٹ گیا ہے۔

وہ چھودیں اس کو نہیں چھوتے اور گائے ان کے نزدیک ماں کی طرح معزز ومحترم ہے، اس کی جان لینے کی سزا ان کے یہاں قتل ہے، اور غیر عورت سے ہم بستری کرنا، بے بیوی والوں کے لئے ان کے یہاں جائز ہے، تاکہ نسل کم نہ ہو[1] اور بیوی والا اگر برا کام کرے تو اس کی سزا قتل ہے، اور جب ان میں سے کوئی مسلمانوں کے ہاتھ پڑ کر پھر ان کے یہاں واپس جاتا ہے تو اس کو مارتے نہیں بلکہ اس کے بدن کے تمام بال مونڈ کر اس کو پراشچت کرتے ہیں، (اور اس کا وہی طریقہ لکھا ہے جو اب بھی ہندوستان میں جاری ہے، یعنی گائے کی چند چیزوں کو ملا کر پلانا) قرابت میں وہ نکاح نہیں کرتے، برہمنوں کے نزدیک شراب حرام ہے اور ذبیحہ بھی''۔

اس کے بعد ہندو دیوتاؤں اور ان کی مختلف پوجا کرنے والوں کی تفصیل دی ہے اور ہر دیوتا کی صورت بتائی ہے، پھر مہادیو، کالی، اور مہا کالی، اور لنگ پوجا وغیرہ کا حال لکھا ہے، اور اس کے بعد دو نئے فرقوں کا ذکر کیا ہے، جن میں سے ایک کا نام جل بھکتیہ (جل بھکت) ہے جو پانی کی پوجا کرتے ہیں اور دوسرے کا نام اگنی ہوطریہ (اگنی ہوتری) بتایا ہے جو آگ کی پوجا کرتے ہیں، رشیوں کا ذکر کیا ہے اور بتایا ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو مراقبہ اور دھیان کر کے اپنے ظاہری حواس کو بے کار کر لیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ جس قدر وہ مادیت سے الگ ہوں گے اتنی ہی روحانیت ان میں پیدا ہوگی، یہ ہمیشہ اپنی آنکھیں بند رکھتے ہیں، اخیر میں جوگیوں کا اور اپنی جان بلدان دینے والوں کا حال لکھا ہے۔

برہمنوں کے متعلق لکھا ہے کہ ''یہ گائے پوجتے ہیں اور گنگا سے پار جانا حرام سمجھتے ہیں، اور کسی دوسرے کو اپنے دھرم میں لینا ان کے یہاں جائز نہیں'' اخیر میں یہ مصنف کہتا ہے:-

''قیامت اور رسالت پر ان میں سے جس کا یقین نہیں وہ

---

[1] شاید نیرگ کے مسئلہ کا بیان ہو۔

بھی جزا وسزا کو آواگون اور تناسخ کی صورت میں مانتا ہے اور بت پرستی کا عذر یہ بیان کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ تو ادراک، علم اور حس، ہر ایک سے اوپر ہے اور حواس کی گرفت سے باہر ہے، اسی لئے ایک درمیانی واسطہ کی ضرورت ہے''۔

اس کے بعد مذاہب عالم کے مشہور محقق عبدالکریم شہرستانی کا نام آتا ہے، جس کا زمانہ سنہ ۴۶۹ھ سے سنہ ۵۴۹ھ تک ہے، اس نے مطہر مقدسی کے بیان کو زیادہ تفصیل سے نقل کیا ہے اور ایک نئے فرقہ برگسبکیہ (برگش بھکت) کا ذکر کیا ہے جو درختوں کی پوجا کرتا ہے۔[1]

ابوریحان بیرونی نے کتاب الہند کے گیارہویں باب میں ہندوؤں کے تمام مذاہب بیان کیے ہیں، اور اس میں سب دیوتاؤں کی صورتیں اور کیفیتیں لکھی ہیں اور خود بت پرستی یا مورتی پوجا کے فلسفہ پر بحث کی ہے اور لکھا ہے کہ ''یہ مورتی پوجا صرف ہندوستان کے عوام اور جاہلوں کا دھرم ہے، ورنہ پڑھے لکھے ہندو ایسا نہیں سمجھتے'' پھر گیتا کے چند فقرے نقل کیے ہیں جن میں سے ایک یہ ہے کہ ''بہت سے لوگ مجھ کو چھوڑ کر دوسروں کو پوجتے ہیں تو میں ان سے بے پرواہوں'' پھر کرشن جی کی ایک تقریر نقل کی ہے جس میں ارجن کو خطاب کر کے چاند اور سورج وغیرہ کی پوجا کرنے والوں سے اپنی بیزاری ظاہر کی ہے۔

اس کے بعد سات سمندر پار اسپین کے ملک کے رہنے والے ایک عرب مصنف قاضی صاعد (المتوفی سنہ ۴۶۹ھ/سنہ ۱۰۷۰ء) کا ''ایمان بالغیب'' ملاحظہ ہو، وہ اپنی کتاب طبقات الامم میں جس میں تمام دنیا کی متمدن قوموں کے علوم کی تاریخ بیان کی ہے، لکھتے ہیں:-

''ہندو قوم تمام قوموں کے نزدیک ہر زمانہ میں حکمت کی کان

---

[1] ملل ونحل جلد دوم اخیر باب۔

اور دانائی اور عقل مندی کا سرچشمہ رہی ہے.....ان کا علم الٰہی اللہ تعالیٰ کی توحید اور شرک سے پاکی ہے، ان کے مختلف فرقے ہیں، بعض برہمن ہیں، بعض ستارہ پرست ہیں، بعض عالم کے حدوث اور بعض اس کی ازلیت کے قائل ہیں، نبوت و رسالت نہیں مانتے، اور حیوانات کو ذبح کرنا اور ان کو تکلیف دینا برا سمجھتے ہیں، (اس کے بعد مصنف نے اسپین سے ہندوستان کی دوری کا عذر کر کے اس کے زیادہ حالت نہ جاننے پر افسوس کیا ہے اور ہندوستان سے عربی کے ذریعہ اسپین تک جو علوم و فنون اور مسائل پہنچتے ہیں ان کی تفصیل کی ہے۔''[۱]

عرب سیاحوں نے ہندوستان کے جو مذہبی حالت بیان کیے ہیں ان میں زیادہ تر ملتان اور سندھ کے بعض بت خانوں کی کیفیت ہے، مثلاً یہ کہ ملتان کا مشہور بت لکڑی کا تھا، اس کے جسم پر سرخ کھال لپٹی تھی، اس کی دو آنکھوں کی جگہ پر دو لال تھے، اور سر پر سونے کا تاج تھا، [۲] بیرونی نے بتایا ہے کہ یہ سورج دیوتا کی مورتی تھی، اور اسی لئے اس کا نام ادت (سورج) تھا۔ [۳]

دوسری چیز جس کا ان عرب سیاحوں نے بڑی کراہت کے ساتھ ذکر کیا ہے وہ ان مندروں کا حال ہے جن میں دیو داسیوں کے رکھنے کا دستور تھا، اس قسم کے مندروں کا ذکر جنوبی ہند کے سیاحوں نے زیادہ کیا ہے، [۴] مگر مقدسی جو سنہ ۳۷۵ھ میں ہندوستان آیا تھا، اس قسم کے مندر کا سندھ میں بھی ذکر کرتا ہے۔[۵]

تیسری چیز جس کا ان سیاحوں نے بکثرت ذکر کیا ہے وہ اپنی جان بلدان کرنے

---

[۱] طبقات الامم ص ۱۱۔۱۵ (بیروت) [۲] دیکھو احسن التقاسیم مقدسی ص ۴۸۳ و آثار البلاد قزوینی ص ۸۱ وغیرہ کتب جغرافیہ۔ [۳] کتاب الہند ص ۵۶ (لندن) [۴] سفرنامہ سلیمان تاجر و ابوزید سیرافی ص ۱۳۰ (پیرس) [۵] احسن التقاسیم ص ۴۸۳۔

والوں کا ذکر ہے، اور ایسا ایسا حال لکھا ہے جس کو سن کر بدن کے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں، گنگا میں ڈوب کر جان دینا تو معمولی ہے، ستی ہونے والی عورتوں کا ذکر بھی اس کے مقابلہ میں کم درجہ ہے۔

ابوزید سیرافی کہتا ہے کہ ''ان لوگوں کو تناسخ اور آواگون پر اتنا یقین ہے کہ اپنے کو آگ میں زندہ جلا دینا معمولی بات ہے، کوئی جب اپنے کو جلانا چاہتا ہے تو راجہ سے اجازت لیتا ہے، پھر بازاروں میں پھرتا ہے، دوسری طرف آگ خوب بھڑکائی جاتی ہے اور جھانجھ بجائی جاتی ہے، اس کے رشتہ دار اس کے چاروں طرف جمع رہتے ہیں، پھر پھولوں کا ایک تاج بنا کر جس میں شعلے دہکتے ہیں اس کے سر پر رکھتے ہیں، سر کی کھال جلنی شروع ہوتی ہے اور وہ اسی طرح کھڑا رہتا ہے اور آہستہ آہستہ جل کر چتا میں کود پڑتا ہے''، ایک اور منظر یہ ہے کہ ایک شخص خنجر سے خود اپنا سینہ آپ چاک کر کے ہاتھ ڈال کر اپنا دل اندر سے نکال لیتا ہے، اور یہ تمام کام پورے اطمینان کے ساتھ ادا کرتا ہے۔ [1]

سب سے دردناک منظر کا نقشہ ابن الفقیہ نے کھینچا ہے کہ ''ملتان کے ایک مندر میں ایک شخص آیا جو اپنے سر اور انگلیوں پر تیل میں بھیگی ہوئی روئی لپیٹے ہوئے تھا، وہاں آکر اس نے ان میں آگ لگا دی، اور یہ بتیاں بھی جلتی ہوئی اس کے بدن تک پہنچ گئیں اور وہ اسی اطمینان اور سنجیدگی کے ساتھ جل کر خاک ہو گیا'' [2]

برہمن اور سمنی، ابراہیم اور خضر

مطہر مقدسی (سنہ ۳۳۵ھ) نے تمام ہندو فرقوں کو دو حصوں میں منقسم کیا ہے، ایک کا نام برہمنیہ اور دوسرے کا نام سمنیہ بتایا ہے، لیکن عجیب بات یہ ہے کہ (بعض عرب مصنفوں کو لفظ برہمن کی مشابہت سے اتنا حسن ظن پیدا ہوا کہ انہوں نے یہ فرض کر لیا کہ برہمن درحقیقت حضرت ابراہیم کے پیرو ہیں، اسی لئے ان کو برہمن کہتے ہیں، لیکن شہرستانی نے

---

[1] سفرنامہ ابوزید ص ۱۱۵۔۱۱۸ [2] آثار البلاد قزوینی ص ۸۱

اس غلطی کو دور کیا اور بتایا کہ یہ برہم کی طرف نسبت ہے، ابراہیم کی طرف نہیں، برہمنوں کا حریف فریق سنیہ دراصل عربی میں بودھوں کا نام ہے، (اس تحقیق پر آیندہ مفصل بحث آتی ہے) بودھ کے متعلق اس کے یہودیوں کا جو یہ عقیدہ ہے کہ وہ وقتاً فوقتاً انسانوں میں اکثر ظاہر ہوا کیے ہیں، اس سبب سے بعض نیک نیت لوگوں نے یہ تطبیق دی کہ یہی بودھ ہیں جن کو مسلمان خضر کہتے ہیں۔[۱]

دو قوموں کے درمیان اس وقت تطبیق کی ضرورت پیش آتی ہے جب ان کے درمیان کسی قسم کا سمجھوتہ اور اتحاد پیدا ہوتا ہے، یہ دونوں مثالیں ان دونوں قوموں کے اسی دور کی یادگار ہیں۔

پیغمبر اسلام کا ایک ادب شناس ہندو راجہ: سنہ ۱۴۷ھ میں جب منصور عباسی کے زمانہ میں حوصلہ مند سادات علوی نے حکومت کے قیام کا ارادہ کیا تو سندھ میں بھی اس کا سامان ہوا، مگر پانسہ الٹ گیا اور علویوں کو کامیابی نہ ہوئی، اس وقت ان کو ایک جائے پناہ کی تلاش ہوئی، ہند کا مسلمان والی جو سادات کا ہمدرد تھا، اس نے ان سے کہا آپ لوگ گھبرائیں نہیں، یہاں ایک راجہ ہے جو رسول اللہ ﷺ کی بڑی عزت کرتا ہے، آپ لوگ اس کے ہاں چلے جائیں، چنانچہ وہ چلے گئے، راجہ نے بڑے تزک و احتشام سے ان کا استقبال کیا اور وہ بڑے آرام سے وہاں رہنے لگے۔[۲]

سمنیہ: ابھی اوپر کی سطروں میں سمنیہ فرقہ کا ذکر ہوا ہے اور کہا گیا ہے کہ عربوں میں یہ بودھ مت والوں کا نام تھا، میں اس تحقیق کے نتیجہ اور اس کے دلائل تک ایک مدت کے جمع معلومات کے بعد پہنچا ہوں۔

سب سے پہلے اس فرقہ کا نام عبدالقادر بغدادی جس نے سنہ ۴۲۹ھ (سنہ ۱۰۳۷ء) میں وفات پائی ہے، اس کی کتاب الفرق بین الفرق میں اس تقریب سے نظر آیا

---

[۱] دیکھوں ملل ونحل، شہرستانی۔ [۲] کامل ابن اثیر واقعات سنہ ۱۴۷ھ۔

کہ اسلام کے عقل پرست فرقہ معتزلہ کے ایک بڑے امام نظام پر اس نے یہ غلط الزام لگایا ہے کہ اس نے نبوت کے انکار کا مسئلہ برہمنوں سے اور یہ مسئلہ کہ حق و باطل میں تمیز محال ہے، کیوں کہ ہر طرف دلیلیں قوی اور پرزور ہوتی ہیں، اس نے ''سمنیہ'' سے سیکھا، پھر مرتضی زیدی کی کتاب المعجز لہ میں پڑھا کہ ''ہارون الرشید کو ہندوستان کے سمنیہ نے اسلام پر یہ اعتراض کہلا بھیجا'' اس فقرہ نے یہ توجہ دلائی کہ اس فرقہ کا تعلق ہندوستان سے ہے، اس کے بعد سندھ کے حالات کی تحقیق میں سمنیہ کا نام بار بار ملا اور الیٹ صاحب کو دیکھا کہ پروفیسر مولر وغیرہ کے حوالہ سے کہتے ہیں کہ ان سے مراد ''بودھ مت والے'' اور اس لفظ کی سنسکرت اصل ''سرمن'' ہے جس کے معنی ایک مذہبی فقیر کے ہیں، الیٹ صاحب یہ بھی کہتے ہیں کہ یونانی سیاحوں اور مؤرخوں نے بھی ان کو سرامینس، سرمینیا اور سیومونی کے الفاظ سے یاد کیا ہے۔[۱] الیٹ صاحب کے اس بیان سے تھوڑا پتہ آگے چلا، مگر اس کے بعد ابن ندیم کی کتاب الفہرست نے اس معمے کو بالکل حل کر دیا اور اس سے مجھ کو پوری تشفی ہوگئی اور یہ بھی معلوم ہوگیا کہ یونانیوں میں یہ نام کیوں کر آیا۔

سمنیہ کی تحقیق: حمزہ اصفہانی جس نے اپنی کتاب تاریخ ملوک الارض (زمین کے باشاہوں کی تاریخ) سنہ ۳۵۰ھ میں تقریباً لکھی ہے اور جو ایران اور خراسان کی تاریخ کی سند ہے، وہ اپنی کتاب کے مقدمہ میں[۲] لکھتا ہے:-

> ''دنیا میں پہلے صرف دو ہی فرقے تھے، ایک ''سمنیین'' اور دوسرے کلدانیین (کلدانیا والے) سمنیین یورپ کے ملکوں میں تھے اور ان کے کچھ باقی افراد اب بھی ہندوستان کے گوشوں میں اور چین میں ہیں اور خراسان والے ان کو ''شمنان'' جمع کی حالت میں کہتے ہیں''۔

اس سے یہ معلوم ہوگیا کہ عربوں نے بودھوں کا یہ نام خراسانیوں سے سنا اور وہی

---

[۱] القیا، الیٹ ج ا ص ۵۰۶۔ [۲] تاریخ ملوک الارض ص ۷ مطبوعہ کاویانی (برلن)۔

ان میں رائج ہوا، اصفہانی کے بیان کے ساتھ ابن ندیم (سنہ ۳۷۵ھ) کا یہ پر معلومات بیان ملاؤ۔

> ''میں نے ایک خراسانی کے ہاتھ کی تحریر پڑھی جس نے خراسان کی پرانی اور پھر نئے زمانہ میں جو اس کی کیفیت ہے اس کے حالات لکھے تھے، یہ رسالہ دستور کی طرح تھا، اس میں لکھا تھا کہ (سمنیہ کے پیغمبر کا نام بوذاسف تھا اور پرانے زمانہ میں اور اسلام سے پہلے ماوراالنہر (ٹریفز اور کیشیفا) کے لوگ اسی مذہب کے پیرو تھے، اور سمنیہ کا لفظ سمنہ کی طرف نسبت ہے، یہ لوگ تمام زمین والوں اور تمام دوسرے مذہب والوں سے زیادہ سخی ہوتے ہیں، اور یہ اس وجہ سے کہ ان کے پیغمبر بوذاسف نے ان کو یہ بتایا ہے کہ سب سے بڑا گناہ جو ناجائز ہے اور جس کا انسان کو کبھی نہ اعتقاد کرنا چاہیے، اور نہ عمل کرنا چاہیے، یہ ہے کہ کوئی اپنی زبان سے ''نہیں'' نکالے۔ تو ان کا اسی نصیحت پر عمل ہے، اور نہیں کہنا ان کے نزدیک شیطان کا کام ہے، اور ان کا مذہب شیطان کو دور کرنا ہے۔[1]

یہ حرف حرف بودھ مت کی تصویر ہے اور گذر چکا ہے کہ بوذاسف کی اصل ''بودھی ستو'' ہے اور یہ بھی معلوم ہے کہ اسلام سے پہلے ایشیائے وسطیٰ کا مذہب بودھ ہی تھا، اس بیان کے بعد اس میں کوئی شبہ نہیں رہ جاتا کہ سمنیہ اور بودھ ایک چیز ہیں۔

سمنیہ کے اصول: عبدالقادر بغدادی سنہ ۴۲۹ھ (سنہ ۱۰۳۷ء) نے سمنیہ کے ایک اصول کا ضمناً تذکرہ کیا ہے، جس کو عربی اصطلاح میں ''تکافو ادلہ'' کہتے ہیں جو ایک طرح سے لاادریہ (اگناسٹک) فرقہ کے اصول کے قریب قریب ہے اور اس کے معنی یہ ہیں کہ دنیا میں حق اور باطل اس طرح ۔۔۔ ہوئے ہیں کہ ہر شے کے نفیاً یا اثباتاً ہاں اور نہیں دورخ ہو

---

[1] الفہرست ابن ندیم ص ۳۴۵۔

سکتے ہیں اور دونوں میں سے کسی کو نہ غلط کہہ سکتے ہیں اور نہ صحیح کہہ سکتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ یہ اصول بودھ کی بعض تعلیمات میں ہیں، لیکن یہ اصول سب سے زیادہ جینیوں کے ہاں نمایاں ہیں۔[1]

بودھ کا دوسرا اصول جس پر اس کے مت کی بنا ہے وہ دنیا یا زندگی کے دکھ، برائی یا مصیبت سے چھٹکارا ہے، اسی برائی دکھ اور مصیبت کو ابن ندیم نے شیطان کے لفظ سے تعبیر کیا ہے جو بدیوں کا مرکز ہے، اور یہ کہا ہے کہ ''سمنیہ کا مذہب شیطان کو دور کرنا ہے'' یعنی بدیوں اور دکھوں سے نجات پانا ہے۔

(شہرستانی نے جو پانچویں صدی ہجری کے اخیر گیارہویں صدی عیسوی) میں تھا، سمنیہ کے بجائے بد کا لفظ استعمال کیا ہے، اور معلوم ہوتا ہے کہ اس کو اس مذہب سے پوری واقفیت تھی، وہ کہتا ہے کہ ''بد (بدھ) سے مراد وہ وجود ہے، جس کا ظہور نہ تو پیدائش سے ہوتا ہے اور نہ وہ بیاہ شادی رچاتا ہے، نہ کھاتا ہے، نہ پیتا ہے، نہ بوڑھا ہوتا ہے، اور نہ مرتا ہے، یہ گویا نروان کے بعد درجہ کا ذکر ہے، اس کے بعد اس نے گوتم بدھ کی تعلیمات کا ذکر کیا ہے، کہ وہ دس گناہوں سے بچے، اور دس اخلاقی فرائض کو ادا کرے، ان میں سے ہر ایک کو بیان کیا ہے اور لکھا ہے کہ مجھے جہاں تک ان کے اصول کا علم ہے ان میں عالم کی ازلیت اور تناسخ کے قاعدے سے جزا و سزا بھگتنے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔[1]

مطہر بن طاہر نے کسی عربی جغرافیہ کی کتاب الممالک سے (ابن خرداذبہ والی نہیں، مگر جس کی تصنیف کی تاریخ یقیناً تیسری صدی کا آخر یا چوتھی صدی کا شروع ہوگا) اور ابن ندیم نے کندی کے علاوہ کسی اور کی تحریر سے یہ بالکل صحیح نقل کیا ہے کہ ''سمنیہ میں دو فرقے ہیں، ایک وہ جو یہ یقین کرتا ہے کہ بدھ خدا کا پیغمبر تھا اور دوسرے کا اعتقاد ہے کہ بدھ خود خدا تھا جو اس اوتار میں دنیا میں ظاہر ہوا''۔[2] یہ تعمیر حقیقت میں اس اختلاف کی ہے

[1] ملل ونحل شہرستانی، مذاہب ہند۔ [2] ابن ندیم ص ۳۴۷ و کتاب البدء والتاریخ جلد ۴ ص ۱۹۔

کہ بودھ مت میں خدا کا وجود ہے یا نہیں؟ اس مت کا ایک فرقہ خدا کے نام سے کسی وجود کا قائل نہیں اور دوسرا قائل ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ خود بودھ نے اس مسئلہ کو بالکل گنجلک رکھا ہے، محمد خوارزمی چوتھی صدی ہجری کے اخیر میں کہتا ہے کہ ''سمنیہ بت پرست ہیں، اور قدم عالم، تناسخ کے، اور اس کے قائل ہیں کہ زمین ہمیشہ نیچے کو جارہی ہے، ان کے پیغمبر کا نام بوذاسف ہے جو ہندوستان میں پیدا ہوا اور یہ لوگ ہندوستان اور چین میں ہیں، کلدانی بھی اپنے کو اس کی طرف منسوب کرتے ہیں'' [۱]

مشہور متبحر عرب مؤرخ اور سیاح مسعودی (سنہ ۳۳۳ھ) چین کے حال میں لکھتا ہے:-

> ''ان کا مذہب پہلے لوگوں کا مذہب ہے، اور یہ ایک فرقہ ہے جس کا نام سمنیہ ہے، جن کی پوجا کا طریقہ وہی ہے جو اسلام سے پہلے قریش کا تھا، بتوں کو پوجتے ہیں اور دعاؤں میں ان کی طرف منھ کرتے ہیں، ان میں جو سمجھدار ہیں وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اس مورت کی حیثیت محض قبلہ کی ہے اور اصل نماز خدا کی ہے، اور جو نادان ہیں وہ ان بتوں کو خدا کا درجہ دیتے ہیں اور ان کو پوجتے ہیں'' [۲]

بودھ کی صورت: دنیا کے تمام رہنماؤں میں غالباً بودھ ہی کی ایسی ذات ہے جس کی شکل وصورت اس کے مجسمہ اور مورتی کی بدولت ہزاروں سال گذر جانے کے باوجود دنیا کے سامنے ہے اور عجائب خانوں کے ذریعہ سے تو اب دنیا کے گوشہ گوشہ میں موجود ہے، اہل عرب بھی بودھ کی اس شکل وصورت سے واقف تھے، ابن ندیم نے ان لفظوں میں اس کی تصویر کھینچی ہے:- [۳]

---

۱ مفاتیح العلوم خوارزمی ص ۳۶ (لیڈن) ۲ تاریخ مسعودی (مروج الذہب) جلد اول ص ۲۹۸ (لیڈن)

۳ ابن ندیم ص ۲۴۷

''ایک شخص ایک تخت پر بیٹھا، چہرہ پر بال نہیں، ٹھڈی نیچے جھکی کسی قدر مسکراہٹ، انگلیاں بند اور کچھ کھلی''۔

بودھ کی ایک مورتی بغداد بھی گئی تھی، ابن ندیم نے اس کو دیکھا تھا اور اس پر ایک کتبہ بھی تھا۔[1]

بودھ مت کی وسعت: اہل عرب کو یہ اچھی طرح معلوم تھا کہ بودھ مت کن کن ملکوں میں پھیلا تھا، ابھی ابن ندیم کا بیان گذر چکا ہے کہ خراسان اور ماوراء النہر یعنی ایشیائے وسطیٰ کا مذہب اسلام سے پہلے بودھ تھا، اسی طرح انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ چین میں بھی یہی مذہب ہے اور وہ ہندوستان سے گیا ہے، اکثر عرب سیاحوں نے اس کا ذکر کیا ہے، سب سے پہلا عرب سیاح جس کا سفرنامہ ہمارے پاس ہے، یعنی سلیمان تاجر سنہ ۲۳۷ھ (سنہ ۸۳۷ء) وہ اپنے سفرنامہ میں کہتا ہے:-

''چین کے مذہب کی اصل ہندوستان سے ہے اور وہ کہتے ہیں کہ یہ بودھ کی مورتیاں ہندوستان ہی نے ہمارے لیے بنائی ہیں، ان دونوں ملکوں کے لوگ آواگون (تناسخ) کے مسئلہ میں ایک ہیں اور دوسری معمولی باتوں میں ان میں اختلاف ہے''۔[2]

اسی طرح جنوبی ہندوستان اور جزائر میں وہ اس مذہب کے اثرات پاتے تھے۔

بھکشو: چنانچہ ابوزید سیرافی، جس نے تیسری صدی کے آخر میں جنوبی ہندوستان جزائر اور چین کا حال لکھا ہے، وہ بودھ فقیروں کا ذکر کرتا ہے اور ان کا نام بیکر جی لکھتا ہے، جو شاید بھکشو کی خرابی ہے، کیوں کہ لفظ کی صورت کے علاوہ معنی کی صورت بھی انہیں پر پوری اترتی ہے، سیرافی کہتا ہے:-

''ہندوستان میں ایک گروہ ہے جس کا نام 'بیکر جیین' ہے، یہ

---

[1] ابن ندیم ص ۱۹۔ [2] سفرنامہ سلیمان تاجر مطبوعہ پیرس سنہ ۱۸۱۱ء صفحہ ۵۷۔

ننگے ہوتے ہیں، ان کے بالوں کی لٹیں اتنی بڑی ہوتی ہیں کہ وہ پھیل کر ستر چھپا لیتی ہیں، ان کے ناخن بہت بڑے ہوتے ہیں، وہ ان کو کٹاتے نہیں چاہے ٹوٹ جائیں، یہ ہمیشہ شہر بہ شہر پھرا کرتے ہیں، ان میں سے ہر ایک کی گردن میں آدمی کی ایک کھوپڑی تاگے میں بندھی ہوئی پڑی رہتی ہے، جب ان کو زیادہ بھوک لگتی ہے تو وہ کسی کے دروازے پر کھڑے ہو جاتے ہیں، مکان والا جلدی سے پکے ہوئے چاول لے کر خوش خوش آتا ہے اور ان کو پیش کرتا ہے، وہ اسی کھوپڑی میں لے کر ان کو کھا لیتے ہیں، جب ان کا پیٹ بھر جاتا ہے تو شہر سے واپس چلے جاتے ہیں، پھر صرف بھوک کے وقت وہ نکلتے ہیں۔[۱]

بزرگ بن شہریار ناخدا نے سنہ ۳۰۰ھ میں سراندیپ سے گذرتے ہوئے اس قسم کے فقیروں کو دیکھا تھا، اس نے بھی ان کی یہی تصویر کھینچی ہے اور ان کا نام بیکور بتایا ہے اور لکھا ہے کہ یہ گرمی میں بالکل ننگے رہتے ہیں اور صرف چار انگل کی لنگوٹی باندھتے ہیں اور جاڑوں میں چٹائی اوڑھتے ہیں اور مختلف رنگ کے ٹکڑوں کو جوڑ کر ایک کپڑا سی لیتے ہیں، اسی کو پہنتے ہیں بدن پر مردوں کی جلی ہوئی ہڈی کی راکھ کو ملتے ہیں اور گلے میں انسان کی کھوپڑی لٹکاتے ہیں اور عبرت اور خاکساری کے لئے اسی میں کھاتے ہیں۔[۲]

لیکن بیرونی نے اس قسم کے فقیروں کو مہادیو کے پجاری کہا ہے، ان کی صورت بھی ان سے ملتی جلتی تھی، وہ بھی گلے میں ڈنڈ مالا ڈال کر جنگل جنگل پھرتے تھے۔[۳]

جوگی: جوگیوں اور تارک الدنیا فقیروں کے حالات بھی ان کتابوں میں لکھے ہیں، مگر ان میں سب سے زیادہ عجیب وہ واقعہ ہے جس کو سلیمان تاجر نے نویں صدی عیسوی کے بیچ میں اپنے مشاہدہ سے لکھا ہے۔ کہتا ہے:

---

[۱] سفرنامہ ابوزید سیرافی ص ۱۲۷ و ۱۲۸ [۲] عجائب الہند بزرگ بن شہریار ص ۱۵۵ (لیڈن) [۳] کتاب الہند ص ۵۸

''ہندوستان میں ایسے لوگ ہیں جو ہمیشہ پہاڑوں اور جنگلوں میں پھرا کرتے ہیں، اور لوگوں سے بہت کم ملتے ہیں، بھوک لگتی ہے تو گھانس پات یا جنگل کے پھل کھا لیتے ہیں....ان میں بعض ننگ دھڑنگ ہوتے ہیں، چیتے کی کھال کا کوئی ٹکڑا البتہ ان پر پڑا رہتا ہے۔ میں نے اسی طرح ایک شخص کو دھوپ میں بیٹھا دیکھا۔ ۱۶ برس کے بعد جب پھر میرا ادھر سے گذر ہوا تو میں نے اس کو اسی طرح اور اسی حال میں پایا، مجھے تعجب ہوتا تھا کہ دھوپ کی تمازت سے اس کی آنکھ کیوں نہ بہہ گئی''۔(۱)

سمنیہ اور اسلام: سمنیہ کے ساتھ مسلمانوں کے تعلقات خراسان، ترکستان اور افغانستان سے شروع ہوتے ہیں اور رفتہ رفتہ وہ ہندوستان تک بڑھتے چلے آتے ہیں، چنانچہ بلخ کے نوو ہار (نوبہار) کے متولی برمکیوں سے لے کر ان ملکوں کے معمولی بودھوں نے بھی اسلام قبول کرنے میں کچھ زیادہ پس و پیش نہیں کیا، یہی صورت ہم کو سندھ میں نظر آئی ہے، پہلی صدی ہجری (ساتویں صدی عیسوی) کے خاتمہ پر یعنی سندھ کی فتح کی چند ہی سال کے بعد جب بنو امیہ کے دیندار اور برگزیدہ خلیفہ عمر بن عبدالعزیز نے سندھ کے لوگوں کو اسلام کا دعوت نامہ بھیجا تو بہت سے راجاؤں نے اسلام قبول کر لیا۔(۲)

اسی طرح ملیبار، مالدیپ اور بعض دوسرے جزیروں میں بھی ہم کو اسی قسم کے حالات ملتے ہیں، ہم نے اس قسم کے واقعات اپنے ایک سلسلہ مضمون میں جس کا عنوان ''ہندوستان میں اسلام'' ہے مفصل بیان کیے ہیں، اس لیے یہاں ان کے دہرانے کی حاجت نہیں۔

سمنیہ اور حصریہ: کہیں اوپر ایک واقعہ یہ گذرا ہے کہ مشہور فلاسفر اور متکلم نظام معتزلی جو دوسری صدی ہجری کے آخر (آٹھویں صدی عیسوی) میں تھا اور خلیفہ مامون الرشید کا

---

۱ سفرنامہ سلیمان تاجر، ص ۵۰-۵۱ ۲ فتوح البلدان بلاذری، فتح سندھ

استاد تھا، اس پر اس کے دشمنوں نے جو غلط الزام لگائے تھے، ان میں ایک یہ تھا کہ اس نے جوانی میں مجوسیوں اور سنیوں کی صحبت اٹھائی تھی، اور ''تکافؤ ادلہ'' کا مسئلہ اس نے سنیوں سے سیکھا تھا، اور فلاں مسئلہ فلاں سے فلاں مسئلہ فلاں سے اس کی فہرست دی گئی ہے، بہر حال یہ عبارت کتابوں میں یکساں درج ہے، لیکن صرف ایک لفظ میں ہر جگہ نئی تحریف ہے، سب سے قدیم کتاب جس میں یہ عبارت مجھ کو ملی ہے اور وہ عبدالقادر بغدادی (المتوفی سنہ ۴۲۹ھ سنہ ۱۰۳۸ء) کی کتاب الفرق بین الفرق ہے، اس کتاب میں یہ لفظ ''سمنیہ'' (سنیہ) لکھا ہے لیکن ایک اور مستند محدث و مؤرخ سمعانی المتوفی سنہ ۵۶۲ھ نے اس پوری عبارت کو نقل کیا ہے مگر ''سمنیہ'' کی جگہ ''حصریہ'' لکھا ہے، جیسا کہ ان کی کتاب الانساب کے اس قدیم نسخہ میں ہے، جس کو گب میموریل لندن نے سنہ ۱۹۱۲ء میں زنگوگراف کے ذریعہ سے بعینہ چھاپا ہے، ''حصریہ'' نام کسی فرقہ کا وجود نہیں معلوم، غالباً اسی لیے کسی نے اس کو ''دہریہ'' کر دیا ہے، جیسا کہ مولانا شبلی کی علم الکلام کی منقولہ عبارت میں ہے۔ مگر یہ صریحی تحریف ہے، اس لفظ سمنیہ اور حصریہ کے اختلاف پر میں دیر تک غور کرتا رہا، اور آخر بحمد للہ ایک نتیجہ پر پہنچ کر مجھے بالکل اطمینان ہو گیا۔ حقیقت میں سمعانی کے نسخہ میں ''حصریہ'' نہیں بلکہ ح اور ص سے دو نقطے کاتبوں نے اڑا دیئے ہیں، یہ لفظ ''خضریہ'' ہے، اس نتیجہ تک پہنچنے میں جس درمیانی واسطہ نے مدد دی وہ امام سمعانی کے ہم عصر فلسفی و محدث شہرستانی کا یہ خیال تھا کہ ''بودھ کی جو کیفیت بیان کی جاتی ہے، اگر وہ سچ ہے تو وہ اس خضر سے ملتا جلتا ہے، جس کے وجود کا دعویٰ مسلمان منجم اور مسمرائزر کیا کرتے ہیں'' [1] اس سے معلوم ہوا کہ بودھ کو ''خضر'' فرض کر کے بودھ مت کے پیروؤں کا نام لوگوں نے ''خضریہ'' رکھ لیا تھا، اور سمعانی نے نظام کے حال میں اسی فرقہ کا نام ''خضریہ'' لکھ دیا، اس بنا پر بغدادی کا ''سمنیہ'' اور سمعانی کا خضریہ کہنا ایک ہے۔

---

[1] ملل و نحل، شہرستانی جلد ۳ ص ۲۴۲ بر حاشیہ ملل و نحل ابن حزم۔

محمرہ: بودھوں کا ایک تیسرا نام عربی کتابوں میں محمرہ بھی ہے، یعنی ''سرخ کپڑے پہننے والے''[۱] جس سے مقصود شاید گروا رنگ ہو یا زعفرانی۔ یہ رنگ ان کے مذہبی پیشواؤں کی پہچان تھی۔

بودھ اور بت: اس موقع پر ایک اور لفظ کی طرف اشارہ کرنا ہے اور وہ لفظ بت ہے، جس سے بت پرست اور بت خانہ بنے ہیں، اس کو عام طور سے ایک فارسی لفظ سمجھا جاتا ہے، لیکن حقیقت میں یہ لفظ ''بدھ'' سے ''بد'' اور ''بد'' سے ''بت'' بنا ہے، چوں کہ بدھ کی مورتی کی پوجا ہوتی تھی اس لئے ''بد'' کے معنی ہی فارسی میں بت ہو گئے، اسی لیے عربی میں اس بت کو ''بد'' کہتے ہیں اور اس کی جمع ''بددہ'' آتی ہے۔[۲]

سسلی کا بت ہندوستان میں: عربوں کو یہ اچھی طرح معلوم تھا کہ بتوں اور مجسموں کے ڈھک زیادہ تر ہندوستان کے لوگ ہیں، اسی لیے یہ بات تعجب سے سنی جائے گی کہ امیر معاویہ نے (سنہ ۴۶ھ میں) جب سسلی (اٹلی) پر حملہ کیا تو وہاں سے ان کو سونے کے اسٹیچو اور مجسمے ہاتھ آئے، انہوں نے چاہا کہ نفس سونے کی مالیت کے علاوہ ان مجسموں اور اسٹیچوؤں کی ساخت اور صنعت کی قیمت بھی وصول ہو، چنانچہ انہوں نے ہندوستان بھیج کر ان کو فروخت کرنا چاہا، بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ مسلمانوں نے اس تجویز سے اختلاف کیا اور اس پر عمل نہ ہوا،[۳] لیکن بیرونی کا بیان ہے کہ وہ یہاں لائے گئے اور بیچے گئے،[۴] غالباً بیرونی کے اس بیان کا ماخذ واقدی کی روایت ہو جس کو بلاذری نے[۵] بھی فتوح البلدان میں نقل کیا ہے۔

عرب و ہند کے یہ مذہبی تعلقات بہر حال رنگ لائے، اور ایک دوسرے سے متاثر ہونے کا موقع بہم پہنچا، اور اتنا تو ضرور ہوا کہ دونوں کو ایک دوسرے کے مذہب سے

---

[۱] کتاب الہند بیرونی ص ۱۹۱۔ [۲] دیکھو فہرست ابن ندیم ص ۳۴۷ و سفرنامہ سلیمان ص ۵۵ و ۵۷ و کتاب البدء والتاریخ ص ۱۹ و ملل ونحل شہرستانی ص ۲۴۰۔ [۳] اماری سسلی، بحوالہ نہایۃ الارب ص ۴۲۶۔ [۴] کتاب الہند بیرونی ص ۶۰۔ [۵] فتوح البلدان بلاذری ص ۲۳۵ (لیڈن)

کچھ نہ کچھ واقفیت ہوئی، میرا نظریہ یہ ہے کہ اس زمانہ کے ہندوستان کا غالب مذہب بودھ تھا، اور وہی عربوں کے مذہب سے زیادہ متاثر ہوئے، یہ اثر سب سے پہلے ان راستوں میں نظر آتا ہے جو عربوں کے تجارتی گذرگاہ تھے، یعنی کارومنڈل (معبر) ملیبار اور کولم سے لے کر کچھ اور گجرات تک اور ادھر سندھ سے لے کر کشمیر تک۔

اور جنوبی ہندوستان اور ہندوستان کے جنوبی جزیروں سے عربوں کے تعلقات سب سے زیادہ رہے اور اس کا سبب تجارت کے علاوہ سراندیپ کے ایک روایتی نقش قدم کی زیارت کی کشش بھی تھی۔

عرب و ہند کا ایک متحدہ مقدس مقام: مشہور ہے کہ سراندیپ، سیلون یا لنکا جو کہو، اس کے ایک پہاڑ کی چٹان پر پاؤں کا ایک نشان ہے، خدا جانے کب سے اس پاؤں کا نشان لوگوں کی عقیدتوں کا مرکز ہے، مگر سب سے عجیب بات یہ ہے کہ یہ نقش قدم مسلمان عربوں، بودھوں اور عام ہندوؤں تینوں کی دلی عقیدتوں کا متحدہ مرکز تھا اور یہ وہ چیز ہے جس کی دوسری مثال مذہب کی دنیا میں پیش نہیں کی جاسکتی، مسلمان اس کو حضرت آدم علیہ السلام کا نقش قدم سمجھتے ہیں اور اس کی عزت کرتے ہیں، بودھ اس کو شاکیہ مونی کے قدم کا نشان اور ہندو شیر کے پاؤں کا نشان سمجھتے ہیں، اور اس کی تعظیم بجالاتے ہیں، دور دور سے لوگ اس کے جائزے کو جاتے ہیں، مسلمان عرب سیاحوں اور عراق کے درویشوں میں اس کی زیارت کا بڑا شوق تھا، تقریباً بحری سفر کے ہر عرب سیاح نے اس کا ذکر کیا ہے اور اس کی زیارت کا شوق اس کو وہاں کھینچ لایا ہے اور آخر یہی چیز اس جزیرہ میں مسلمان درویشوں کی بکثرت آمد و رفت کا ذریعہ بن گئی اور ان کی اس آمد و رفت کی کثرت کے سبب سے اسلام کے قدم وہاں جم گئے، ابن بطوطہ کے زمانہ میں یہاں کا راجہ ہندو تھا مگر نقش آدم کے بیاز کے پاس خضر کا غار بھی دکھائی دیتا تھا، کہیں بابا طاہر کا غار ملتا تھا، چیلاؤ (سالایم) میں ہاتھی بکثرت تھے، مگر ایک شیرازی بزرگ شیخ عبداللہ خفیف (المتوفی سنہ ۳۳۱ھ) کی دعا کی

برکت سے یہ کسی کو نہیں ستاتے، اسی لئے اس وقت سے جب سے ان بزرگ کی یہ کرامت ظاہر ہوئی وہاں کے بت پرست بھی مسلمانوں کا ادب کرتے ہیں، ان کو اپنے گھروں میں ٹھہراتے ہیں اور اپنے بال بچوں میں ان کو رہنے دیتے ہیں اور وہ اب تک (ابن بطوطہ کے زمانہ تک) شیخ عبداللہ خفیف کے نام کا ادب کرتے ہیں۔

ہندوستان میں اسلام: بہر حال ان مختلف تجارتی معاشرتی اور سیاسی تعلقات کا یہ نتیجہ ہوا کہ سندھ، گجرات، کارومنڈل، ملیبار، مالدیپ، سراندیپ اور جارہ میں اسلام نے اپنے قدم آہستہ آہستہ بڑھانے شروع کیے۔ ان جزیروں میں ایک طرف ہندوؤں اور دوسری طرف جینیوں کے اثر سے بودھ مت پھیلا ہوا تھا مگر صدی بصدی کے جغرافیوں اور سفرناموں کی کتابوں کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ لڑائی بھڑائی کے بغیر پورے امن اور چین کے ساتھ اسلام کے اثرات یہاں بڑھتے جاتے ہیں اور دونوں قوموں کے لئے ایک دوسرے سے واقفیت کا موقع بہم پہنچتا جاتا ہے، اس دور کے چند متفرق واقعات پر اس بیان کا خاتمہ ہے۔

پنجاب یا سرحد کے ایک راجہ کا اسلام: بلاذری جو تیسری صدی ہجری (نویں صدی عیسوی) کے اخیر کا مؤرخ ہے، بیان کرتا ہے کہ کشمیر کابل اور ملتان کے بیچ میں ایک شہر عسینان (اسیوان) [1] نام تھا، راجہ کا ایک لاڈلا بیٹا بہت سخت بیمار ہوا، راجہ نے مندر کے پجاریوں کو بلا کر کہا کہ اس کی سلامتی کی دعا مانگی جائے، پجاریوں نے دوسرے دن آ کر کہا کہ دعا مانگی گئی اور دیوتاؤں نے اس کے جیتے رہنے دیئے جانے کا وعدہ کرلیا ہے، اتفاق یہ کہ وہ لڑکا اس کے تھوڑی ہی دیر کے بعد مر گیا، راجہ کو بڑا سخت صدمہ ہوا، اسی وقت جا کر مندر ڈھا دیا، پجاریوں کی گردنیں مار دیں، پھر شہر میں جو مسلمان سوداگر تھے ان کو بلوا کر ان

---

[1] امیر خسرو نے خزائن الفتوح میں سیوان نام ایک قلعہ کا جو دہلی سے سو فرسنگ کی مسافت پر تھا اور سنہ ۷۰۸ میں سیتل چند اس کا راجہ تھا ذکر کیا ہے۔

کے مذہب کا حال دریافت کیا، انہوں نے اسلام کے عقائد بیان کیے، راجہ مسلمان ہو گیا۔[1] بلاذری کہتا ہے کہ ''یہ واقعہ خلیفہ معتصم باللہ کے زمانہ میں پیش آیا،'' معتصم باللہ کا زمانہ سنہ ۲۱۸ھ سے سنہ ۲۲۷ھ تک ہے۔

عربوں اور ہندوؤں میں مذہبی مناظرہ: یہ تعلقات اس حد تک بڑھ چکے تھے کہ عرب مسلمانوں اور ہندوؤں میں بلکہ بودھوں میں دوستانہ مذہبی مناظرے ہوتے تھے، معتصم کے باپ ہارون الرشید (دوسری صدی ہجری کا اخیر) کے زمانہ کا واقعہ ہے کہ ہندوستان کے کسی راجہ نے ہارون رشید کو کہلا بھیجا کہ ''آپ اپنے مذہب کے کسی عالم کو میرے پاس بھیج دیجئے، جو مجھ کو اسلام سے آگاہ کرے، اور میرے سامنے میرے ایک پنڈت سے بحث کرے،'' دوسری روایت یہ ہے کہ سندھ کے کسی راجہ کے یہاں ایک بودھ مذہب کا فاضل پنڈت تھا، اس نے راجہ کو آمادہ کیا تھا اور اس نے کہلا بھیجا تھا کہ مجھ سے یہ کہا گیا ہے کہ ''تلوار کے سوا آپ کے پاس آپ کے مذہب کی سچائی کی کوئی دلیل نہیں ہے، اگر آپ کو اپنے دھرم کی سچائی کا یقین ہو تو اپنے ہاں کے کسی عالم کو بھیجئے جو میرے ایک پنڈت سے آکر بحث کرے۔ خلیفہ نے ایک مقدس محدث عالم کو اس کام کے لیے بھیج دیا، پنڈت نے جب عقلی اعتراضات شروع کیے تو ملا نے جواب میں حدیثیں پیش کرنی شروع کیں، پنڈت نے کہا یہ تو ان کے لیے سند ہیں جو تمہارے مذہب کو مانتے ہوں، ایک روایت میں ہے کہ پنڈت نے پوچھا کہ تمہارا خدا اگر ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے تو کیا اپنی جیسی کسی ہستی کے بنانے پر بھی اس کو قدرت ہے؟ ان بھولے بھالے عالم صاحب نے کہا اس قسم کی باتوں کا جواب دینا ہمارا کام نہیں ہے، یہ علم کلام والوں کا کام ہے، راجہ نے ان عالم صاحب کو واپس کیا اور ہارون رشید کو کہلا بھیجا کہ پہلے تو بزرگوں کے کہنے سے مجھے معلوم ہوا اور اب اپنی آنکھوں سے دیکھ کر یقین ہو گیا کہ آپ کے پاس آپ کے مذہب کی سچائی کی کوئی دلیل نہیں، خلیفہ نے کلام والوں کو بلوا کر یہ مسئلہ ان کے سامنے پیش کیا، اس

---

[1] فتوح البلدان بلاذری ص ۴۴۶۔

جماعت کے ایک کمسن بچہ نے اٹھ کر کہا ''امیر المومنین یہ اعتراض لغو ہے، اللہ تو وہ ہے جس کو نہ کسی نے بنایا نہ پیدا کیا، وہ مخلوق نہ ہو۔ اب اگر وہ اپنے ہی جیسے کسی دوسرے کو پیدا کرے گا تو وہ اس جیسا ہو نہیں سکتا، کہ وہ بہر حال اس کا مخلوق ہی ہوگا، پھر یہ کہ بعینہ خدا کی طرح کسی دوسری ہستی ہوسکنا خدا کی توہین ہے اور خدا اپنی توہین وتحقیر پر جو محال ہے قدرت نہیں رکھتا، یہ سوال کرنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی کہے کہ خدا جاہل ہوسکتا ہے؟ خدا مر سکتا ہے؟ خدا کھا سکتا ہے؟ یا پی سکتا ہے؟ یا سو سکتا ہے؟ ظاہر ہے کہ ان میں سے خدا کچھ نہیں کر سکتا ہے کہ یہ سب اس کی ذات کی شان کے خلاف ہے، یہ جواب سب نے پسند کیا، اور خلیفہ نے چاہا کہ اس پنڈت کے مقابلہ کے لئے اسی لڑکے کو ہندوستان بھیجا جائے، مگر تجربہ کاروں نے عرض کی حضور یہ بہر حال بچہ ہے، ایک جواب بن آیا تو ضرور نہیں کہ سب جواب بن آئیں، چنانچہ ایک دوسرے مشہور متکلم کو خلیفہ نے چن کر ہندوستان بھیجا، ایک روایت میں ہے کہ وہ بودھ اس متکلم سے کبھی مناظرہ کر چکا تھا اور شکست کھا چکا تھا، اور دوسری روایت میں ہے کہ اس نے راستہ ہی میں ایک آدمی کو بھیج کر پتہ چلایا کہ صرف مذہبی ملا ہے یا عقلیات سے واقف ہے۔ جب اس کو معلوم ہوا کہ وہ عقلیات کا بڑا فاضل ہے، تو پھر دونوں روایتوں میں ہے کہ اس پنڈت نے اس کے مقابلہ میں اپنے کو کمزور پا کر اس سے پہلے کہ وہ مسلمان مناظر راجہ کے دربار میں پہنچے راستہ ہی میں اس کو زہر دلوا دیا۔[1]

اس قصہ کے تمام اجزا صحیح ہوں یا نہ ہوں مگر بہر حال اس سے اتنا ثابت ہے کہ ان دونوں قوموں کے مذہبی تعلقات اور روابط نے اس حد تک ترقی کی تھی۔

ایک مناظر راجہ: مؤرخ مسعودی جو سنہ ۳۰۳ ھ ہندوستان آیا تھا کھمبایت کے حال میں لکھتا ہے کہ:

---

[1] کتاب المنبہ والامل فی شرح کتاب الملل والنحل لاحمد بن یحییٰ المرتضی، باب ذکر المعتزلۃ مطبوعہ حیدرآباد دکن، سنہ ۱۳۱۶ھ ص ۳۱ و ۳۲۔

''میں جب سنہ ۳۰۲ھ میں یہاں آیا تو یہاں کا حاکم ایک بانیا (بنیا) تھا جو برہمنی مذہب رکھتا تھا اور وہ مہانگر کے راجہ ولبھ رائے کا ماتحت تھا، اس کو مناظرہ کا بہت شوق تھا، اس کے شہر میں باہر سے جو نئے مسلمان یا اور مذہب کے لوگ آتے تھے، وہ ان سے بحث و مناظرہ کرتا تھا'' [۱]

بودھوں سے ایک اور مناظرہ: بودھ مت کے پیرو حواس ظاہری کے علاوہ کسی اور ذریعہ علم کے قائل نہ تھے، چنانچہ بصرہ جو اس زمانہ میں (دوسری صدی کا وسط) مختلف مذہب وملت کے لوگوں کا مرکز تھا، وہاں واصل بن عطاء جہم بن صفوان اور بودھوں سے اس مسئلہ میں مناظرہ ہوا، آخر واصل نے اپنی دلیلوں سے ان کو قائل کر دیا [۲]

ایک مسلمان کا بت پرست ہو جانا: سنہ ۳۷۰ھ کا ایک عرب سیاح جو بیت المقدس کا رہنے والا تھا وہ سندھ کے بت خانوں کے تذکرہ میں کہتا ہے کہ ''ہبروا میں پتھر کی دو عجیب وغریب مورتیں ہیں، وہ دیکھنے میں سونے اور چاندی کی معلوم ہوتی ہیں، کہتے ہیں یہاں آکر جو دعا لوگ مانگتے ہیں وہ قبول ہوتی ہے، اس کے پاس ایک سبز رنگ کے پانی کا چشمہ ہے جو بالکل زنگار معلوم ہوتا ہے، زخموں کے لئے بہت مفید ہے، یہاں کے پجاریوں کا خرچ دیوداسیوں کے ذریعہ پورا ہوتا ہے، بڑے بڑے لوگ یہاں اپنی لڑکیاں لاکر چڑھاتے ہیں۔ میں نے ایک مسلمان کو دیکھا جو ان دونوں مورتیوں کی پوجا کرنے لگا تھا، پھر بعد کو نیشاپور جا کر وہ مسلمان ہو گیا، یہ دونوں مورتیں طلسماتی ہیں، کوئی ان کو ہاتھ سے چھو نہیں سکتا [۳]

قرآن پاک کا پہلا ہندی ترجمہ آج سے ایک ہزار برس پہلے: قرآن پاک کا ترجمہ لوگ آج ہندی میں کرنے لگے ہیں مگر یہ سن کر کتنا اچنبھا ہوگا کہ آج سے تقریباً ایک

---

[۱] مروج الذہب مسعودی جلد اول ص ۲۵۴ (لیڈن) [۲] شرح کتاب الملل والنحل مرتضی مطبوعہ حیدرآباد، واصل بن عطاء کا حال۔ [۳] احسن التقاسیم فی معرفۃ اقالیم بلاذری، ص ۴۸۳۔

ہزار برس پہلے قرآن پاک کا ہندی میں یا سندھی ایک ہندو راجہ کے حکم سے کیا گیا تھا، سنہ ۲۷۰ھ میں الرا (الوراواقع سندھ؟) کے راجہ مہروک نے جس کا راج کشمیر بالا (کشمیر) اور کشمیر زیریں (پنجاب) کے بیچ میں ہے اور جو ہندوستان کے بڑے راجاؤں میں ہے، اس نے منصورہ (واقع سندھ) کے امیر عبداللہ بن عمر کو لکھ بھیجا کہ کسی ایسے شخص کو میرے پاس بھیجئے جو ہندی میں ہم کو اسلام کا مذہب سمجھا سکے۔ منصورہ میں عراق کا ایک مسلمان تھا جو بہت تیز طبیعت، سمجھدار اور شاعر تھا اور چوں کہ ہندوستان میں پلا تھا اس لیے یہاں کی مختلف زبانیں وہ جانتا تھا، امیر نے اس سے راجہ کی خواہش کا ذکر کیا، وہ تیار ہوا، اس نے ان کی زبان میں ایک قصیدہ لکھ کر راجہ کو بھیجا، راجہ نے اس قصیدہ کو سنا تو بہت پسند کیا اور اس کو سفر خرچ بھیج کر اپنے پاس بلوایا، وہ راجہ کے دربار میں تین برس رہا اور اس کی خواہش سے اس نے قرآن کا ہندی زبان میں ترجمہ کیا۔ راجہ روزانہ ترجمہ سنتا تھا اور اس سے بے حد متاثر ہوتا تھا۔[1]

ایک گجراتی راجہ کا بے مثال مذہبی انصاف: چھٹی صدی عیسوی کے آخیر میں جب سلطان غوری کے بعد دہلی میں شمس الدین ایلتمش اور سندھ میں ناصر الدین قباچہ حکومت کرتے تھے، محمد عوفی نام ایک فاضل بخارا سے چل کر ہندوستان آیا تھا اور اس نے غالباً سندھ کے کسی ساحل منصورہ یا دیبل سے نکل کر خلیج، فارس سواحل عرب، اور ہندوستان کی مختلف بندرگاہوں کی سیاحت کی تھی، چنانچہ اس سلسلہ میں وہ کھنبایت بھی پہنچا تھا، اس کی دو کتابیں اس وقت باقی ہیں، ایک فارسی شاعروں کا تذکرہ جس کا نام لباب الالباب ہے، جو ناصر الدین قباچہ کے وزیر کے نام لکھی ہے اور وہ دو جلدوں میں گب میریز لندن سے شایع ہو چکی ہے، دوسری کتاب اس سے زیادہ بڑی ہے، اس کا نام جامع الحکایات ولامع الروایات ہے، اس میں مصنف نے کچھ اپنے کانوں سنے، اور اپنی آنکھوں دیکھے اور کچھ دوسری کتابوں میں پڑھے ہوئے واقعوں اور قصوں کو مختلف عنوانوں میں ذکر کیا ہے۔ یہ کتاب سلطان شمس الدین ایلتمش کے

---

[1] عجائب الہند ص ۴ (لیڈن)

وزیر قوام الدین جنیدی کے نام سے لکھی ہے، اور اب تک حلیۂ طبع سے محروم ہے، اس کا ایک قلمی نسخہ دار المصنفین کے کتب خانہ میں بھی موجود ہے۔

محمد عوفی نے اس کتاب کے دوسرے باب ''دوذکر ملوک طوائف واحوال ایشاں'' میں ایک عجیب وغریب قصہ لکھا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندو مسلمانوں کے تعلقات اس ملک میں عربوں کے عہد میں کیسے تھے، اور ہندو راجہ اپنی مسلمان رعایا کے ساتھ کس طرح انصاف سے پیش آتے تھے، محمد عوفی کا یہ سفر سنہ ۶۶۵ ھ سے پہلے ہوا تھا، اور جو واقعہ اس نے بیان کیا ہے وہ یقیناً اس سے پہلے کا ہے اور یہ وہ زمانہ ہے جب گجرات کی طرف صرف ایک سلطان محمود اور دوسو برس کے بعد قطب الدین ایبک کے سرسری دھاروں کے سوا وہاں کسی اسلامی حکومت کا نام ونشان بھی نہ تھا۔

محمد عوفی کہتا ہے کہ'' مجھے ایک دفعہ کھنبایت جانے کا اتفاق ہوا، جو سمندر کے کنارے ایک شہر ہے، اور وہاں دیندار مسلمانوں کی ایک جماعت آباد ہے، جو مسافروں کی خوب خاطر تواضع کرتی ہے، اور یہ شہر نہروالہ (احمد آباد گجرات کے قریب) کی سلطنت میں ہے اور یہاں کچھ مسلمانوں اور کچھ ان کے مخالفوں کی آبادی ہے، میں جس زمانہ میں یہاں آیا ایک قصہ سنا جو نوشیرواں کے اوپر والے قصہ سے ملتا جلتا ہے، اور وہ یہ ہے کہ راجہ جنک کے راج کے زمانہ میں یہاں ایک مسجد تھی جس میں منارہ تھا، اس پر چڑھ کر مسلمان اذان دیتے تھے، پارسیوں نے ہندوؤں کو بھڑکا کر مسلمانوں سے لڑا دیا، ہندوؤں نے منارہ توڑ دیا اور مسجد کو مع اسی (۸۰) مسلمانوں کے شہید کر ڈالا، مسجد کا امام وخطیب جس کا نام علی تھا، یہاں سے بھاگ کر نہروالہ چلا گیا، وہاں جا کر راجہ کے درباریوں اور افسروں سے مل کر فریاد کی، مگر کسی نے توجہ نہ کی، امام نے یہ حال دیکھ کر تدبیر یہ کی کہ ہندی (غالباً گجراتی) میں پورا واقعہ ایک قصیدہ میں نظم کیا، اور خبر رکھی کہ راجہ شکار کو کب جاتا ہے، جب شکار کا دن آیا امام وہ قصیدہ لے کر راستہ میں ایک جھاڑی میں چھپ کر بیٹھ گیا، جب راجہ ادھر سے گذرا، امام

فریادی بن کر سامنے آ گیا اور دہائی دی، اور عرض کی کہ اس کا یہ قصیدہ سن لیا جائے، راجہ نے ہاتھی روک کر اس کی منظوم عرض داشت سنی اور بہت متاثر ہوا، اور قصیدہ کو اس کے ہاتھ سے لے کر ایک افسر کے سپرد کر دیا، کہ فرصت کے وقت مجھے یہ پھر دکھایا جائے، راجہ اسی وقت شکار سے واپس آ گیا اور وزیر کو بلوا کر کہا کہ میں تین دن تک محل میں رہوں گا اور آرام کروں گا، ان تین دنوں کے اندر کسی کام کے لئے مجھے تکلیف نہ دینا، سب کام تم بطور خود انجام دینا، یہ کہہ کر راجہ محل میں چلا گیا اور رات کو ایک تیز سانڈنی پر بیٹھ کر تن تنہا کھنبایت کی طرف روانہ ہو گیا، نہروالہ سے کھنبایت ۴۰ فرسنگ ہے، مگر راجہ نے ایک دن رات میں اس راستہ کو طے کیا اور وہاں بھیس بدل کر ایک سوداگر کی صورت میں اترا، اور گلی کوچہ بازار میں ہر جگہ پھر کر تحقیق کی، اور راستہ چلتوں کی باتیں سنیں، ہر ایک کی زبان سے یہی سنا کہ بیچارے مسلمانوں کو بے گناہ مارا گیا، اور ان پر بڑا ظلم ہوا، راجہ ہر طرح واقعہ کی تحقیق کر کے ایک لوٹے میں سمندر کا پانی بھر کر اس کا منہ بند کر کے اپنے ساتھ لیا، اور پھر اسی طرح چوبیس گھنٹے میں سانڈنی پر اپنی راجدھانی کو واپس آ گیا، صبح کو راجہ نے دربار منعقد کیا، مقدمات سنے اور اسی کے ساتھ مسجد کے اس امام کو یاد کیا، جب وہ دربار میں حاضر ہوا تو راجہ نے اس کو حکم دیا کہ تم اپنی عرض داشت پڑھ کر سناؤ، امام نے جب اس کو پڑھا تو ہندو درباریوں نے کہا یہ مقدمہ جھوٹا ہے، اور یہ دعویٰ سرے سے غلط ہے، راجہ نے آبدار کے ہاتھ سے وہ لوٹا منگوایا اور سب کو تھوڑا تھوڑا اس کا پانی پلایا، جس نے پیا وہ اس کو گھونٹ نہ سکا، اور کہا یہ تو سمندر کا کھارا پانی ہے، راجہ نے کہا مجھ کو چونکہ اس معاملہ میں کسی دوسرے پر بھروسہ نہ تھا کہ ''اختلاف دین درمیان بود'' کہ یہ مذہبی اختلاف کا معاملہ تھا، اس لیے میں نے خود جا کر اس کی تفتیش کی اور مجھ پر ثابت ہو گیا کہ یہ مسلمان بے شک مظلوم ہیں اور ان پر ظلم ہوا ہے، میرے راج میں کسی جماعت پر جو میرے سایہ میں ہو ایسا ظلم نہیں کیا جا سکتا، اس کے بعد حکم دیا کہ برہمنوں اور پارسیوں میں سے جو اس جرم کے مرتکب ہوئے ہیں دو دو کو سزا دی جائے

اور مسلمانوں کو ایک لاکھ بالوترا (گجراتی سکہ) تاوان دلوایا، تاکہ اس سے وہ مسجد اور منارہ دوبارہ بنوالیں، اور امام کو خلعت اور انعام دیا، چنانچہ وہ مسجد دوبارہ بنی اور یہ انعامات اس میں یادگار کے طور پر رکھے گئے، چنانچہ ہر سال عید کے دن ان کو نکال کر سب کو دکھایا جاتا ہے۔

محمد عوفی کہتا ہے کہ ''آج تک (سنہ ۶۶۵ھ) یہ چیزیں وہاں رکھی ہیں، اور وہ پرانی مسجد اور منارہ بھی باقی تھا، مگر کچھ دن ہوئے بالو (یا بالا) کی فوج نے گجرات پر حملہ کیا تو اس مسجد کو ویران کر دیا، آخر سعید بن شرف (کسی عرب تاجر) نے اپنے سرمایہ سے اس کو دوبارہ بنوایا ہے، اور اس کے چاروں طرف چار سنہرے گنبد بنوائے ہیں، اور اسلام کی یہ یادگار اس ہندو ملک میں آج تک قائم ہے''۔

مسلمانوں میں وحدۃ الوجود: وحدۃ الوجود کا مسئلہ کسی نہ کسی شکل میں ہر قوم میں موجود تھا، بعض یونانی فلاسفر ایک معنی میں اس کے قائل تھے، اسکندریہ کا نوافلاطونی فرقہ اس کا معتقد تھا، پرانے یہودیوں اور عیسائیوں میں بھی یہ خیال موجود تھا، ہندو ویدانت کی پوری عمارت اسی تخیل پر قائم ہے، اور بعض مسلمان صوفیوں میں بھی اس کی پرجوش تلقین پائی جاتی ہے، گو کہ وحدۃ الوجود کے اندر خود بہت سے مختلف معنی ہیں اور اس ایک وحدت کی بھی بکثرت تشریحیں کی گئی ہیں، یہاں تک کہ ایک تشریح کے مطابق وہ ''حلول'' کا مرادف اور ہم معنی بن گیا ہے۔

بہرحال یہاں اصل مسئلہ سے غرض نہیں، بلکہ اس کی تاریخی حیثیت سے بحث ہے، یہ سوال اکثر اٹھا ہے کہ مسلمان صوفیوں میں یہ تخیل کہاں سے آیا؟ جہاں تک ہم سے تحقیق ہو سکی ہے ہمارے پاس کوئی دلیل ایسی نہیں ہے جس سے یہ ثابت ہو سکے کہ ہندو ویدانت کا ترجمہ عربی زبان میں ہوا ہے، حالاں کہ اسلام میں اس تخیل کا نفاذ تیسری صدی کے آخر سے یعنی حسین بن منصور حلاج کے زمانہ سے ہے اور اس کا کمال پانچویں صدی ہجری میں محی الدین بن عربی کے زمانہ میں نظر آتا ہے، اس میں تو کوئی شک نہیں کہ

ہندوستان میں آنے کے بعد ہندو ویدانیتوں کے تخیل سے مسلمان صوفیوں پر اثر پڑا ہے [۱] مگر اسلامی تصوف میں اس تخیل کا اثر اس سے پہلے معلوم ہوتا ہے، خصوصاً جب یہ واقعہ ہے کہ مسلمانوں میں محی الدین ابن عربی ہی سب سے پہلے شخص ہیں جنہوں نے اس عقیدہ کی سب سے پر جوش حمایت کی ہے اور وہ اسپین کے باشندے تھے اور کبھی ہندو فلاسفی سے ان کو دو چار ہونے کا موقع نہیں ملا، اس لیے یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ ہندو ویدانت سے نہیں بلکہ نوافلاطونی فلسفہ سے متاثر ہوئے تھے۔

لیکن جہاں تک حسین بن منصور حلاج کا تعلق ہے یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ جس وحدۃ الوجود کا مذہبی تھا وہ معتبر محتاط مسلمان صوفیوں کا وحدۃ الوجود نہیں، بلکہ وہ حلول یعنی ایک قسم سے ہندوؤں کے اوتار کے مسئلہ کا قائل تھا۔ اس کی تفصیل اس کے پرانے تذکرہ نویسوں نے پوری طرح کی ہے اور خود اس کی تصنیف کتاب الطّواسین سے بھی ثابت ہے، اس کے بعد یہ بھی ثابت ہے کہ وہ ہندوستان کے جادو منتر اور کرتب کو سیکھنے یا جیسا کہ بعض کہتے ہیں کہ اپنے مذہب کی تبلیغ کے لئے ہندوستان آیا تھا، اس لئے عجب نہیں کہ وہ یہیں سے اپنا مسئلہ وحدۃ الوجود عراق لے گیا ہو [۲]

---

[۱] چنانچہ غالباً آٹھویں صدی ہجری میں بنگال کے ایک نومسلم پنڈت اور ایک صوفی عالم نے مل کر سنسکرت کی کتاب امرت کنڈ کا عربی میں ترجمہ ''عین الحیواۃ'' کے نام سے کیا، پھر اس سے فارسی میں اور اب فارسی سے اردو میں اس کا ترجمہ ہوا ہے، اور دارا نے اپنے زمانہ میں سر اکبر کے نام سے جوگ بصمد کا ترجمہ فارسی میں کیا۔

[۲] حلاج کی کتاب الطّواسین فرانس کے صوفی مستشرق لوئی مسیگنان Luis Masaignan نے سنہ ۱۹۱۴ء میں پیرس سے شائع کی ہے، اور اسی کے ساتھ مستقل جلد میں حلاج کے حالات کے متعلق قدیم بیانات کو بھی یکجا کر دیا ہے، حلاج کے ہندوستان آنے کا واقعہ اسی کتاب میں ابن باکویہ صوفی شیرازی کی کتاب کے اقتباسات میں مذکور ہے، دیکھو صفحہ ۳۱ و ۴۳ (مطبوعہ پیرس)

ہندوؤں کی وحدت تنزیہی

اس کے بر خلاف قیاسات اس ثبوت میں بھی ہیں کہ ہندوؤں میں وحدت تنزیہی کا تخیل اور بت پرستی کے خلاف جذبہ اسلام کا نتیجہ ہے۔ یہ مضمون خود بڑھتی وسعت رکھتا ہے اور وہ کسی دوسری بحث کے ضمیمہ کے طور پر ادا نہیں ہوسکتا۔

خاتمہ

ان چند صفحوں میں عرب و ہند کے مذہبی تعلقات کا جو آئینہ تیار کیا گیا ہے خوب غور کر کے دیکھو کہ ان دونوں قوموں نے باوجود شدید مذہب پرست ہونے کے کہیں اس شیشہ میں بال آنے دیا ہے؟ کیا جو پہلے گذر چکا وہ آیندہ نہیں ہوسکتا؟

پانچواں باب

ہندوستان میں مسلمان
(فتوحات سے پہلے)
ماخذ

علاوہ ان کتابوں کے جن کا ذکر اوپر گذر چکا ذیل کے معلومات کے لئے سندھ کی فارسی تاریخوں سے بھی فائدہ اٹھایا گیا ہے، افسوس ہے کہ یہ کتابیں اب تک چھپی نہیں ہیں، مختلف کتب خانوں میں قلمی موجود ہیں، البتہ الیٹ صاحب نے اپنی تاریخ کی پہلی جلد میں ان کے ضروری اقتباسات دے دیے ہیں اور وہی میرے پیش نظر ہیں، ان کتابوں کے نام یہ ہیں:-

۱۔ چچ نامہ

یہ تاریخ السند الہند کے نام سے عربی زبان میں سندھ کی سب سے پرانی تاریخ تھی، محمد علی بن حامد بن ابوبکر کوفی نے ناصرالدین قباچہ کے عہد میں سنہ ۶۱۳ھ (۱۲۱۶ء) میں اوچ (سندھ) میں بیٹھ کر فارسی میں ترجمہ کیا، اس کی اصل عربی نہیں ملتی، مگر صرف محمد بن قاسم کی موت اور راجہ داہر کی لڑکی کی قید کا واقعہ اس میں افسانہ ہے، باقی اکثر باتیں اس میں ایسی ہیں جن کی پرانی عربی تاریخوں سے تائید ہوتی ہے۔

۲۔ تاریخ معصومی

یہ میر محمد معصوم کی تاریخ سندھ ہے، اکبر کے زمانہ میں سنہ ۱۰۱۱ھ میں لکھی گئی۔

۳۔ تاریخ طاہری

میر طاہر بن سید حسن قاندھیاری نے سندھ کے قیام کے زمانہ میں سنہ ۱۰۳۰ھ (۱۶۲۴ء) میں سندھ کی یہ تاریخ لکھی۔

۴۔ بیگ قرنامہ

یہ کتاب شاہ قاسم خاں بن سید قاسم بیگ قر کے نام سے سنہ ۱۰۱۷ھ سے سنہ ۱۰۳۶ھ تک میں لکھی گئی۔

۵۔ تحفۃ الکرام

یہ سب سے آخری کتاب ہے، علی شیر نے سنہ ۱۱۸۱ھ (۱۷۶۷ء) میں لکھی ہے۔

اس خطبہ میں جن معلومات کو مرتب کیا گیا ہے ان کے متعلق اردو کی دو کتابیں بھی خاص طور سے ذکر کے قابل ہیں۔

۱۔ تاریخ سندھ ۔ مولانا عبدالحلیم شرر لکھنوی نے سنہ ۱۹۰۹ء میں الیٹ کی تاریخ سندھ جلد اول کے معلومات اور ماخذوں سے اور بعض اپنی تحقیقات سے اسلامی سندھ کی نہایت مبسوط تاریخ دو جلدوں میں لکھی ہے، تمام ضروری معلومات ان میں فراہم ہیں، مگر یہ کتاب نئی ترتیب کی محتاج ہے، ساتھ ہی مولانا نے الیٹ پر اس میں بے حد بھروسہ کیا ہے، اور مشکلات کے حل میں بعض ایسے قیاسات سے کام لیا ہے جو میرے نزدیک صحیح نہیں جیسا کہ آگے معلوم ہوگا۔ کتابوں کے حوالوں میں نہ صفحوں کا حوالہ دیا ہے اور نہ جلد اور باب کا اشارہ کیا ہے، اس لئے اس کے واقعات کی تصدیق و تطبیق سخت مشکل ہے۔

۲۔ دوسری قابل ذکر اردو کتاب پیرزادہ محمد حسین صاحب دہلوی، ایم اے، مرحوم کے ابن بطوطہ کے سفرنامہ دوسری جلد متعلقہ ہند کا اردو ترجمہ ہے، اس میں اصل چیز ابن بطوطہ کے بیان کردہ مقامات اور اشخاص پر مترجم کے حواشی ہیں، جو انگریزی ترجمہ اور ذاتی تلاش پر مبنی ہیں۔

ہمارے اسکولوں اور کالجوں میں ہندوستان کی جو تاریخ پڑھائی جاتی ہے وہ بالکل ایک خاص مقصد کو سامنے رکھ کر پڑھائی جاتی ہے اور اسی مقصد کو سامنے رکھ کر تاریخ ہند کی کتابیں انگریزیں میں تصنیف کی جاتی ہیں۔ ان کتابوں میں قدیم ہندوستان کی تاریخ کو کہنا چاہیے کہ گویا وہ سکندر اور اس کے جانشینوں کی تاریخ کا ایک ٹکڑا ہے، اسی حملہ سے ہندوستان کی کایا پلٹ ہوئی، اس کو علم و فن کی دولت ملی، تاریخ کی دنیا میں اس نے زندگی پائی، سکندر کے حملہ اور سفر کے ایک ایک راستہ کا پتہ نکالا، بگڑتے ہوئے یونانی ناموں کو درست کرنا، اور ان کے الٹے پلٹے بیانوں کو مرتب اور منظم کر کے پیش کرنا ہندوستان کی پرانی تاریخ ہے، یہی مؤرخ جب اسلام اور ہندوستان کے تاریخ کا آغاز کریں گے تو چند سطروں میں وحشی عربوں کا اور پھر (نعوذ باللہ) ایک خونخوار پیغمبر کا اور اس کے جانشینوں کے بے پناہ حملوں کا ذکر کر کے صفحہ دو صفحہ میں عرب سے سیدھے غزنی پہنچ جائیں گے۔ یہاں محمود کی فوج ہندوستان پر جہاد کرنے کے لئے تیار ملتی ہے اور اس کو لے کر وہ فوراً پنجاب، سندھ اور گجرات پہنچ جاتے اور لوٹ مار کر کے اس کو واپس لے جاتے ہیں، پھر ڈیڑھ سو برس کے بعد شہاب الدین غوری کو ہندوستان لاتے ہیں اور اس کے بعد سے قرون وسطیٰ کی تاریخ ہند کا سلسلہ آگے چلاتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اس دوری اور بعد مسافت کے باوجود گو یونان کی سرحد ہندوستان سے آکر مل جاتی ہے، لیکن اس قرب اور نزدیکی کے ہوتے ہوئے بھی کیا ہندوستان اور افغانستان سے ایک طرف اور مکران اور سندھ سے دوسری طرف کوئی سرحد نہیں ملتی تھی؟ اور ان ملکوں میں آپس میں صلح و جنگ اور لڑائی اور میل کے تعلقات نہ تھے؟ اور ان کا سلسلہ ان سرحدی قبیلوں کے مسلمان ہونے سے پہلے قائم تھا یا نہیں؟ آخر ان کی تحقیق اور تفتیش اور ان کی ٹوٹی ہوئی کڑیوں کو باہم جوڑنا اور ملانا اور ان سے نتیجہ نکالنا ضروری ہے یا نہیں؟

ان کتابوں کے پڑھنے اور ان تاریخوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ محمود غزنوی

تک ایک بھی مسلمان ملیچھ کا قدم اس پاک پوتر بھومی پر نہیں پڑا تھا اور مسلمانوں اور ہندوؤں میں آپس میں کسی قسم کا تعلق تھا، نہ جان پہچان تھی، نہ آمد و رفت تھی، حالاں کہ گذشتہ صفحوں کے پڑھنے والوں کو یہ اچھی طرح معلوم ہو گیا ہوگا کہ ان دونوں قوموں کے درمیان کتنے متعدد اور مختلف پہلوؤں کے تعلقات قائم تھے۔

ہندوستان اور درۂ خیبر پار کے ملکوں کے درمیان ہمیشہ سے صلح و جنگ کے متواتر تعلقات قائم تھے، اسلام سے پہلے ان ملکوں کی کیفیت یہ تھی کہ جب کبھی کابل شاہ کو قوت حاصل ہوئی اس نے ویہند اور اور پشاور تک قبضہ کر لیا اور جب رائے لوہاور کو موقع ملا کابل و قندھار تک اپنی سرحد قائم کر لی، یہی حال سندھ کی طرف تھا، کبھی شہنشاہ ایران نے مکران سے دریائے سندھ تک قبضہ کر لیا اور کبھی سندھ کے راجہ نے بلوچستان و مکران لے کر ایران کی سرحد سے سرحد ملا دی، یہی کیفیت ساتویں صدی عیسوی تک تھی، جب ادھر اسلامی فتوحات نے قدم بڑھانا اور ان ملکوں کے قبیلوں اور قوموں نے اسلام قبول کرنا شروع کیا ادھر سب سے پہلی اسلام کی سلطنت سامانیہ حکومت ہے، جس نے بخارا کو اپنا دارالحکومت بنایا، لیکن اس کے زمانہ میں بھی کابل سے آگے توجہ نہ کی جا سکی۔ اس کے بعد صفاریہ حکومت جو چند روزہ قائم ہوئی تھی اس نے کابل و قندھار سے آگے اپنی نظر بڑھائی۔ خلافت عباسیہ نے سندھ کی برائے نام حکومت بھی اس کے سپرد کر دی تھی، اس کے بعد سامانیہ حکومت کے حدود سے ہٹ کر اس کے ایک ترک افسر الپ تگین نے اس لئے تاکہ وہ اپنے آقا کے فوجی حملہ اور سزا سے محفوظ رہے اس دور دست علاقہ کو اپنی کوششوں کی جولانگاہ اور غزنین کو اپنی خود مختار حکومت کا مرکز بنایا۔ یہ چوتھی صدی ہجری کے بیچ کا واقعہ ہے، اسی حکومت غزنین کا دوسرا گھر یا تیسرا تاجدار سلطان محمود غزنوی ہے، اس نے اپنی ۳۳ برس کی حکومت میں غزنین کی چاروں طرف کے ملکوں اور حکومتوں کو خواہ وہ مسلمان ہوں یا نہ ہوں اپنے بے پناہ حملوں سے مجبور کر کے اپنی چھوٹی سی موروثی حکومت میں داخل کر کے ایک عظیم الشان

سلطنت کی بنیاد ڈال دی۔ اس نے غزنین کی ایک طرف کاشغر کی اسلامی ایلخانی حکومت کو، دوسری طرف خود اپنے اس سامانیوں کی حکومت کو، تیسری طرف دیلمیوں کی حکومت کو، طبرستان کی حکومت آل زیار کو، مشرق کی سمت میں تیموریوں کی سرزمین کو جو اب تک نہ تو مسلمان تھے اور نہ کبھی کسی سلطنت کے ماتحت رہے تھے اور اس کے بعد مشرقی سمت میں ملتان اور سندھ کے عرب امیروں کو، پھر لاہور اور ہندوستان کے بعض راجاؤں کو زیر و زبر کر کے غزنین کی سلطنت قائم کی۔ ان میں سے ہندوستان اور غور کے سوا باقی کل خالص مسلمانوں کی سلطنتیں تھیں۔

چوں کہ اس بیان کی تفصیلات میرے مضمون کے دائرہ سے باہر ہیں اس لئے صرف سلسلہ کے لئے یہ چند سطریں لکھ کر تاریخ ہند کے علمبرداروں کی توجہ ادھر ملتفت کرتا ہوں کہ وہ محمود سے پہلے کے افغانستان اور ہندوستان کے تعلقات پر تلاش و محنت سے مواد فراہم کریں اور کسی نئے نتیجہ سے باخبر کریں۔

اوپر کی تفصیل سے یہ اندازہ ہوگا کہ افغانی کوہستان کے دروں سے مسلمانوں کی ہندوستانی راجاؤں کے ساتھ قوت آزمائی محض مذہبی جذبہ کا نتیجہ نہ تھی، بلکہ صدیوں کی قومی لڑائیوں کے سلسلہ کی یہ ایک کڑی ہے۔

بہر حال یہ تو شمالی ہندوستان کا حال تھا لیکن جنوبی ہندوستان کی کیفیت دوسری تھی۔ سنہ ۴۱۶ھ (سنہ ۱۰۶۴ء) میں محمود غزنوی سنہ ۵۷۴ھ (سنہ ۱۱۶۸ء) میں شہاب الدین غوری اور سنہ ۵۹۲ھ (سنہ ۱۱۹۶ء) میں قطب الدین ایبک گجرات پر دھاوے کر کے بادل کی طرح آئے اور آندھی کی طرح نکل گئے۔ البتہ اس کے سو برس بعد باگھیلہ راجہ اور اس کے وزیر مادھو کی باہمی رنجش اور آزردگی اور مادھو کی دعوت نے سب سے پہلے علاؤالدین خلجی کو سنہ ۶۹۷ھ (سنہ ۱۲۹۷ء) میں گجرات کا حاکم بنا دیا، علاؤالدین خلجی نے گجرات سے لے کر سمندر کے کنارے کنارے کارومنڈل تک کا علاقہ فتح کیا۔ مگر فتوحات کا یہ سلسلہ اس جہاز

کی طرح تھا جو اپنے زور میں سمندر کے سینہ کو چاک کر کے آگے بڑھا جاتا ہے لیکن جیسے ہی وہ ایک قدم آگے بڑھتا ہے پیچھے پانی سمٹ کر ایسا ہو جاتا ہے کہ پانی کی سطح میں اس غیر معمولی شگاف کا نشان بھی نہیں ملتا۔ یہ گویا خلجی سپہ سالار کی ایک فوجی سیر و سیاحت تھی، اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ سنہ ۷۰۹ھ (سنہ ۱۳۰۹ء) میں اس کے ایک افسر ملک کافور نے کرناٹک فتح کر لیا۔ لیکن اس کے بعد سنہ ۷۲۷ھ (۱۳۲۳ء) میں دکن کی سمت میں بیجانگر کی عظیم الشان ہندو سلطنت قائم ہوگئی، جو صدیوں تک جنوبی ہند کو شمالی ہند کے مسلمان حملہ آوروں سے بچاتی رہی اور ملک کافور کے فتوحات کے سلسلہ میں معبر (کارومنڈل) میں جو ایک چھوٹی سی اسلامی حکومت قائم ہوگئی تھی، وہ بھی چالیس برس بعد مٹ کر بیجانگر کے دائرۂ حکومت میں داخل ہوگئی۔

مگر اس لڑائی بھڑائی جنگ و جدل فوج کشی اور حملہ آوری کے حدود سے دور اور الگ ان مسلمان عربوں اور عراقیوں کی آبادیاں تھیں، جو خشکی کی راہ اتر سے دکھن نہیں آئے تھے، بلکہ سمندر کے کناروں سے چل کر ان علاقوں میں آباد ہوئے تھے اور آتے جاتے رہتے تھے۔

یہ بالکل کھلی ہوئی بات ہے کہ شمالی ہند سے پہلے جنوبی ہند میں مسلمانوں کی نوآبادیاں قائم ہوئیں اور اس کا سلسلہ درحقیقت تجارتی آمد و رفت سے وابستہ ہے، اس علاقہ میں نہ صرف یہ کہ باہر سے مسلمان آ کر آباد ہوئے بلکہ خود ملک کے باشندوں نے بھی اسلام قبول کرنا شروع کر دیا تھا، اس اثر اور نتیجہ کے پیدا ہونے کے متعلق مختلف روایتیں مشہور ہیں اور تاریخ کی کتابوں اور سفرناموں میں لکھی ہوئی ہیں، ان کا مشترک مضمون یہ ہے کہ یہ اثر دو طرفہ کششوں کا نتیجہ تھا، ایک تو عرب تاجروں کی آمد و رفت اور دوسرے سراندیپ کے نقش قدم کی زیارت کو آنے والے صوفیوں اور درویشوں کی کرامت۔

مسلمانوں کا پہلا مرکز سراندیپ

فرشتہ نے لکھا ہے کہ ''چوں کہ اسلام کے پہلے ہی سے عرب ان جزیروں میں تاجرانہ آتے تھے اور یہاں کے لوگ عرب جایا کرتے تھے، اس لئے سراندیپ کے راجہ کو

اسلام اور مسلمانوں کا حال سب سے پہلے معلوم ہوا اور صحابۂ کرام ہی کے زمانہ میں سنہ ۴۰ھ میں (ساتویں صدی عیسوی کے شروع ہی میں) وہ مسلمان ہوگیا[1] فرشتہ نے اپنے ماخذ کا حوالہ نہیں دیا ہے، مگر ایک قدیم العہد تصوف عجائب الہند سے جو تقریباً سنہ ۳۰۰ھ میں لکھی گئی ہے، اس روایت کی پوری تصدیق ہوتی ہے، بزرگ بن شہریار ناخدا جو ان جزیروں کا جہاز راں تھا، سراندیپ کے بیان میں لکھتا ہے:-

> ''ہندوستان کے پجاریوں سنیاسیوں اور جوگیوں کی کئی قسمیں ہیں، ان میں سے ایک ''بیکور''[2] ہوتے ہیں، جن کی اصل سراندیپ سے ہے، یہ مسلمانوں سے بہت محبت کرتے ہیں اور ان کی طرف بہت میلان رکھتے ہیں، وہ گرمی کے موسم میں ننگے رہتے ہیں، صرف چار انگل کی لنگوٹی کمر میں ایک ڈوری لگا کر باندھ لیتے ہیں اور جاڑوں میں گھاس کی چٹائی اوڑھ لیتے ہیں اور ان میں سے بعض ایک ایسا کپڑا پہنتے ہیں جس کو مختلف رنگوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں سے جوڑ کر سی لیتے ہیں، اور بدن پر مردوں کی جلی ہوئی ہڈیوں کی راکھ مل لیتے ہیں اور سر اور داڑھی مونچھ کے بال منڈاتے ہیں اور دوسرے بال بڑھاتے ہیں، گلے میں انسان کی ایک کھوپڑی لٹکائے رہتے ہیں اور عبرت اور خاکساری کے لئے اس میں کھاتے ہیں''۔

اس تصویر سے اور اس گروہ کے متعلق دوسرے عرب سیاحوں کے بیانات سے اس تسلیم میں کوئی شبہ نہیں رہتا کہ یہ لوگ بودھ مذہب کے پیرو ہوں گے۔

ہمارا ناخدا پھر اپنی کہانی شروع کرتا ہے:-

---

[1] فرشتہ جلد دوم مقالہ ہشتم سندھ ص ۳۱۱ نولکشور۔ [2] غالباً یہی لفظ ہے جو کتاب البدء التاریخ اور سلیمان تاجر کے سفرنامہ وغیرہ میں کہیں بیکر جین اور کہیں بیکرتیں کے نام سے ملتا ہے۔

''سراندیپ اور اس کے آس پاس والوں کو پیغمبر اسلام کی بعثت کا حال جب معلوم ہوا تو انہوں نے اپنے میں سے ایک سمجھ دار آدمی کو تحقیق حال کے لئے عرب روانہ کیا، وہ رکتے رکاتے جب مدینہ پہنچا تو رسول اللہ ﷺ وفات پا چکے تھے، ابوبکر صدیقؓ کی خلافت بھی ختم ہو چکی تھی اور حضرت عمرؓ کا زمانہ تھا۔ وہ ان سے ملا اور رسالت مآب ﷺ کے حالات دریافت کیے، حضرت عمرؓ نے بتفصیل بیان کئے، جب وہ واپس ہوا تو مکران (بلوچستان کے پاس) پہنچ کر مر گیا۔ اس کے ساتھ اس کا ایک ہندو نوکر تھا، وہ صحیح سلامت سراندیپ پہنچ گیا، اور اس نے رسول اللہ ﷺ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کا سارا حال بیان کیا، اور ان کے فقیرانہ اور درویشانہ طور وطریق کا ذکر کیا اور بتایا کہ وہ کیسے متواضع اور خاکسار ہیں اور پیوند لگے ہوئے کھڑے پہنتے ہیں، اور مسجد میں سوتے ہیں، اب یہ لوگ مسلمانوں کے ساتھ جو اس قدر محبت اور میلان رکھتے ہیں وہ اسی سبب سے ہے''۔[1]

اس روایت کی تیسری تائید اس واقعہ سے ہوتی ہے کہ پہلی صدی ہجری کے آخر میں امویوں کی طرف سے حجاج عراق کا گورنر تھا اور جزائر ہند کی طرف عراق ہی کی بندرگاہ سے جہازات آتے جاتے تھے، تو سراندیپ کے (جس کو عرب یاقوت کا جزیرہ بھی کہتے تھے) راجہ نے مسلمانوں کے ساتھ اپنی دوستی اور محبت کے اظہار کے طور پر ایک جہاز میں دوسرے تحفوں کے ساتھ ان مسلمان عورتوں اور لڑکیوں کو عراق روانہ کیا جن کے باپ وہاں تجارت کرتے تھے اور وہیں ان کو مسافرت میں بے والی وارث چھوڑ کر مر گئے تھے[2] اس واقعہ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ پہلی ہی صدی ہجری میں سراندیپ میں مسلمانوں کی نوآبادی

---

[1] عجائب الہند ص ۱۵۵۔۱۵۷۔ [2] فتوح البلدان بلاذری (سنہ ۲۷۹) ص ۴۳۵ (لیڈن)

قائم ہو چکی تھی، ابوزید سیرافی (سنہ ۳۰۰ھ) نے تیسری صدی ہجری کے اخیر میں یہاں عرب سوداگروں کے قیام کا اور آمد و رفت کا تذکرہ کیا ہے۔[1]

الغرض مختلف روایتوں سے اتنا مشترک نتیجہ نکلتا ہے کہ ان اطراف میں اسلام اور عربوں کی پہلی نوآبادی سراندیپ میں قائم ہوئی اور اس کی تاریخ کا آغاز پہلی صدی ہجری اور ساتویں صدی عیسوی تک پہنچ جاتا ہے۔

دوسرا مرکز مالدیپ

ان اطراف میں مسلمانوں اور عربوں کا دوسرا مرکز مالدیپ کا جزیرہ تھا، جس کو عرب کبھی جزیرۃ المہل اور کبھی ان کے چھوٹے چھوٹے سب جزیروں کو ملا کر ''دیبات''[2] کہتے ہیں۔ ان جزیروں کا سب سے مفصل حال ابن بطوطہ نے بیان کیا ہے۔ اس کے زمانہ میں یعنی سلطان محمد تغلق کے زمانہ میں (سنہ ۷۰۰ھ) میں یہ جزیرہ پورا کا پورا مسلمان تھا اور ان میں عربوں اور دیسی مسلمانوں کی آبادیاں تھیں اور سلطان خدیجہ نام ایک بنگالی خاتون ان پر حکمراں تھی۔ ابن بطوطہ کے زمانہ میں یہاں یمن وغیرہ کے بہت سے علما اور جہاز راں موجود تھے۔ ان کی زبانی اس جزیرہ کے لوگوں کے مسلمان ہو جانے کی کیفیت یہ درج کی ہے کہ یہاں کے لوگ پہلے بت پرست تھے۔ یہاں پر مہینہ سمندر سے دیو کی شکل میں ایک بلا آتی تھی۔ جب یہاں کے لوگ اس کو دیکھتے تھے تو ایک کنواری لڑکی کو بناؤ سنگار کر کے اس بت خانہ میں جو سمندر کے کنارے تھا چھوڑ آتے تھے، لیکن مراکو کے ایک عرب شیخ ابوالبرکات بربری مغربی جو اتفاق سے یہاں آئے تھے، ان کی دعا اور برکت سے یہ بلا ان کے سر سے ٹلی۔ اس کرامت کو دیکھ کر وہاں کا راجہ شنورازہ اور تمام رعایا شیخ کے ہاتھ پر مسلمان ہو گئی۔ ابن بطوطہ کہتا ہے کہ وہاں کی اس مسجد کی محراب پر جس کو اس نو مسلم راجہ نے بنایا تھا یہ کتبہ میں نے لکھا ہوا پایا:

---

[1] ابوزید سیرافی ص ۱۲۱ (پیرس) [2] ''دیب''، سنسکرت میں جزیرہ کو کہتے ہیں۔

''سلطان احمد شنورازہ ابوالبرکات مغربی کے ہاتھ پر مسلمان ہوا''

الغرض اس وقت سے لے کر آج تک یہ تمام جزیرے مسلمان ہیں اور ان میں بڑی تعداد مخلوط النسل عربوں کی ہے۔

تیسرا مرکز ملیبار

روایتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلام اور عربوں کا تیسرا مرکز ہندوستان کا وہ آخری کنارہ ہے جس کو ہندوؤں کے پرانے زمانہ میں کیرالا کہتے تھے اور بعد کو ملیبار کہنے لگے (ملی پہاڑ اور بار ملک) اس کی حد عربی جغرافیہ نویسوں نے گجرات کے خاتمہ سے کولم واقع ٹراونکور تک بتائی ہے۔

تحفۃ المجاہدین کی روایت ہے جس کو فرشتہ نے نقل کیا ہے:-

''اسلام سے پہلے اور اسلام کے بعد یہودی اور عیسائی سوداگر یہاں آیا کرتے تھے اور یہاں بود و باش اختیار کر چکے تھے۔ جب اسلام پر دو سو برس گذرے عرب اور عجمی مسلمان درویشوں کی ایک جماعت حضرت آدم کے نقش قدم کی زیارت کے لئے سراندیپ جس کو لنکا کہتے ہیں جا رہی تھی۔ اتفاق یہ ہے کہ ان کا جہاز ہوا کے جھونکوں سے بہک کر ملیبار کے شہر کدنگلور (کدنگانور) کے کنارے آ کر لگا۔ شہر کے راجہ زیمور (سامری) نے ان کی بڑی آؤ بھگت کی۔ باتوں باتوں میں اسلام کا ذکر آ گیا، راجہ نے کہا میں نے یہودیوں اور عیسائیوں کی زبانی تمہارے پیغمبر کا اور مذہب کا حال سنا ہے، اب تم خود سناؤ۔ درویشوں نے اسلام کی حقیقت کو اس مؤثر انداز سے بیان کیا کہ اس نے راجہ کا دل موہ لیا۔ راجہ نے ان سے وعدہ لیا کہ واپسی میں بھی وہ ادھر ہی سے گذرتے جائیں۔ چنانچہ وہ وعدہ کے مطابق آئے۔ راجہ نے سب امراء کو بلا کر کہا کہ اب میں

خدا کی یاد کرنا چاہتا ہوں اور یہ کہہ کر ملک برابر برابر سب افسروں میں تقسیم کر دیا و ارخود چھپ کر ان درویشوں کے ساتھ عرب چلا گیا اور مسلمان ہو گیا اور ان درویشوں سے کہا کہ ملیبار میں اسلام کے پھیلانے کی صورت یہ ہے کہ تم لوگ ملیبار سے تجارت اور سوداگری کا کاروبار شروع کرو اور اپنے امراء کے نام ایک وصیت نامہ لکھ کر سپرد کیا کہ ان پردیسی سوداگروں کے ساتھ ہر قسم کی مہربانی اور لطف کا برتاؤ کیا جائے اور ہر نیک کام میں ان کی مدد کی جائے اور ان کو اپنی عبادت گاہوں کے بنانے کی اجازت دی جائے اور اس طرح ان سے سلوک کیا جائے کہ ان کو وہاں رہنے کی اور اس کو وطن بنانے کی خواہش پیدا ہو۔ اس وقت سے عرب سوداگر اس ملک میں آنے جانے اور رہنے سہنے لگے۔

ایک دوسری روایت ہے (جس کو فرشتہ نے پہلے سے زیادہ صحیح مانا ہے اور میرے نزدیک وہ پہلے سے زیادہ غلط ہے) کہ زیمور کے اسلام کا واقع خود پیغمبر اسلام کے زمانے میں پیش آیا۔ بہر حال یہ درویش پھر ملیبار واپس آئے اور کدنکور میں مسجد بنائی اور کچھ لوگ وہاں مقیم ہوئے اور کچھ لوگ موجودہ ٹراونکور کے شہر کولم میں جا کر رہے اور وہاں بھی مسجد بنائی پھر ہیلی ماراوی، جرپتن، درپن، فندرنیا، (بنڈارانی) جالیات،، فاکنور اور منگلور میں مسجدیں بنائیں اور نو آبادیاں قائم کیں''۔

یہ فرشتہ کا خلاصہ ہے۔ مگر اصل تحفۃ المجاہدین کے ایک دو اور اقتباسات بھی مفید ہیں جن سے بعد کے زمانہ کا طرز عمل ظاہر ہوتا ہے:-

'' ہندوستان کے مغربی ساحل کے بندرگاہوں میں مختلف ملکوں سے تاجر بکثرت آتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نئے شہر آباد ہو گئے

ہیں اور مسلمانوں کی تجارت سے ان میں آبادی بڑھ گئی ہے اور مکانات کثرت سے بن گئے ہیں ۔ یہاں کے سردار اور راجہ مسلمانوں پر سختیاں کرنے سے پرہیز کرتے ہیں ۔ باوجودیکہ یہ سردار اور ان کی سپاہ بت پرست ہے مگر وہ مسلمانوں کے مذہب اور ان کے شعائر کا بہت کچھ پاس ولحاظ کرتے ہیں ۔ بت پرستوں اور مسلمانوں کے اس اتحاد سے اس لئے اور تعجب ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی تعداد کل آبادی کا دسواں حصہ بھی نہیں.....

بحیثیت مجموعی ملیبار کے ہندو راجاؤں کا برتاؤ مسلمانوں کے ساتھ عزت اور مہربانی کا ہے کیوں کہ ان کے ملک میں زیادہ شہروں کا آباد ہو جانا انہیں مسلمان تاجروں کی بود و باش کا نتیجہ ہے'' ۔[1]

ملیبار کے یہی مسلمان عرب تاجر اور سوداگر اور تارکین وطن ہیں جو مویلا اور نائت کے ناموں سے ہندوستان میں مشہور ہیں اور جن کے ہاتھوں میں پرتگیزوں سے پہلے تک سمندر کی باگ تھی ۔ ان کے ساتھ وہ لوگ بھی شامل ہو گئے ہیں جو دیسی باشندوں میں سے مسلمان ہو گئے ہیں یا شادی بیاہ کے ذریعہ سے ان کی برادری میں آ گئے ہیں ۔

کولم

کولم کا شہر موجودہ ٹراونکور میں داخل ہے ۔ عرب جہازراں بہت پرانے زمانہ سے اس کا نام لیتے چلے آئے ہیں اور کہتے ہیں کہ ''یہ مسالوں والے ملک کا آخری شہر ہے'' یہاں سے جہاز عدن کو جایا کرتے تھے ، یہاں مسلمانوں کا ایک محلّہ آباد ہو گیا تھا اور ان کی ایک جامع مسجد بھی تھی ۔ [2]

چوتھا مرکز معبر یا کارومنڈل

مدراس میں ملیبار کے دوسرے مقابل ساحل کو عرب معبر کہتے ہیں ۔ اس کا

---

[1] تحفۃ المجاہدین بحوالہ دعوت اسلام ڈاکٹر آرنلڈ صفحہ ۳۸۲ و ۳۸۳ ۔ [2] تقویم البلدان ص ۳۶۱ ۔

موجودہ مشہور نام کارومنڈل ہے۔ معبر کا نام بھی عرب سیاحوں اور تاجروں میں خاص طور سے شہرت رکھتا تھا۔ ابن سعید مغربی نے چھٹی صدی کے آخیر میں اس کا ذکر کیا ہے اور بتایا ہے کہ یہ کولم کے پورب تین چار دن کے راستہ پر دکھن کی طرف جھکا ہوا ہے [۱] زکریا قزوینی (سنہ ۶۸۲ھ) نے ساتویں صدی میں اس کا نام منڈل لکھا ہے اور یہاں کی عود لکڑی کی تعریف کی ہے [۲] اور اسی کے قریب راس کامران (راس کماری) کو جگہ دی ہے جس کی نسبت سے اس عود کو کامرونی (قامرونی) عود کہتے تھے [۳] ابوالفداء سنہ ۷۳۲ھ (سنہ ۱۳۱۳ء) نے راس کماری کو راس کمہری لکھا ہے [۴] اور معبر کی حد یہ لکھی ہے کہ ''یہ ملیبار کے پورب کولم سے تین چار دن کی مسافت پر ہے اور اس کا آغاز کولم کے پورب سے ہے'' [۵] ''پایہ تخت کا نام بیر دال (بیر دھول) ہے۔ یہاں باہر سے گھوڑے لائے جاتے ہیں'' [۶]

معلوم ہوتا ہے کہ ساحل کا یہ حصہ چند صدیوں کے بعد عربوں کے استعمال میں آیا ہے۔ چھٹی صدی کے آخر سے اس کا نام سننے میں آتا ہے۔ ساتویں صدی میں یہاں عربوں کا اچھا خاصہ عمل دخل معلوم ہوتا ہے۔ وصاف (المتوفی سنہ ۷۲۸ھ) اور رشید الدین جامع التواریخ کے مصنف (المتوفی سنہ ۷۱۸ھ) دونوں نے آٹھویں صدی کے ساتویں آخر میں اپنی کتابیں لکھی ہیں۔ یہ زمانہ ہندوستان میں جلال الدین فیروز شاہ خلجی کا تھا، وصاف اور رشید دونوں قریب قریب بیک لفظ یہ لکھتے ہیں:

> ''معبر کولم سے لے کر سیر لوار (نیلور) کے ملک تک سمندر کے کنارے کنارے تین فرسنگ لمبا ہے۔ اس کے اندر بہت سے شہر اور گاؤں ہیں، راجہ کو یہاں سے لوگ دیوار کہتے ہیں جس کے معنی دولت

---

۱ تقویم البلدان ص ۳۶۱ ۔ ۲ آثار البلاد قزوینی صفحہ ۸۲ ۔ ۳ تقویم البلدان صفحہ ۳۵۵ ۔ ۴ ایضاً ۳۵۴ ۔ ۵ ایضاً ص ۳۵۵ ۔ ۶ تاریخ وصاف کی تصنیف کا سال ۷۰۷ھ (سنہ ۱۳۰۷ء) ہے، الیٹ جلد ۳ ص ۴۴ ۔

والے کے ہیں ۔ چین کے بڑے جہاز جن کو جنک کہتے ہیں یہاں چین، ماچین اور سندھ اور ہند کے ملکوں سے بیش قیمت سامان اور کپڑے لاتے ہیں۔ معبر سے ریشمی کپڑے خوشبودار لکڑی لے جاتے ہیں اور اس کے دریا سے بڑے موتی نکالے جاتے ہیں ۔ یہاں کی پیداواریں عراق ، خراسان، شام ، روم اور یورپ تک جاتی ہیں ، یہ ملک لال اور خوشبودار گھاسیں پیدا کرتا ہے ۔ اس کے مندر میں بکثرت موتی ہیں۔ معبر ہندوستان کی کنجی ہے ۔ چند سال پہلے سندر پانڈے یہاں کا دیوار تھا جس نے اپنے تین بھائیوں کے ساتھ مختلف سمتوں میں قوت حاصل کی ۔ ملک تقی الدین بن عبدالرحمٰن بن محمد الطیبی جو شیخ جمال الدین کا بھائی ہے اس راجہ کا وزیر اور مشیر تھا، جس کو پٹن، ملی پٹن، (پٹم اور ملی پٹم) اور بادل کی ریاست راجہ نے سپرد کر دی تھی اور چوں کہ معبر میں گھوڑے اچھے نہیں ہوتے اس لئے درمیان میں یہ معاہدہ تھا کہ جمال الدین ابراہیم دیوان کو چودہ سو مضبوط عرب گھوڑے کیش (قیس) [1] کی بندرگاہ سے لا دیا کرے۔ سال میں دس ہزار گھوڑے خلیج فارس کی دوسری بندرگاہوں سے جیسے قطیف الحصار، بحرین، ہرمز، وغیرہ سے آتے تھے اور ہر گھوڑے کی قیمت ۲۲۰ طلائی سکے (دینار) ہوگی۔ سنہ ۶۹۲ھ (سنہ ۱۲۹۳ء) میں دیوار مر گیا اور اس کی دولت اس کے وزیروں مشیروں اور نائبوں میں بٹ گئی اور شیخ جمال الدین کو جو اس کا جانشین ہوا، کہتے ہیں کہ سات ہزار بیلوں کا بوجھ سونا اور جواہرات ہاتھ آئے اور تقی الدین پہلے کے معاہدہ کے مطابق اس کا نائب مقرر ہوا'' [2]

---

[1] عرب و ہند کے ''تجارتی تعلقات'' کے ضمن میں اس جزیرہ کا پورا حال گذر چکا ہے ۔ [2] ترجمہ جامع التواریخ الیٹ جلد اول صفحہ ۶۹ و ۷۰ وصاف نے زیادہ تحقیق اور تفصیل کے ساتھ اس کو لکھا ہے، دیکھو وصاف جلد ۲ ص ۳۲۔۵۳

اسی زمانہ کے قریب قریب مارکوپولو جب یہاں آیا ہے اس وقت یہاں کی حکومت پانچ ہندو راجاؤں کے ہاتھوں میں پائی مگر مسلمانوں کا تاجرانہ عمل و دخل بھی یہاں اس کو پورا نظر آیا اور گھوڑوں کی آمد عرب سے اس طرح تھی، کہتا ہے:-

''اس ملک میں گھوڑے نہیں ہوتے، ہرمز اور عدن کی بندرگاہوں سے سوداگر ہر سال گھوڑے لاتے ہیں اور پانچوں راجوں میں ہر سال دو دو ہزار گھوڑے خریدے جاتے ہیں اور ایک ایک گھوڑے کی قیمت پانچ پانچ سو دینار دی جاتی ہے''۔

یہاں کے موتی اور جواہرات کی لاتعداد دولت کا اس نے بھی ذکر کیا ہے۔

ہندو راجہ کے لئے مسلمانوں کی مسلمانوں سے لڑائی

اس کے بعد ہی سلطان علاؤالدین خلجی کی فوج نے گجرات سے لے کر کارومنڈل تک زیروزبر کرڈالا۔ اس وقت تمام ہندوستان میں پہلی دفعہ یہ واقعہ پیش آتا ہے کہ کارومنڈل جس کا پایہ تخت اس وقت بیردھول تھا، اس کے راجہ کی طرف سے مسلمان عراقیوں اور عربوں نے مسلمان ترک حملہ آوروں کا مقابلہ کیا۔ امیر خسرو دہلوی نے خزائن الفتوح میں جو علاؤالدین خلجی کی انہیں فتوحات کی ایک رنگین اور بے معنی لفاظی سے بھری ہوئی تاریخ ہے اس واقعہ کو پوری تفصیل کے ساتھ نقل کیا[1] مسلمانوں نے اپنے عہد و پیمان اور دارالامن کی بنا پر دھول کے راجہ کی پوری مدد کی اور اس کی طرف سے ترک مسلمانوں سے خوب لڑے لیکن ترک بہادروں کا مقابلہ آسان نہ تھا۔ راجہ نے شکست کھائی اور ملک پر سلطان علاؤالدین کے سپہ سالار ملک کافور نے قبضہ کرلیا۔ ان مسلمانوں کو جو اس سے لڑے تھے وہ سخت سزا دینا چاہتا تھا مگر انہوں نے قرآن اور کلمہ پڑھ پڑھ کر اپنا مسلمان ہونا ثابت کیا[2]

یہ واقعہ سنہ ۷۱۰ھ (سنہ ۱۳۱۰ء) میں پیش آیا۔

---

[1] خزائن الفتوح امیر خسرو، مطبوعہ تاریخ جامعہ ملیہ اسلامیہ علی گڑھ نے ۱۹۲۷ء ص ۱۵۷-۱۶۲۔

[2] ج ۳ ص ۹۰

الیٹ صاحب کی غلطی

الیٹ نے اپنی کتاب کی دوسری جلد میں تاریخ عالمی کے نام خزائن الفتوح کا خلاصہ کیا ہے۔ اس میں اس واقعہ کے ضمن میں خسرو کے ایک فقرہ کا یہ ترجمہ دیا ہے کہ ''یہ مسلمان نیم ہندو اور اپنے دین و مذہب سے بے خبر تھے''[۱] لیکن یہ مطلب بالکل غلط ہے، حقیقت یہ ہے کہ امیر خسرو نے اپنے شاعرانہ مبالغہ اور انشا پردازی کی نرالی فاظمی میں ان مسلمانوں کو ہندو راجہ کے ساتھ دینے کے جرم میں بہت کچھ برا بھلا کہا ہے جس کا کوئی مقصود و مطلب نہیں ہے چہ جائیکہ اس کے معنی نیم ہندو کے ہوں۔[۲]

پانچواں مرکز گجرات

عربوں کا پانچواں تجارتی محاذ گجرات، کاٹھیاوار، کچھ اور کوکن کا علاقہ تھا جہاں ولبھ رائے یا عربوں کے محبوب راجہ بلہرا کی حکومت تھی جس کی پہلی راجدھانی ولبھی پور تھا جو موجودہ بھاؤنگر کے پاس ایک بڑا شہر تھا اور عرب اس کو ہمیشہ مانگر یا مہانگر کے نام سے پکارتے تھے۔ آثار قدیمہ کی موجودہ تحقیقات سے ثابت ہوتا ہے کہ اس شہر کا دائرہ پانچ میل تک پھیلا ہوا تھا۔ یہاں کے بعض راجاؤں کا مذہب بودھ اور بعضوں کا جین تھا اور انہیں دونوں کے جھگڑوں میں شاید اس کا خاتمہ ہوا۔ اس راج کے زیر سایہ چیمور کی بندرگاہ جس کو عرب صیمور کہتے ہیں بہت ترقی پر تھی، اس کے بعد کھنبایت وغیرہ کا درجہ تھا۔

سب سے پہلا عرب سیاح و تاجر جس نے اپنا سفرنامہ سنہ ۲۳۵ھ میں تمام کیا ہے یعنی سلیمان، اس نے ولبھی راجہ کی بڑی تعریف کی ہے اور لکھا ہے کہ ''اس کو اور اس کی رعایا کو عربوں اور مسلمانوں سے بڑی محبت ہے اور اس کی رعایا کا عقیدہ ہے کہ ہمارے راجاؤں کی عمریں اسی لئے زیادہ بڑی ہوتی ہیں کہ وہ عربوں کے ساتھ محبت سے پیش آتے ہیں''[۳] ان اقتباسات سے معلوم ہوتا ہے کہ عرب سوداگروں اور نوآبادکاروں اور یہاں کے لوگوں میں

---

۱ دیکھو خزائن الفتوح ص ۱۶۱ و ۱۶۲ ۲ ایضاً ۳ ص ۲۶ و ۲۷

بڑے اچھے دوستانہ تعلقات تھے۔ یہی سبب ہے کہ اس راج کے مختلف شہروں میں عربوں کی آبادیاں کثرت سے قائم ہوگئی تھیں اور وہ اخیر اخیر تک قائم رہیں۔

اس طرح طاقن یا داکھن یا دکھن کے راجہ کی نسبت بھی اس کا یہی بیان ہے کہ ''وہ بھی عربوں کے ساتھ بلہرا ہی کی طرح محبت رکھتا ہے''[۱] خاص گجرات یا گوجر (جزر) راجاؤں کی نسبت لکھتا ہے کہ ''وہ عربوں کے دشمن ہیں''۔[۲]

تیسری صدی ہجری کے آخر اور چوتھی صدی ہجری کے شروع میں جب بزرگ بن شہریار ناخدا ادھر اپنے جہاز لاتا تھا تو ان اطراف میں عربوں اور عام مسلمانوں کی بڑی آبادی تھی۔ ایک نومسلم ہندو جہاز راں بھی اس کو ملتا ہے جس نے اپنے جہازوں کے ذریعہ سے بڑی دولت کمائی تھی اور حج بھی ادا کیا تھا[۳] محمد بن مسلم سیراف کا ایک تاجر اس کو ملتا ہے جو تھانہ (بمبئی کے پاس) میں بیس برسوں سے زیادہ رہا تھا اور ہندوستان کے اکثر شہروں میں اس نے سفر کیا تھا اور ان تمام حالت سے واقف تھا۔[۴] چیمور (صیمور واقع گجرات) میں فسا (واقع فارس) کے ایک مسلمان ابوبکر سے اس کی ملاقات ہوئی۔[۵] گوا جس کو قدیم عرب صندابور کہتے تھے، اس کے راجہ کا مصاحب موسیٰ نام ایک مسلمان تھا۔[۶]

ہنرمند

یہ ایک فارسی لفظ ہے جس کی معنی ہنر والے کے ہیں لیکن عربوں نے ایک خاص معنی میں اس کو استعمال کیا ہے اور اخیر کی دال گرا کر وہ اس کو ہنرمن کہتے ہیں اور اس کا مصدر ''ہرمنہ'' (ہنرمند ہونا) بناتے ہیں۔ اس کے اصطلاحی معنی اس مسلمان قاضی یا کونسل کے تھے جو غیر مسلم حکومتوں میں انہیں حکومتوں کی طرف سے مسلمانوں کے معاملات کو فیصل کرنے کے لئے مقرر کیا جاتا تھا۔ عربوں اور مسلمانوں کی حکومتوں کو جب دنیا میں پورا عروج حاصل تھا تو جس طرح آج کل یورپین قوموں کو ایشیا اور افریقہ کی سلطنتوں میں

---

۱ ص ۲۹۔ ۲ ص ۲۸۔ ۳ عجائب الہند ص ۱۶ ۴ ص ۱۵۲۔ ۵ ص ۱۵۷ ۶ ص ۱۵۷

خاص خاص امتیازات حاصل ہیں اوران کا مقدمہ کسی غیر یورپین کی عدالت میں پیش نہیں کیا جاتا، اسی طرح عربوں اور مسلمانوں کی کیفیت بھی تھی اور اسی طرح کے حقوق انہوں نے بھی اپنے تعلق اور آمد و رفت کے غیر اسلامی ملکوں میں حاصل کر لیے تھے۔ ترکستان، روم، چین اور ہندوستان میں مسلمانوں کے ان امتیازی حقوق کا پتہ چلتا ہے۔[۱] بہر حال اسی قاضی یا کونسل یا غیر حکومت کے مقرر کردہ مسلمان افسر کا نام ''ہنرمند'' تھا۔ تیسری صدی ہجری کے اخیر اور چوتھی صدی ہجری کے شروع میں چیمور میں عربوں کی اتنی بڑی آبادی ہوگئی تھی کہ ان کے لیے راجہ کو ایک ہنرمند مقرر کرنا پڑا تھا جس کا نام عباس بن ماہان تھا۔[۲]

ولبھ رائے کی عمل داری

چوتھی صدی ہجری کے شروع میں مسعودی ہندوستان آیا، سنہ ۳۰۳ ھ میں وہ کھمبایت میں تھا۔ اس کے علاوہ گجرات کے مختلف شہروں میں پھرا۔ ولبھ رائے (بلہرا) راجاؤں کے متعلق اس کی بھی شہادت وہی ہے جو اس کے ساتھ ستر برس پہلے سلیمان تاجر نے ظاہر کی تھی۔ کہتا ہے ''سندھ اور ہندوستان کے تمام راجاؤں میں راجہ بلہرا کے راج کی طرح اور کسی راج میں عربوں اور مسلمانوں کی اتنی عزت نہیں۔ اسلام اس راجہ کی حکومت میں معزز اور محفوظ ہے اور اس کے ملک میں مسلمانوں کی مسجدیں اور جامع مسجدیں بنی ہیں جو ہر طرح آباد ہیں۔ یہاں کے راجہ چالیس چالیس، پچاس پچاس برس راج کرتے ہیں، یہاں کے لوگوں کا یہ اعتقاد ہے کہ ہمارے راجاؤں کی عمریں اسی عدل و انصاف اور مسلمانوں کی عزت کرنے کے سبب سے لمبی ہوتی ہیں۔ گجرات کے راجہ کی دشمنی کا وہی حال ہے اور طاقن یا دکھن کے راج میں بھی مسلمانوں کی وہی عزت ہے۔[۳]

صیمور میں دس ہزار کی آبادی

صیمور (ولبھ رائے کی حکومت میں ایک شہر) میں عربوں اور مخلوط النسل مسلمانوں

---

[۱] دیکھو ابن حوقل ص ۲۳۳ [۲] عجائب الہند ص ۱۴۴ [۳] مروج الذہب مسعودی جلد اول ص ۳۸۲ و ۳۸۴

کی آبادی روز بروز بڑھتی جاتی ہے، جس زمانہ میں (سنہ ۳۰۴ھ میں) مسعودی آیا ہے صرف اسی ایک شہر میں مسلمانوں کی دس ہزار کی آبادی تھی۔

بیسر

خدا جانے یہ کیا لفظ ہے؟[1] بہر حال اس کے معنی مسعودی نے یہ لکھے ہیں کہ وہ مسلمان جو ہندوستان میں پیدا ہوئے ہیں اس کی جمع بیاسرہ ہے۔ مسعودی کی یہ اہم عبارت حسب ذیل ہے:-

''میں سنہ ۳۰۴ھ میں لار کی سرزمین میں سے جو بلہرا کی حکومت میں ہے شہر چیمور (صیمور) میں موجود تھا، اس زمانہ میں اس شہر کے حاکم کا نام جانچ تھا اور اس وقت وہاں دس ہزار مسلمان آباد تھے جو ہندوستان کے پیدا شدہ (بیاسرہ) اور سیراف، عمان، بصرہ اور بغداد اور دوسرے ملکوں کے تھے جنہوں نے یہاں بود و باش اختیار کر لی ہے۔ ان میں سے بہت سے معزز سوداگر ہیں جیسے موسیٰ بن اسحاق صندالونی (صنداپوری؟) اور ہنرمندی کے عہدہ پر ان دنوں ابوسعید معروف بن زکریا ممتاز تھے۔ ہنرمند سے مراد مسلمانوں کا سردار ہے اور اس کی صورت یہ ہے کہ راجہ مسلمانوں پر انہیں کے رئیسوں میں سے کسی کو سردار بنا دیتا ہے اور مسلمانوں کے معاملات اسی کے سپرد کر دیتا ہے اور بیاسرہ کے معنی ہیں وہ مسلمان جو ہندوستان میں پیدا ہوئے ہوں''۔[2]

تھانہ میں

چھٹی صدی ہجری کے آخر میں سلطان شہاب الدین کا ہم عصر ابن سعید مغربی

---

[1] یہ گجراتی لفظ دراصل ''بے سرا'' ہے جس کے معنی دوسر والا، یعنی وہ شخص جو عربی اور ہندی مخلوط نسل سے پیدا ہوا ہو۔ [2] مروج الذہب مسعودی ج ۲ ص ۸۵ و ۸۶ (لیڈن)

سنہ ۵۸۵ ھ مراکش اور مصر میں بیٹھ کر بیرونی کی قانون مسعودی کی طرح جغرافیہ فلکی پر ایک کتاب لکھ رہا تھا۔ اس میں اس نے جنوبی ہند کے بعض شہروں کے نام لیے ہیں۔ تھانہ کے ذکر میں کہتا ہے کہ ''یہ گجرات (لار) کا آخری شہر ہے، تاجروں کی زبان پر اس کا نام بہت مشہور ہے میں ہندی ساحل پر رہنے والے سب ہندو ہیں، جو بت پوجتے ہیں، مگر اپنے ساتھ وہ مسلمانوں کو بھی بسا لیتے ہیں''۔[۱]

کھمبایت میں

کھمبایت کی نسبت اس کا بیان ہے کہ ''یہ بھی ہندوستان کے ساحلی شہروں میں سے ہے جہاں تاجر جایا کرتے ہیں، اس میں مسلمان بھی آباد ہیں''۔[۲] اس کے بعد ہی سلطان شمس الدین التمش کے زمانہ میں (سنہ ۶۲۵ ھ) جامع الحکایات کا مصنف عرفی غالبًا سندھ سے کھمبایت گیا تھا۔ اس کا بیان ہے کہ ''وہاں (کھمبایت میں) خوش عقیدہ اور دیندار مسلمانوں کی آبادی ہے اور ان کی ایک جامع مسجد بھی ہے اور اس کا ایک امام اور خطیب بھی ہے۔ گجرات کا راجہ جو نہروالہ میں رہتا تھا، ان لوگوں کے ساتھ بہت عدل و انصاف کے ساتھ پیش آتا تھا۔[۳]

کھمبایت سے چیمور تک چوتھی صدی میں

ابن حرقل بغدادی جس نے چوتھی صدی ہجری میں گجرات سے سندھ تک سفر کیا تھا وہ بیان کرتا ہے کہ:

> ''کھمبایت سے صیمور تک راجہ بلہرا (ولبھ رائے) کی حکومت ہے .....اس میں غالب آبادی تو ہندوؤں کی ہے لیکن اس میں مسلمان بھی ہیں اور مسلمانوں پر حکومت خود مسلمانوں کی ہے یعنی راجہ کی

---

[۱] بحوالہ قدیم البلدان ابوالفدا ۱ ص ۳۵۹۔ [۲] ایضاً ص ۲۵۷ [۳] جامع الحکایات عوفی کا قلمی نسخہ موجودہ دارالمصنفین (اعظم گڑھ)

طرف سے ایک مسلمان والی ان کے لئے مقرر ہوتا ہے.....ولبھ رائے کے علاقوں میں مسجدیں ہیں جن میں جمعہ کی نمازیں ادا کی جاتی ہیں اور اسی طرح ان میں اور نمازیں پڑھی جاتی ہیں اور اذان بھی علی الاعلان دی جاتی ہے"۔[1]

کھمبایت سے کارومنڈل تک آٹھویں صدی ہجری میں

گجرات سے کارومنڈل تک جتنا علاقہ ملک کافور فتح کرتا چلا گیا تھا وہ ایک آندھی تھی جو آئی اور گذر گئی مگر ابتدا اور انتہا میں فتح علائی کا جو جھنڈا گڑا تھا وہ نہ اکھڑ سکا، تاہم وہ دونوں خود مختار ہو گئے۔ ادھر گجرات اور ادھر کارومنڈل بیچ میں سیکڑوں میل کے علاقہ بدستور ہندو رایوں اور راجاؤں کے زیر فرماں رہے، گجرات تو پھر ہمیشہ کے لئے اسلامی ہو گیا مگر کارومنڈل (معبر) میں حسن کیتھلی اور اس کے جانشین نے آٹھویں صدی کے وسط تک تقریباً چالیس برس تک حکومت کی پھر بیجانگر کے راجاؤں نے اس کو فتح کر لیا۔

مراکش کا مشہور سیاح ابن بطوطہ جو اسی زمانہ میں ہندوستان آیا تھا اور محمد تغلق کی طرف سے ایک جوابی سفارت لے کر چین جا رہا تھا، وہ دہلی سے کھمبایت اور پھر کھمبایت سے کارومنڈل گیا تھا جہاں سے چین کو جہازات جاتے تھے، اس پورے راستہ کی اسلامی آبادیوں اور وہاں کے حاکموں کا اس نے ذکر کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ خالص ہندوؤں کی آبادی اور حکومت میں کہاں کہاں مسلمان آباد تھے اور ان کی کیا حالت تھی۔

کھمبایت

ابن بطوطہ دولت آباد اور ساگر ہو کر کھمبایت پہنچا ہے جو گجرات کی بڑی بندرگاہ تھی۔ یہ بندرگاہ کو اب دہلی کی سلطنت سے برائے نام وابستہ تھا مگر یہاں کی تجارت، کاروبار، اثر و اقتدار اور نظم و نسق تمام عرب اور عراق کے تاجروں اور جہاز رانوں کے ہاتھوں میں تھا جو یہاں پہلے سے آباد چلے آتے تھے۔ عربی و عراقی و عجمی مسلمانوں کی ہر طرف

[1] ابن حرقل ص ۲۳۳ (لیڈن)

کثرت تھی اور ان کی بنائی ہوئی مسجدیں اور خانقاہیں آباد تھیں۔ ابن بطوطہ کہتا ہے کہ ''یہ شہر اپنی مسجدوں اور دوسری عمارتوں کے لحاظ سے بہترین شہر ہے اور اس کا سبب یہ بتاتا ہے کہ یہاں کے اکثر باشندے بیرونی ملکوں سے تجارت کرتے ہیں، وہ ہمیشہ عمدہ مکانات اور خوبصورت مسجدیں بناتے رہتے ہیں اور ان کے بنانے میں ایک دوسرے سے بڑھ جانے کا جذبہ پیدا ہے۔ عالیشان عمارتوں میں شریف سامری کا محل ہے، اس کے پہلو میں عظیم الشان مسجد ہے اور ملک التجار گازرونی کا بھی بڑا مکان ہے اور اس کے ساتھ بھی ایک مسجد ہے اور تاجر شمس الدین کلاہ دوز کا گھر بہت بڑا ہے۔ شہر میں حاجی ناصر کی خانقاہ ہے جو عراق کے شہر دیار بکر کے باشندہ تھے۔ دوسری خانقاہ خواجہ اسحاق کی ہے جہاں فقیروں کے لئے لنگر بھی تقسیم ہوتا ہے۔[1]

گاوی اور گندھار

گاوی اور گندھار یہ دونوں بھروچ کے ساتھ کی بندرگاہ تھے۔ (آئین اکبری)۔ ابن بطوطہ کھمبایت سے چل کر پہلے گاوی اور گاوی سے گندھار پہنچا۔ کہتا ہے کہ یہ دونوں ساحلی شہر راجہ جالینی کے قبضہ میں ہیں۔ مگر وہ بادشاہ اسلام کے ماتحت ہے، یہاں اس کو مسلمان آباد ملتے ہیں جن میں بہت سے راجہ کے درباریوں اور افسروں میں داخل تھے۔ ان میں ایک خواجہ بہرہ نام تھا اور دوسرا ناخدا ابراہیم تھا جو چھ جہازوں کا مالک تھا۔ ابن بطوطہ اسی گندھار میں ناخدا ابراہیم اور اس کے بھائی کے جہازوں میں سوار ہوا۔ ان جہازوں کے نام جاگیر اور منورت تھے۔ جہازوں میں پچاس تیرانداز اور پچاس حبشی سپاہی تھے۔

بیرم

یہ ایک چھوٹا سا جزیرہ ہے جو ہندوستان کے ساحل سے چار میل دور ہے (یہ عدن کے قریب کا بیرم نہیں) پہلے اس پر ہندو قابض تھے پھر مسلمانوں نے قبضہ کرلیا۔ ابن بطوطہ

[1] سفرنامہ ابن بطوطہ عربی مطبوعہ خیریہ مصر جلد دوم ص ۱۲۸ و ۱۲۹۔

کے زمانہ میں ملک التجار گازرونی نے اس کو تعمیر کیا اور وہاں مسلمانوں کو آباد کیا۔

گوگہ

یا گھوگہ (موجودہ بھاؤنگر کے پاس ہے) یہاں راجہ دنکول کی حکومت تھی۔ بہت بڑا شہر تھا بڑے بڑے بازار تھے یہاں اس نے ایک مسجد دیکھی جو حضرت خضر کی طرف منسوب تھی (جن کو عام لوگ سمندر میں ڈوبتوں کا سہارا سمجھتے ہیں) یہاں حیدری فقیروں کا ایک گروہ تھا۔

چنداپور

یہاں سے ہمارا مسافر چنداپور پہنچا جس کو عرب منداپور کہتے تھے اور جس کو اسی تشابہ کی وجہ سے میں نے کبھی سنگھاپور سمجھا تھا لیکن وہ درحقیقت موجودہ گوا کے پاس تھا۔ ہمارا سیاح یہاں ایک مسلمان سلطان جمال الدین ہنوری کی ریاست پاتا ہے۔ اس سلطان جمال الدین کا باپ حسن ایک جہازراں تھا۔ سلطان جمال الدین راجہ ہریب (صحیح نام ہریر ہے اور یہ بیجانگر کا راجہ تھا) کے ماتحت تھا۔ یہاں ایک ہندوؤں کا اور دوسرا مسلمانوں کا محلّہ الگ الگ تھا۔ یہاں ایک عظیم الشان مسجد تھی، ابن بطوطہ کی نگاہ میں بغداد کی مسجدوں کا مقابلہ کرتی تھی۔

چنداپور کے پاس ہی ایک اور چھوٹی سی ساحلی آبادی تھی جہاں ایک گرجا بھی تھا اور وہاں کے ایک بت خانہ میں ایک بظاہر جوگی لیکن درحقیقت مسلمان صوفی سے اس کی ملاقات ہوتی ہے جو صرف اشاروں سے باتیں کرتا تھا۔

ہنور

جس کو ہونور کہتے ہیں اور جو اب بھی احاطہ بہمنی میں شمالی کنڈلا کے ضلع میں ہے۔ یہ سلطان جمال الدین کا اصلی مرکز تھا۔ یہاں ابن بطوطہ کو شیخ محمد ناگوری نام ایک صاحب خانقاہ بزرگ ملے اور فقیہ اسماعیل سے جو قرآن پاک کے استاد تھے اور نورالدین علی قاضی

سے اور ایک اور امام سے ملاقات ہوئی۔ اس شہر میں اس نے عجیب بات یہ پائی کہ یہاں عورتوں، مردوں سب میں تعلیم کا برابر چرچا تھا۔ شہر میں ۱۳ مکتب لڑکیوں کے اور ۲۳ لڑکوں کے دیکھے۔ ہنور کی مسلمان عورتیں بھی ہندو عورتوں کی طرح ساری باندھتی تھیں۔ باشندوں کا ذریعہ معاش تجارت تھی۔ یہاں ابن بطوطہ کو اس مسلمان جوگی کا ایک پیام اور تحفہ ملا۔ باشندہ امام شافعی کے پیرو تھے جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ عرب تھے یا ان کی اولاد تھے۔

ملیبار

ہنور سے ابن بطوطہ کا جہاز ملیبار کے سواحل پر آ کر لگتا ہے۔ کہتا ہے کہ اس علاقہ کی حد دمنا پور سے گرام تک دو مہینہ کا راستہ ہے۔ یہ سیاہ موجوں والا ملک ہے اس ملک میں چھوٹے بڑے بارہ ہندو راجہ ہیں بڑے راجاؤں کے پاس پچاس پچاس ہزار اور چھوٹوں کے پاس تین چار ہزار فوج ہے۔ ایک راجہ کا علاقہ ختم ہو کر جہاں دوسرے راجہ کا علاقہ شروع ہوتا ہے وہاں لکڑی کا ایک پھاٹک لگا ہے جس پر اس علاقہ کے راجہ کا نام لکھا ہے۔ ہندو حکومت ہونے کے باوجود ان علاقوں میں مسلمانوں کی بڑی عزت ہے۔ چندا پور سے کولم تک ہر آدھ میل پر لکڑی کا ایک مکان بنا ہے جس میں دوکانیں اور چبوترے بنے ہیں ہر مسافر خواہ وہ مسلمان ہو یا ہندو ہو آرام کرتا ہے۔ ہر ایک مکان کے پاس ایک کنواں ہے جس پر ایک ہندو سب کو پانی پلاتا ہے۔ ہندوؤں کو برتن میں اور مسلمانوں کو اوک سے۔ ہندو باشندے مسلمانوں کو اپنے گھروں کے اندر نہیں آنے دیتے اور نہ اپنے برتنوں میں ان کو کھلاتے ہیں اور اگر کھلاتے ہیں تو یا اس برتن کو توڑ دیتے ہیں یا اسی مسلمان کو دے دیتے ہیں لیکن جہاں کہیں کوئی مسلمان نہ ہو وہاں وہ مسلمانوں کا کھانا پکا دیتے ہیں اور کیلے کے پتے پر رکھ دیتے ہیں جو باقی بچتا ہے وہ چیل کوے اور کتے کو کھلا دیتے ہیں۔ اس پورے راستہ میں ہر منزل میں مسلمان آباد ہیں جن کے پاس مسافر جا کر ٹھہرتے ہیں اور وہ ان کے لئے ہر چیز خرید کر کھانا پکا دیتے ہیں یہاں اگر مسلمانوں کی آبادی جا بجا نہ ہوتی تو مسلمان مسافروں کا

یہاں سفر کرنا مشکل تھا۔ راستہ میں بھی اگر ہندو کسی مسلمان راہ چلتے کو دیکھتے ہیں تو راستہ بدل لیتے ہیں۔

ابی سرور

ملیبار کے جس شہر میں پہلے وہ داخل ہوتا ہے اس کا نام وہ ابی سرور بتاتا ہے۔ ابوالفداء نے اپنے جغرافیہ میں اس شہر کا نام یاسرور لکھا ہے۔ ابن بطوطہ کہتا ہے یہ ایک چھوٹی سی بندرگاہ ہے یہاں بھی مسلمانوں کی آبادی ہے اور ان کا سب سے بڑا آدمی یہاں شیخ جمعہ ہے جو ابی ستہ کے نام سے مشہور ہے۔ بڑا مخیّر آدمی ہے اس نے اپنی دولت فقیروں اور محتاجوں کو بانٹ دی ہے یہاں ناریل کے درخت بہت ہیں۔

پاکنور

ابی سرور سے وہ پاکنور پہنچتا ہے (یہ مدراس میں جنوبی کنڑی میں برکور کے نام سے اب مشہور ہے۔ یہ ابن بطوطہ کے زمانہ میں بیجانگر کے ماتحت تھا) کہتا ہے کہ یہاں کے راجہ کا نام باس دیو ہے اس کے پاس تیس جنگی جہاز ہیں لیکن ان کا امیر البحر مسلمان تھا جو اچھا نہ تھا۔ تاجروں کو لوٹتا تھا۔ جب یہاں کوئی جہاز آتا تھا، تو راجہ ''بندرگاہ کے حق'' کے نام سے کچھ وصول کرتا تھا۔ راجہ نے ابن بطوطہ کی بھی خاطر کی۔ یہاں کا بڑا آدمی حسین سلاط ہے اور یہاں قاضی اور خطیب مقرر ہیں اور حسین سلاط کی بنوائی ہوئی ایک مسجد بھی ہے۔

منگلور

یہاں سے وہ منگرور (منگلور) جا کر لنگر ڈالتا ہے۔ کہتا ہے کہ ملیبار کا سب سے بڑا دریائی موقع ہے اور فارس اور یمن کے اکثر تاجر یہاں اترتے ہیں۔ اس کے راجہ کا نام رام دیو ہے۔ چار ہزار کے قریب مسلمان یہاں آباد ہیں ان کا محلّہ الگ ہے۔ کبھی کبھی یہاں کے باشندوں سے ان کی لڑائی بھی ہوتی ہے مگر راجہ بیچ میں پڑ کر دونوں میں صلح کرا دیتا ہے۔ یہاں ایک قاضی ہے جو نہایت لائق اور فیاض آدمی ہے جس کا نام بدرالدین ہے، معبر

(کارومنڈل) کا رہنے والا شافعی مذہب ہے۔ یہاں کے راجہ نے اپنے لڑکے کو جب ضمانت کے طور پر جہاز میں بھیجا تب ہم قاضی کے کہنے سے اترے، تین دن تک ہماری ضیافت ان لوگوں نے کی۔

ہیلی

ہیلی نام گواب کوئی بندر نہیں مگر کناتور سے سولہ میل شمال کی طرف بارکا ایک کونا سمندر میں پھیلا ہے اس کو کوہ ہیلی (ایلی) کہتے ہیں۔ ابن بطوطہ کا بیان ہے کہ ''یہ بہت بڑا اور خوبصورت شہر ہے، یہاں بڑے بڑے جہازات آتے ہیں، چین کے جہاز یہیں آکر ٹھہرتے ہیں۔ یہ شہر ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کے نزدیک مقدس ہے کیوں کہ یہاں ایک جامع مسجد ہے جس کی نذر تمام جہاز والے مانتے ہیں اور دیتے ہیں اس کی نذر و نیاز کا ایک خزانہ ہے جس کا منتظم حسین نام وہاں کی مسجد کا امام ہے اور حسین وزان یہاں کے مسلمانوں کا سردار ہے۔ یہاں طالب علموں کی ایک جماعت ہے جس کو اسی جامع مسجد کے خزانہ سے وظیفہ ملتا ہے۔ اس مسجد کے متعلق ایک لنگر خانہ بھی ہے جہاں سے مسافروں کو اور غریب مسلمانوں کو کھانا بٹتا ہے۔ یہاں مقدشو (افریقہ) کے ایک درویش سے ابن بطوطہ کی ملاقات ہوئی ہے، یہ بزرگ ہندوستان اور چین اور عرب کی سیاحت کر چکے تھے۔

جرٹین

یہ ملیبار کے علاقہ میں شاید وہ مقام ہے جس کو اب سری کنداپورم کہتے ہیں۔ پہلی صدی ہجری میں ملیبار کے راجہ کے مسلمان ہونے پر ملیبار کے مختلف شہروں میں جو مسجدیں بنی تھیں ان میں ایک یہاں بھی بنی تھی۔ ابن بطوطہ کہتا ہے کہ ''یہاں کے راجہ کا نام کویل ہے، یہ ملیبار کا بڑا راجہ ہے اس کے جہازات فارس، یمن اور عمان جاتے ہیں'' یہاں بغداد کے ایک عالم سے اس کی ملاقات ہوئی جن کا ایک بھائی یہاں کا بڑا سوداگر تھا، اور جو بڑی دولت چھوڑ کر مرا تھا۔ ہندو راجہ مسلمان میت کے ترکہ میں سے کچھ نہیں لیتا، بلکہ وہ مسلمانوں

کے سردار کے پاس امانت رہتا ہے۔ ابن بطوطہ کا بیان ہے کہ جب میں چلا ہوں تو وہ عالم صاحب اپنے متوفی بھائی کا سب سامان لے کر بغداد کی روانگی کی تیاری کر رہے تھے۔

دہ پٹن

یہ بھی راجہ کویل کی عمل داری میں ہے، سمندر کے کنارے یہ بڑا شہر ہے۔ باغات بکثرت ہیں، ناریل، سیاہ مرچ، چھالیہ، پان اور اروی کی بہتات ہے۔ یہاں راج کویل کے بزرگوں میں سے کسی کا بنایا ہوا ایک نہایت خوبصورت تالاب ہے جس میں تراشے ہوئے سرخ پتھر لگے ہیں، اور جس کے چاروں کونوں پر چار گنبد ہیں اور اسی کے قریب راجہ کویل کے باپ دادوں میں سے کسی کی بنوائی ہوئی مسجد بھی ہے۔ مسلمان اس تالاب میں نہاتے اور وضو کرتے اور اسی مسجد میں نماز پڑھتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ وہ راجہ مسلمان تھا۔ اس کے مسلمان ہونے کا قصہ ابن بطوط نے وہاں کے مسلمانوں کی زبانی یہ سنا کہ جہاں مسجد ہے وہاں ایک ایسا درخت تھا جس میں ہر خزاں کے موسم میں ایک ایسا پتا گرتا جس پر کلمہ لکھا ہوتا تھا۔ جب یہ پتا گرتا تھا تو آدھا مسلمان آدھا ہندو لے لیتے تھے۔ اس سے بیماروں کو شفا ہو جاتی تھی۔ اسی کرامت کو دیکھ کر وہ راجہ مسلمان ہو گیا تھا۔ وہ عربی خط پڑھ سکتا تھا اس کے مرنے کے بعد اس کا بیٹا مسلمان نہ ہوا اور اس نے اس درخت کو جڑ سے اکھڑوا دیا مگر وہ پھر نکل آیا۔ ابن بطوطہ کے زمانہ میں اس مسجد کے پاس وہ درخت موجود تھا۔ اس کے سامنے ایک محراب بنی تھی۔

بدھ پٹن

''دہ پٹن سے جہاز بدھ پٹن پہنچا، یہاں یہی پہلی صدی ہجری والے نو مسلم راجہ کی ایک مسجد تھی۔ ابن بطوطہ کا بیان ہے کہ یہ بھی مندر کے کنارے ایک بڑا شہر ہے (یہ شاید شہر چالیام تھا جو موجودہ شہر جے پور کے قریب واقع تھا)۔ ابن بطوطہ کہتا ہے کہ یہاں زیادہ تر برہمن آباد ہیں جو مسلمانوں سے بہت نفرت رکھتے ہیں اور مسلمان آباد نہیں۔ شہر کے باہر

سمندر کے کنارے ایک مسجد ہے، مسلمان مسافر وہیں جا کر ٹھہرتے ہیں یہ مسجد بھی اس لئے بچی ہوئی ہے کہ ایک دفعہ کسی برہمن نے اس کی چھت توڑ کر اس کی لکڑی اپنے گھر میں لگالی تو اس کا گھر جل گیا جس میں وہ خود مع اپنے تمام خاندان اور اسباب کے جل کر مر گیا۔ اس وقت سے کوئی برہمن اس مسجد کو نہیں چھوتا بلکہ وہ اس مسجد کی خدمت اور حفاظت کرتے ہیں۔ آنے جانے والوں کے پینے کے لئے پانی کا انتظام کیا ہے اور اس کے دروازہ پر جالی لگادی ہے تاکہ اس میں پرند نہ جائیں۔

پندارانی

یہاں سے نکل کر ہمارا سیاح پندارانی پہنچا جس کو وہ فنڈرینہ کہتا ہے اور جو کالی کٹ سے سولہ میل اتر ہے۔ کہتا ہے کہ ''یہ بہت بڑا شہر ہے اس میں مسلمانوں کے تین محلے آباد ہیں ہر محلّہ میں ایک مسجد ہے، سمندر کے کنارہ سمندر کے رخ پر ایک پرفضا جامع مسجد ہے، وہاں کا قاضی اور امام عمان کا رہنے والا ہے، یہاں گرمیوں میں جہاز آ کر ٹھہرتے ہیں''۔

کالی کٹ

اب ہمارا سیاح ملیبار کے مشہور بندر کالی کٹ میں پہنچتا ہے۔ کہتا ہے کہ یہ ملیبار میں سب سے بڑا بندر ہے۔ یہاں چین، جاوا، مالدیپ، یمن، اور فارس کے سوداگر بلکہ تمام دنیا کے سوداگر آتے ہیں۔ یہاں کا بندر دنیا کی بڑی بندرگاہوں میں سے ہے۔ یہاں کا راجہ ہندو ہے جس کا لقب زومرو (سامری) ہے۔ یہ اسی طرح داڑھی منڈاتا ہے جس طرح (رومی) فرنگی لوگ جن کو میں نے وہاں دیکھا ہے منڈاتے ہیں لیکن یہاں کے سوداگروں اور راجاؤں کا سردار مسلمان ہے۔ اس کا نام ابراہیم شاہ بندر ہے وہ بحریوں کا باشندہ ہے، بڑا عالم اور سخی داتا ہے۔ ہر طرف کے سوداگر اس کے دسترخوان پر آ کر کھانا کھاتے ہیں۔ شہر کا قاضی فخر الدین عثمانی ہے اور خانقاہ کا شیخ شہاب الدین گازرونی ہے۔ چین اور ہندوستان میں جو لوگ ابو اسحاق گازرونی کی نذر مانتے ہیں وہ اسی خانقاہ میں لا کر اپنی نذر پیش کرتے

ہیں۔ ناخدا مثقال بھی یہیں رہتا ہے۔ یہ شخص بہت مشہور اور مالدار دریائی تاجر ہے۔ اس کے اپنے جہاز ہیں جو ہندوستان، یمن، چین اور فارس سے تجارت کا سامان لاتے اور لے جاتے ہیں۔ راجہ کے نائب اور شیخ شہاب الدین اور ابراہیم شاہ بندر نے ابن بطوطہ کا استقبال سلطان محمد تغلق کے سفیر کی حیثیت سے طبل و علم و نقارہ کے ساتھ کیا۔ ابن بطوطہ کہتا ہے کہ کالی کٹ کا راجہ بڑا عادل ہے۔ ایک دفعہ راجہ کے نائب کے بھتیجے نے ایک مسلمان تاجر کی تلوار چھین لی، تاجر نے اس کے چچا سے جا کر شکایت کی اس نے تحقیق کے بعد حکم دیا کہ اسی تلوار سے اس کے بھتیجے کے دو ٹکڑے کر دیئے جائیں۔

چین کے جہازات یہیں سے روانہ ہوتے تھے، اچھے موسم کے انتظار میں ابن بطوطہ کو مہینوں قیام کرنا پڑا۔ اس کے جہاز کا وکیل ملک شام کا رہنے والا سلیمان صندی نام تھا، اس کی غلطی سے یہ واقعہ پیش آیا کہ ابن بطوطہ کا مال و اسباب تو جہاز پر چڑھ گیا مگر وہ خود ساحل پر چھوٹ گیا اور آخر وہ خشکی کے راستہ سے کولم روانہ ہوا تا کہ وہاں وہ اس جہاز کو پا کر سوار ہو جائے۔

کولم

کولم موجودہ ٹراونکور میں داخل ہے۔ ابن بطوطہ کہتا ہے کہ ''تمام ملیبار میں یہ شہر سب سے زیادہ خوبصورت ہے، بازار بھی اچھے ہیں، سوداگر اتنے بڑے مالدار ہیں کہ پورے جہاز کے جہاز کا مال وہ ایک دفعہ خرید لیتے ہیں اور گودام میں رکھ کر بیچتے ہیں۔ مسلمان سوداگر بھی یہاں بکثرت ہیں۔ ان میں سب سے بڑا شہر آرہ کا باشندہ علاؤالدین ہے۔ یہاں عراقی خاصی تعداد میں آباد ہیں، شہر کا قاضی قزوین کا ایک فاضل ہے، شہر میں سب سے دولت مند مسلمان محمد شاہ بندر ہے۔ اس کا بھائی تقی الدین بڑا فاضل ہے۔ یہاں کی جامع مسجد بھی اچھی اور خوبصورت ہے۔ یہاں کے راجہ کا نام تروری (بناتے تیسری اس زبان میں راجہ کو کہتے ہیں) ہے۔ یہ مسلمانوں کی بڑی عزت کرتا ہے اور بہت منصف مزاج ہے۔ یہاں کالی کٹ والے شیخ شہاب الدین گازرونی کے بیٹے شیخ فخر الدین کی خانقاہ ہے۔

چالیات

ابن بطوطہ کو جہازوں کی تباہی کے سبب سے پھر اسی راستہ سے کالی کٹ کو واپس آنا پڑا۔ راستہ میں وہ چالیات میں ٹھہرا، جس کو عرب شالیات کہتے تھے اور اب اس کو شالیا کہتے ہیں۔ یہ کالی کٹ کے قریب تھا، ابن بطوطہ یہاں کے کپڑوں کے صنعت کی تعریف کرتا ہے، وہ یہاں سے ہنور، اور وہاں سے چنداپور (گوا) پہنچتا ہے، تو معلوم ہوتا ہے کہ راجہ (شاید بیجانگر کا راجہ مراد ہے) نے لڑ کر سلطان جمال الدین ہنوری کے ہاتھ سے یہاں کی ریاست چھین لی۔ ابن بطوطہ یہاں سے سوار ہو کر مالدیپ چلا گیا۔

مالدیپ

یہاں عرب مسلمانوں کی بڑی آبادی تھی اور سلطانہ خدیجہ حکمراں تھی، اس کا پورا حال اوپر گذر چکا ہے۔

سیلون

مالدیپ سے وہ سیلون آتا ہے، یہاں کا راجہ اس وقت اریا چکروتی نام تھا، اس کے پاس بہت سے جہازات تھے جو یمن تک جایا کرتے تھے۔ یہ راجہ فارسی زبان سمجھتا تھا، نقش قدم کی وجہ سے یہاں عربی اور عجمی مسلمان فقیروں اور درویشوں کی آمد و رفت لگی تھی۔

کالی

پھرتا پھراتا وہ سیلون کے بندر کالی (قالی) پہنچتا ہے، یہاں سے آج بھی یورپ اور آسٹریلیا کو جہازات جاتے ہیں، یہاں کے جہازوں کا مالک ناخدا ابراہیم نام تھا، وہ کلمبر اور بطالہ سے جہاز پر سوار ہو کر ناخدا ابراہیم کے جہاز پر معبر (کارومنڈل) ہندوستان کے ساحل پر دوبارہ آیا۔

معبر (کارومنڈل)

ابن بطوطہ جس وقت کارومنڈل پہنچا ہے اس وقت وہاں غیاث الدین دامغانی بادشاہ تھا۔ یہ وہی حکومت تھی جو علاؤالدین خلجی کے افسر ملک کافور فتح کے بعد یہاں قائم ہوگئی

تھی ، یہ غالباً ۷۴۱ھ (۱۳۴۱ء) تھا ،اس صدی کے اخیر میں بیجانگر کے راجہ نے اس اسلامی سلطنت کا خاتمہ کر دیا،شہر مدورا اس کا پایہ تخت تھا۔

دوار سمندر

جہاں اب میسور کی ریاست ہے۔ وہاں اس وقت ہوسیالا خاندان کا راج تھا۔ ان کے پایہ تخت کا نام دوار سمندر تھا۔ اس وقت جو راجہ حکمراں تھا اس کا نام بلال دیو تھا۔ ابن بطوطہ نے اس کے لشکر کی تعداد ایک لاکھ بتائی ہے،اس میں ۲۰ ہزار کے قریب مسلمان تھے، جو ابن بطوطہ کے بیان کے مطابق سب بھاگے ہوئے مجرم اور پہلے چور، ڈاکو تھے،مگر اتنے چور ڈاکو اور مجرم کہاں سے آ گئے تھے،شاید یہ ابن بطوطہ نے اس قصہ میں لکھ دیا ہے کہ یہ لوگ اس وقت کارومنڈل کے بادشاہ غیاث الدین سے جو ابن بطوطہ کا ساڑھو تھا، برسر پرخاش تھے۔

بیجانگر

دریائے کرشنا سے لے کر سمندر کے کنارے تک بیجانگر کی عظیم الشان ہندو حکومت قائم تھی۔ کیا تعجب کی بات ہے کہ ایک طرف تو خشکی میں بہمنیوں کی اسلامی سلطنت سے اس کی دائمی لڑائی برپا تھی اور دوسری طرف سمندر کے راستہ سے عرب و فارس کے مسلمان بادشاہوں سے اس کے تعلقات قائم تھے اور چنانچہ امیر تیمور کے بیٹے مرزا شاہ رخ نے یہاں اپنی سفارت بھیجی تھی، جس کے سرو فد مولانا کمال الدین عبدالرزاق تھے، انہوں نے واپس جا کر بیجانگر کی سلطنت کے جاہ و جلال اور ترقی و کمال کا جو حال لکھا ہے اس کو خاوندشاہ نے روضۃ الصفا کے آخر میں اور حبیب السیر نے جغرافیہ کے حصہ میں منگلور، کالی کٹ اور بیجانگر کے ناموں کے نیچے نقل کیا ہے۔ بیجانگر کی فوج میں دس ہزار مسلمان موجود تھے اور بیجانگر کے راجہ ان کی فوجی قوت کی برتری کے سبب سے ان کی عزت کرتے تھے۔ مسجد بھی بنوائی تھی اور قرآن پاک کی تعظیم بھی کی جاتی تھی۔[1]

---

[1] فرشتہ جلد اول ص ۳۳۳ نولکشور۔

حاضرین! ان دور دراز علاقوں میں پھرتے پھراتے اکتا گئے ہوں مگر آپ نے دیکھ لیا کہ ان دور افتادہ علاقوں میں مسلمان اسلامی جنگی فتوحات سے پہلے بھی کہاں کہاں اور کس کس صورت میں پھیلے تھے اور ہندو ہمسایوں اور راجاؤں سے ان کے تعلقات کیسے تھے؟ اور ہندو مسلمانوں کے تعلقات کا یہ منظر شمالی ہندوستان کے منظر سے کتنا مختلف ہے؟ اب آئیے تھوڑی دیر سندھ کے ریگستان کا بھی لطف اٹھائیں۔

چھٹا مرکز سندھ

گذر چکا ہے کہ عربوں نے کس طرح دیبل (ٹھٹھ) سے ملتان تک پہلی صدی ہجری کے آخر میں فتح کیا مگر واقعہ یہ ہے کہ اس فتح بلکہ حملہ سے بھی پہلے سندھ میں مسلمان آباد ہو چکے تھے، چنانچہ پانچ سو عرب مسلمان ایک عرب سردار کی ماتحتی میں مکران سے بھاگ کر سندھ کے راجہ داہر کے یہاں چلے آئے تھے۔ [1] محمد بن قاسم نے پہلی صدی ہجری کے آخر میں سندھ اور ملتان کو فتح کیا، اس کے بعد سے تقریباً سوا سو برس تک یہ ملک پہلے دمشق پھر بغداد کی حکومت کا جز رہا۔ تیسری صدی ہجری (نویں صدی عیسوی) کے بیچ میں معتصم باللہ کے بعد مرکز کی کمزوری کے سبب سے یہاں کے عرب گورنروں نے خود مختاری سی حاصل کر لی، اس کے بعد کہیں ہندو راجاؤں نے کسی کسی حصہ پر قبضہ کر لیا اور کہیں مسلمانوں نے اپنی ریاستیں کھڑی کر لیں۔ سلطان محمود غزنوی کے حملہ تک ان میں سے بعض بعض مسلمان ریاستیں سندھ میں قائم تھیں ان میں سے دو نسبتاً ذرا بڑی تھیں۔ ایک سندھ کے سرے پر منصورہ میں اور دوسری سندھ کے خاتمہ پر ملتان میں۔ چوتھی صدی ہجری کے اخیر تک جو عرب سیاح یہاں آتے گئے ہیں وہ ان دونوں اسلامی ریاستوں کا حال بیان کرتے آئے ہیں، ملتان، منصورہ، دیبل اور دوسرے شہروں سے سلطان محمود کے وجود سے پہلے بیسیوں مسلمان عالم اور محدث پیدا ہوئے جن میں سے ایک ابو معشر نجیح سندھی ہیں جو دوسری صدی میں تھے اور جو سیرت کے امام سمجھے جاتے تھے

[1] بلاذری فتوح سندھ۔

اور جن کی یہ عزت تھی کہ جب انہوں نے انتقال کیا تو خلیفہ مہدی نے ان کے جنازہ کی نماز پڑھائی۔ اسی زمانہ کا ایک مشہور سندھی عربی شاعر ابوعطا سندھی ہے جس کا تلفظ گو درست نہ تھا مگر اس کے عربی اشعار کو خالص عرب اہل زبان نے بھی تسلیم کیا۔ اس درجہ اور رتبہ کے دوسرے بزرگوں کے نام یہاں گنائے جائیں تو ایک اور دفتر شروع ہو جائے گا، اس لئے ان کو چھوڑتا ہوں۔

عربوں نے سندھ کا علاقہ فتح کرنے کے بعد وہاں اپنی نو آبادیاں قائم کیں۔ قریش، کلب، تمیم، اسد اور یمن و حجاز کے بہت سے قبیلے یہاں کے مختلف شہروں میں آکر آباد ہوئے اور تیسری صدی ہجری کے بیچ تک ان کی حکومت ملتان سے لے کر سمندر تک کسی نہ کسی طرح قائم رہی لیکن آخر کار یمنی اور حجازی عربوں کی باہمی خانہ جنگی نے ان کو برباد کر دیا اور بہت سے علاقے ان کے ہاتھوں سے نکل گئے۔ تاہم ملتان اور منصورہ (سندھ) دو ریاستیں ان کی ایسی تھیں جو سلطان محمود غزنوی کے حملہ تک قائم رہیں، پہلے انہیں دونوں کا حال ذرا تفصیل سے بیان کرنا ہے۔

ملتان

گذر چکا ہے کہ اس شہر پر عربوں نے پہلی صدی ہجری (ساتویں صدی عیسوی) میں قبضہ کیا۔ اس وقت سے لے کر سلطان محمود غزنوی کے زمانے تک برابر اس پر عربوں کا ہی قبضہ رہا۔ تیسری اور چوتھی صدی ہجری کے ہر عرب سیاح نے اس کا ذکر کیا ہے۔ سلطان محمود کے حملہ کے وقت اور اس کے بعد بھی برابر مسلمانوں کی نو آبادی یہاں قائم رہی۔ شروع میں سندھ کے دوسرے شہروں کے ساتھ ملتان پر بھی دمشق کے اموی خاندان کا قبضہ رہا۔ تیس پینتیس برس کے بعد زمانہ نے کروٹ لی، سنہ ۱۳۲ھ میں اسلامی حکومت کی مسند پر بنو امیہ کی جگہ بنو عباس بیٹھے اور حکومت کا مرکز دمشق سے ہٹ کر بغداد آ گیا۔ اس کے بعد تقریباً تیسری صدی ہجری کے شروع تک یعنی معتصم تک ملتان عباسی حکومت کے مرکز سے وابستہ

رہا، اس کے بعد یہ ہوا کہ اگر خلیفہ زبردست ہوا تو اس نے اس دور دراز شہر پر قبضہ رکھا اور اگر کمزور ہوا تو یہاں کے والی اور عامل خود مختار بن گئے۔ اس زمانہ میں ملتان سندھ اور منصورہ کے والیوں کے پاس رہا مگر بعد کو ملتان سندھ سے بھی الگ ہو کر ایک خود مختار اور مستقل حکومت بن گیا۔ اس استقلال اور خود مختاری کی تاریخ غالباً تیسری صدی ہجری کا وسط ہے۔

ملتان سے مقصود صرف ایک شہر نہیں بلکہ پورا صوبہ ہے جو کبھی پوری ایک ریاست بلکہ سلطنت تھا، مصر کے وزیر مہلبی نے چوتھی صدی ہجری میں لکھا ہے کہ ''اس کے حدود وسیع ہیں، پچھم طرف مکران اور دکھن میں منصورہ (سندھ) تک اس کی وسعت ہے''[۱] دریائے سندھ کے پاس جو قنوج تھا سنہ ۳۰۰ھ میں وہ ملتان میں تھا۔[۲] اس زمانہ میں ایک لاکھ اور بیس کانوں شمار کے رو سے ملتان کی اسلامی ریاست کے حدود میں تھے۔[۳]

پرانی سلطنتوں میں یہ اکثر قاعدہ رہا ہے اور ہونا بھی چاہئے کہ مذہب کے غیر سرکاری فرقے بھاگ بھاگ کر حکومت کے آخری اور سرحدی ملکوں میں جا کر پناہ لیتے ہیں، مجوسی ایرانیوں اور عیسائی رومیوں میں بھی یہی دستور تھا اور مسلمان عربوں میں بھی یہی ہوا، چنانچہ پہلے آچکا ہے کہ قزدار میں خارجی مسلمانوں کی آبادی اور انہیں کی ریاست قائم تھی۔ اسی طرح ملتان بھی شیعوں کے ایک فرقہ اسماعیلیہ کی جائداد بن گیا تھا اور بعد کو وہاں ان کی حکومت قائم ہوگئی تھی یہی خالص عربی النسل تھے اور اپنے کو سامہ بن لوئی کی اولاد کہتے تھے۔

بنو سامہ کون تھے

قریش کے اجداد میں اوپر ایک نام لوئی بن غالب ہے اس لوئی کی ایک اولاد کا نام سامہ تھا، اسی خاندان کو بنو سامہ کہتے تھے۔[۴] اسلام میں اس خاندان کا عروج معتضد کے

---

[۱] ابوالفدا کی تقویم البلدان ص ۳۵۰ (پیرس) [۲] مسعودی جلد اول ص ۳۷۲ (پیرس) [۳] ایضاً ص ۳۷۵

[۴] ابن خلدون نے اس کی بار بار تصریح کی ہے کہ بنو سامہ کا اس سامہ بن لوئی کے خاندان سے ہونا قریش کے اکثر نسب دان تسلیم نہیں کرتے دیکھو ابن خلدون ج ۱ ص ۳۲۴ و جلد ۴ ص ۹۳۔

زمانہ میں (سنہ ۲۷۹ھ سنہ ۲۸۶ھ) میں ہوا۔ اس کی صورت یہ ہوئی کہ عرب کے صوبہ عمان میں خارجیوں کی کثرت تھی خلیفہ نے محمد بن قاسم کو ان کی سرکوبی کے لئے متعین کیا، اس نے خوارج کو شکست دی اور عمان میں اپنی ریاست قائم کی اور اہل سنت کے مذہب کو رائج کیا۔ یہ اس خاندان کا پہلا امیر ہے اور اس کے بعد اس کی اولاد اس ریاست پر برابر قابض رہی۔ سنہ ۳۰۵ھ میں ان میں باہم خانہ جنگی ہوئی۔ قرامطہ جو بحرین میں اس وقت زور پکڑ رہے تھے، انہوں نے اس سے فائدہ اٹھایا، یہاں تک کہ سنہ ۳۱۷ھ میں ابوطاہر قرمطی نے عمان کو اس کے قبضہ سے نکال کر قرمطی حدود سلطنت میں داخل کرلیا۔[1]

عمان اور سندھ کی دریائی آمد و رفت اور بحری تجارت ہمیشہ سے قائم تھی اور غالباً بنوسامہ کا تعلق سندھ سے بہت پرانا تھا، چنانچہ بنوسامہ کے غلام فضل بن ماہان اور فضل بن ماہان کے بعض اہل خاندان سندھ کے ایک مقام سندان پر مامون کے زمانہ سے لے کر معتصم باللہ (سنہ ۲۲۷ھ) تک حکومت کی اور پھر برابر انہ خانہ جنگی میں برباد ہوئی۔[2]

اس تعلق سے یہ تعجب کی بات نہیں اگر عمان میں بنوسامہ کی ریاست تباہ ہونے کے بعد وہ قرامطہ سے بھاگ کر سندھ اور سندھ سے ملتان چلے آئے ہوں اور یہاں خدا نے ان کو پھر نئی سلطنت عطا کی ہو۔ بہر حال یہی بنوسامہ ملتان کے امراء تھے اور انہیں کو پچھلے مورث کے لحاظ سے بنوسامہ بھی کہتے تھے اور تیسری صدی ہجری کے خاتمہ میں سب سے پہلے ان کی خود مختار ریاست کا نام ہم کو ملتا ہے۔

بنوسامہ

سب سے پہلے ابن رستہ جس کا زمانہ سنہ ۲۹۰ھ ہے، اپنی کتاب الاعلاق النفیسہ کے حصہ جغرافیہ میں کہتا ہے:-

---

[1] ابن خلدون نے اس کی بار بار تصریح کی ہے کہ بنوسامہ کا اس سامہ بن لوئی کے خاندان سے ہونا قریش کے اکثر نسب دان تسلیم نہیں کرتے دیکھو ابن خلدون جلد ۴ ص ۹۳ (مصر) [2] بلاذری ص ۴۴۶ (لیڈن)

''ملتان میں ایک قوم رہتی ہے جو دعوی کرتی ہے کہ وہ سامہ بن لوئی [1] کے خاندان سے ہے، ان کو لوگ بنو منبہ کہتے ہیں اور وہی وہاں بادشاہ ہیں اور وہ امیر المومنین کا خطبہ پڑھتے ہیں۔ ہندوستان کے راجہ ان سے لڑنے آتے ہیں تو وہ بھی ملتان سے اپنی بڑی فوج لے کر نکلتے ہیں اور ان سے لڑتے ہیں اور اپنی دولت اور قوت کے سبب سے ان پر غالب آتے ہیں'' [2]

اس کے دس برس کے بعد مسعودی سنہ ۳۰۰ ھ کے بعد ہی ملتان پہنچتا ہے وہ لکھتا ہے:

''ملتان کا امیر جیسا کہ ہم نے کہا ہے کہ سلطنت یہاں سامہ بن لوئی بن غالب کے ہاتھ میں ہے، اس کے پاس فوج اور قوت ہے اور ملتان اسلامی حکومت کی بڑی سرحدوں میں سے ایک سرحد ہے۔ ملتان کے تابع اس کے چاروں طرف ایک لاکھ بیس گاؤں ایسے ہیں جو شمار میں آئے ہیں اور یہیں وہ مشہور بت خانہ ہے،.....امیر ملتان کی زیادہ تر آمدنی ان خوشبو لکڑیوں سے ہے جو دور دور سے اس بت خانہ کے لئے بھیجی جاتی ہیں ..... جب کبھی ہندو اس پر حملہ کرتے ہیں اور مسلمان اس کے مقابلہ سے عاجز آتے ہیں تو وہ دھمکی دیتے ہیں کہ ہم اس بت خانہ کو توڑ دیں گے تو ہندو فوجیں واپس چلی جاتی ہیں۔ میرا ملتان جانا سنہ ۳۰۰ کے بعد ہوا اس وقت وہاں بادشا ابوالللباب منبہ بن اسد قرشی سامی تھا'' [3]

---

[1] بعض مؤرخوں اور سیاحوں نے ''سامہ'' کے بجائے ''آسامہ'' کہیں کہیں لکھ دیا ہے یہ صحیح نہیں [2] الاعلاق النفسیہ ابن رستہ ص ۱۳۵ لیڈن سنہ ۱۸۹۲ء [3] مروج الذہب مسعودی جلد اول ص ۳۷۵ و ۳۷۶ (پیرس)

مسعودی کے چالیس برس بعد سنہ ۳۴۰ میں اصطخری ہندوستان وارد ہوا وہ کہتا ہے:

''شہر ملتان منصورہ سے آدھا ہے، یہاں ایک بت خانہ ہے جس کے جاترے کے لیے لوگ دور دور سے آتے ہیں اور اس بت خانہ اور اس کے پجاریوں پر بڑی بڑی رقمیں خرچ کرتے ہیں۔ یہ بت خانہ بازار کے سب سے آباد حصہ میں ہے.....(بت کا حال ہے).....
اور جو کچھ یہاں آتا ہے ملتان کا امیر اس کو لے لیتا ہے، کچھ پجاریوں پر خرچ کرتا ہے اور کچھ اپنے لیے اٹھا رکھتا ہے اور جب کبھی کوئی ہندو راجہ اس پر حملہ کرنا چاہتا ہے تو وہ اس بت خانہ کے برباد کر دینے کی دھمکی دیتا ہے تو وہ واپس چلے جاتے ہیں اگر یہ نہ ہوتا تو ہندو راجہ اس کو ویران کر دیتے۔ ملتان کے چاروں طرف ایک مضبوط شہر پناہ ہے،.....
شہر کے باہر آدھے فرسنگ پر بہت سی عمارتیں ہیں جن کا نام ''جندراون'' ہے، یہ فوجی کیمپ ہے، یہیں بادشاہ رہتا ہے وہ ملتان میں صرف جمعہ کو جاتا ہے، ہاتھی پر سوار ہو کر شہر میں جمعہ کی نماز پڑھنے جاتا ہے، وہ نسلاً قریشی ہے۔ سامہ بن لوئی کے خاندان سے ہے۔ ملتان پر اس نے قبضہ کر لیا ہے اور منصورہ (سندھ) کے امیر یا کسی اور کا وہ تابع نہیں صرف خلیفہ کے نام کا خطبہ پڑھتا ہے''۔[1]

اصطخری کے ۲۷ برس بعد سنہ ۳۶۷ھ میں ابن حوقل بغدادی ملتان آیا اس نے ملتان کا بہت کچھ حال لکھا ہے مگر یہاں کے باطنیوں اور اسماعیلیوں کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے، حالاں کہ یہ نئی بات یقیناً ذکر کے قابل تھی۔ اب ابن حوقل کے آٹھ برس بعد بشاری مقدسی

[1] اصطخری بحوالہ معجم البلدان یاقوت لفظ ''مولتان''۔

ملتان میں قدم رکھتا ہے۔ وہ کہتا ہے:-

''ملتان والے شیعہ ہیں، اذان میں حی علی خیر العمل کہتے ہیں اور اقامت میں دو دفعہ تکبیر کہتے ہیں'' [1]

''ملتان میں خطبہ مصر کے فاطمی خلیفہ کا پڑھتے ہیں اور اسی کے حکم سے یہاں بندوبست ہوتا ہے اور یہاں سے برابر تحفے تحائف مصر کو بھیجے جاتے ہیں'' [2]

ان بیانات سے دوسرے واقعات کے علاوہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ ابن رستہ کے زمانے میں یعنی سنہ ۲۹۰ھ میں پھر مسعودی کے زمانہ میں بھی کیوں کہ وہ خاموش ہے اور اصطخری کے زمانہ میں یعنی سنہ ۳۴۰ھ میں یہاں کی حکومت سنیوں کے ہاتھ میں تھی اور خلیفہ بغداد کا خطبہ پڑھا جاتا تھا۔ سنہ ۳۶۷ھ تک کوئی قابل ذکر بات نہیں ہوئی لیکن سنہ ۳۷۵ھ میں یہ اسماعیلیوں کے ہاتھوں میں نظر آتا ہے اور مصر کے اسماعیلی فاطمی خلیفہ کے زیر اثر اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ملتان کے شاہی خاندان کا یہ مذہبی انقلاب سنہ ۳۴۰ھ بلکہ ۳۶۷ھ اور سنہ ۳۷۵ھ کے بیچ میں ہوا۔

اس قیاسی تاریخ کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ مصر میں اسماعیلی فاطمیوں کی سلطنت بھی اسی زمانہ میں یعنی سنہ ۳۵۸ھ میں قائم ہوئی اور سنہ ۳۶۱ھ میں ان کا پایہ تخت افریقہ سے مصر کو منتقل ہوا۔ اس وقت دنیائے اسلام دو حصوں میں منقسم ہو رہی تھی۔ سنی بغداد کے خلافت عباسیہ کو اور شیعہ مصر کی خلافت فاطمیہ کو مانتے تھے۔ یہ دونوں خلافتیں اپنے اپنے اثر اور اقتدار کو مختلف اسلامی ملکوں میں بڑھانے کے لئے رقیبانہ کوششوں میں مصروف تھیں۔ یہاں تک کہ خود مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں بھی یہ رقیبانہ کاوشیں قائم تھیں اور جب کوئی نئی اسلامی ریاست قائم ہوئی تو دونوں کے داعی اور مبلغ اپنا کام شروع کر دیتے۔ گو یہ بھی

---

[1] احسن التقاسیم مقدسی ص ۴۸۱۔ [2] ایضاً ص ۴۸۵

بغداد کی خلافت کے انحطاط کا اور مصر کے اوج ترقی کا زمانہ تھا کہ عباسیہ سلطنت بوڑھی ہو چکی تھی اور فاطمی حکومت کا عہد شباب تھا مگر اس کی تلافی اس سے ہو رہی تھی کہ مشرق میں جو نئی ترکی سلطنتیں قائم ہوتی تھیں وہ عباسیہ کو اپنا مقتدا تسلیم کر لیتی تھیں۔ بخارا کے سامانیہ ان کے زیر اثر تھے۔ چوتھی صدی ہجری کے بیچ میں غزنویوں کا ظہور ہوا اور اس کے چالیس پچاس برس کے بعد سلجوقیوں کا پرچم لہرایا اور ان سب نے اپنی پوری فوجی قوت اور زور کے باوجود خلفائے عباسیہ کے سامنے سر جھکایا۔

سلطان محمود غزنوی کی شہرت کے آغاز کے ساتھ ہی خلیفہ بغداد نے سب سے پہلے سنہ ۳۸۷ اور سنہ ۳۹۰ کے بیچ میں اس کو خلعت فاخرہ بھیجا اور امین الملۃ یمین الدولہ (مذہب کا امین اور سلطنت کا دست راست) کا خطاب اس کو دیا اور اس کے بعد سنہ ۳۹۶ھ میں سلطان نے ملتان کے اسماعیلیوں کے خلاف فوج کشی کی اور سنہ ۴۰۱ میں وہاں کے قرمطی امیر کو گرفتار کر لیا، غالباً انہیں حالات کو دیکھ کر سنہ ۴۰۳ میں مصری فاطمیوں نے بھی محمود کے پاس اپنا سفیر بھیجا مگر سلطان نے اس کو باطنی سمجھ کر راستہ ہی میں پکڑوا لیا اور مشہور سید حسین بن طاہر بن مسلم علوی کے سپرد کر دیا۔[1] جنہوں نے ان کو مروا ڈالا۔

ملتان کے قرامطہ

اب سوال یہ ہے کہ عرب جغرافیہ نویس سنہ ۳۴۰ تک جس عرب سنی خاندان بنومنبہ کو ملتان کا بادشاہ لکھتے ہیں اس کے بعد کا اسماعیلی خاندان وہی عرب بنومنبہ تھے جو سنی سے اسماعیلی بن گئے تھے یا یہ کوئی دوسرا خاندان تھا؟ کتابوں کے پیش نظر ذخیرہ سے اس کا کوئی جواب ہم کو نہیں ملتا لیکن ابوریحان بیرونی کتاب الہند میں جس کو اس نے سنہ ۴۲۴ھ میں لکھا ہے، ملتان کے بت خانہ کی تاریخ بیان کرتے ہوئے کہتا ہے:-

"جب قرمطی (اسماعیلیہ) ملتان پر قابض ہوئے تو جلم بن شیبان

---

[1] اس فاطمی سفارت کا واقعہ زین الاخبار میں ہے ص ۱۷ (برلن)

نے جس نے یہاں غلبہ حاصل کر لیا تھا، محمد بن قاسم کی جامع مسجد کو ایک اموی یادگار سمجھ کر بند کر دیا اور اس بت خانہ کو توڑ کر مسجد بنالیا''۔[1]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قرمطی خاندان جو چوتھی صدی کے آخر میں غالب ہو گیا تھا وہ کوئی دوسرا خاندان تھا اور اس کے بانی اول کا نام جلم بن شیبان تھا اور جیسا کہ یہ نام ظاہر کرتے ہیں وہ بھی عرب تھا۔ اس کے بعد بیرونی کہتا ہے کہ ''ان قرامطہ کا زمانہ ہم سے تقریباً ایک سو سال پہلے تھا''۔[2] کتاب الہند سنہ ۴۲۴ھ میں لکھی گئی ہے۔ اس سے سو سال پہلے سنہ ۳۲۴ھ ہوگا مگر ہم کو معلوم ہو چکا ہے کہ سنہ ۳۴۰ھ تک یقینی طور سے یہاں بنو منبہ سنی عرب خاندان کی حکومت تھی اس لئے یہ سنہ ۳۲۴ھ ملتان پر قرامطہ کے قبضہ کا سال نہیں ہے بلکہ عراق اور خلیج فارس کے سواحل پر ان کے ظہور کا زمانہ ہے۔

اصل یہ ہے کہ اس موقع پر تین اسلامی فرقوں کے نام گڈمڈ ہو گئے ہیں۔ قرامطہ، اسماعیلیہ اور ملاحدہ گو یہ تینوں اسماعیلی شیعیت ہی کی قسمیں ہیں مگر ان تینوں میں تھوڑا تھوڑا فرق ہے اور ان کی پیدائش کی تاریخ بھی الگ الگ ہے۔ سب سے پہلے تیسری صدی کے آخر میں قرمطی بحرین اور خلیج فارس اور آخر عراق میں رونما ہوئے اسماعیلیہ افریقہ میں سنہ ۲۹۶ھ میں ظاہر ہوئے مگر یہ مصر میں سنہ ۳۵۶ھ میں آئے اور ملاحدہ جن کا دوسرا نام باطنیہ ہے اور جو حسن صباح کا گروہ تھا وہ سنہ ۴۸۳ھ (سنہ ۱۰۹۱ء) کے بعد خراسان میں ظاہر ہوا۔

مصر کے اسماعیلی فاطمی خلیفۃ الحاکم بامراللہ نے شام میں ایک اور فرقہ پیدا کیا تھا جس کا مشہور نام دروز ہے۔ سوال یہ ہے کہ ملتان میں جو فرقہ برسر حکومت آ گیا تھا وہ اسماعیلی شیعہ تو یقینی تھا مگر ان میں سے کس فرقہ کا تھا۔ میرے نزدیک وہ فاطمی اسماعیلی شیعہ تھے جن کا مرکز مصر تھا۔ باقی جن مؤرخوں نے ان کو قرامطہ اور ملاحدہ کہا ہے وہ اس اشتباہ کے سبب سے کہہ دیا ہے جو ان فرقوں میں باہم ہے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ جس زمانہ میں یعنی سنہ ۳۴۰ھ

---

[1] کتاب الہند ص ۵۰۱ (لندن) [2] ایضاً ص ۵۶ (لندن)

کے بعد یہ ملتان میں قوت پاتے ہیں وہ زمانہ ہر جگہ قرامطہ کے انحطاط اور زوال کا تھا۔ دوسرے یہ کہ قرامطہ مصر کے فاطمی خلفاء کی سرداری کو برائے نام تسلیم کرتے تھے اور ملتان والے مصر ہی کے باطنی خلفاء کو مانتے تھے۔ تیسرے یہ کہ بشاری مقدسی جو ایک مذہبی عالم تھا وہ ان کو قرامطہ نہیں بلکہ شیعہ لکھتا ہے اور فاطمیہ کے زیر اثر۔ پھر اذان حی علی خیر العمل جمعہ اور خطبہ وغیرہ کے شعائر قرامطہ میں نہ تھے جن کا وجود ملتان کے اسماعیلیوں میں مقدسی کے بیان سے ثابت ہے، دروزی سنہ ۳۸۶ھ سے سنہ ۴۱۱ھ کی پیداوار ہیں جو بہت بعد کا زمانہ ہے اور باطنیہ یا ملاحدہ یعنی حسن بن صباح کا فرقہ تو اس کے سو برس بعد پیدا ہوا ہے، اس لئے بعض مؤرخین کا ان کو ملاحدہ کہنا سراسر غلط ہے۔

یہ ممکن ہے کہ خلیج فارس، بحرین، عمان کے قرامطیوں کے ذریعہ پہلے قرامطہ ہی کی حیثیت سے یہ لوگ پیدا ہوئے ہوں اور بعد کو قرامطہ کے زوال کے بعد انہوں نے فاطمی اسماعیلی رنگ اختیار کر لیا ہو کیوں کہ قرامطہ بھی گویا نیم اسماعیلی ہی تھے۔

سلطان محمود کے حملہ کے وقت ملتان میں جو اسماعیلی خاندان حکمراں تھا فارسی تاریخوں کے رو سے اس کے مورث کا نام شیخ حمید تھا۔ فرشتہ نے خدا جانے کس ماخذ سے لکھا ہے کہ وہ ابتدائی مسلمان جو افغانستان پر حملہ کے وقت ادھر آ گئے تھے وہ بعد کو واپس نہ جا سکے اور انہوں نے کوہستان خیبر کے پٹھانوں میں شادی بیاہ شروع کر دیا۔ اس عربی و افغانی نسل سے لودھی اور سور دو قبیلے پیدا ہوئے۔ شیخ حمید اسی لودھی خاندان سے تھا۔ یہ تمام داستان قبائل کی اصلیت کی دوسری بے بنیاد باتوں کی طرح بے بنیاد ہے۔ لودھیوں نے کبھی اپنے نام کے ساتھ شیخ نہیں لکھا اور نہ اس قسم کے ان کے نام ہوتے تھے بلکہ اس زمانہ میں ان کا اسلام بھی مشکل سے تسلیم ہو سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ فارسی مؤرخین کو ملتان کی عربی تاریخ سے مطلقاً آگاہی نہیں تھی اس لئے وہ ملتان کے ان مسلمان رئیسوں کو افغانی سمجھنے پر مجبور تھے ورنہ شیخ حمید وغیرہ کا دراصل افغانوں سے کوئی تعلق نہ تھا بلکہ اغلباً وہ جلم بن شیبان کی نسل

سے تھے جس کا ذکر بیرونی کے حوالہ سے ابھی گذرا ہے۔ مزید تفصیل آگے آتی ہے۔

فرشتہ میں ہے کہ الپ تگین نے اور اس کے جانشین سبکتگین نے جب سرحد کے افغانوں پر حملے شروع کیے تو انہوں نے لاہور کے راجہ جے پال سے مدد مانگی۔ راجہ جے پال نے بھاٹیہ کے راجہ سے مشورہ کیا اور یہ طے کیا کہ چوں کہ ہندوستان کی فوج جاڑوں میں سرحد کی سردی برداشت نہیں کر سکتی اس لیے پٹھانوں کو یہاں لا کر آباد کرنا چاہیے اور اس طرح شیخ حمید لودھی کو لمغان اور ملتان کی جاگیر دی۔ شیخ حمید نے اپنے حاکم مقرر کئے اور اس کے عوض اس نے الپ تگین سنہ ۳۵۱ھ سنہ ۳۶۵ھ کے حملوں سے ہندوستان کو بچانے کی خدمت ادا کی [۱] اس واقع میں پٹھانوں کو لا کر آباد کرنا اور شیخ حمید کو لودھی بتانا افسانہ ہے۔

الپ تگین کے بعد جب سنہ ۳۶۵ھ میں سبکتگین بادشاہ ہوا تو شیخ حمید نے غزنین کی بڑھتی ہوئی قوت کو دیکھ کر امیر سبکتگین سے صلح کر لی اور خود کو امیر کے باج گذاروں میں داخل کر لیا لیکن سنہ ۳۹۰ھ میں سلطان محمود نے جب غزنین کے تخت پر قدم رکھا اور پھر سنہ ۳۹۵ھ میں جب وہ بھاٹیہ کے راجہ بجراؤ پر حملہ کر رہا تھا تو ملتان کی ریاست شیخ حمید کے پوتے ابوالفتح داؤد بن نصیر بن شیخ حمید کے ہاتھ میں تھی اور فارسی تاریخوں میں اسی کو ملحد اور قرمطی (اسماعیلی) کہا گیا ہے۔ ابوالفتح داؤد نے شاید سلطان محمود کے بڑھتے ہوئے حوصلہ کو دیکھ کر یہ چاہا کہ ہندو راجاؤں کے ساتھ مل کر اپنے کو بچائے چنانچہ بھاٹیہ کے حملہ کے وقت ابوالفتح نے محمود کے خلاف بجراؤ کی مدد کی [۲]

سلطان اس دفعہ تو خاموش رہا مگر آئندہ سال سنہ ۳۹۶ھ میں اس نے ابوالفتح کو سزا دینے کا ارادہ کیا اور یہ چاہا کہ ملتان کے اوپر سے براہ راست (یعنی گویا ڈیرہ غازی خاں سے) آنے کے بجائے پشاور سے پنجاب ہو کر ملتان جائے تا کہ ابوالفتح کو خبر نہ ہونے پائے۔ اس خیال سے اس نے پنجاب کے راجہ اندر پال سے راستہ مانگا کہ اس کے ملک

---

[۱] یہ پورا واقعہ فرشتہ جلد اول ص ۱۷ و ۱۸ نولکشور میں ہے۔ [۲] ایضاً جلد اول ص ۲۴ و ۲۵۔

سے ہو کر وہ سلطان کی فوج کو ملتان جانے دے، دوسرے مؤرخین کی روایت یہ ہے کہ خود ابوالفتح نے سلطان کے ارادہ کا حال سن کر راجہ اندر پال سے مدد مانگی۔ راجہ نے لاہور سے پشاور جا کر سلطان کو روکا مگر سلطان کی فوج اندر پال کو شکست دے کر اسی کے ملک سے ہو کر ملتان پہنچی۔ ابوالفتح قلعہ بند ہو گیا اور آخر اہل شہر نے بیچ میں پڑ کر اس بات پر صلح کر لی کہ ملتان سے مقررہ خراج غزنین پہنچتا رہے گا، ابوالفتح نے اپنے عقائد سے توبہ کی اور وعدہ کیا کہ اپنے ملک میں اسماعیلیت کے بجائے اہل سنت کے احکام کو جاری کرے گا اس کے چند سال کے بعد (سنہ ۴۰۲ھ سے پہلے) سلطان نے پھر ملتان پر حملہ کیا اور اسماعیلیہ کا قلع وقمع کیا اور داؤد بن نصیر کو پکڑ کر غزنین لے گیا اور غور کے قلعہ میں قید کر دیا جہاں وہ مر گیا۔[1]

یہ فرشتہ کا خلاصہ تھا مگر گردیزی جس کی تاریخ زین الاخبار سنہ ۴۴۱ھ کے قریب خاص غزنویوں کے عہد میں اور پایہ تخت میں لکھی گئی ہے اس میں ہے کہ "غزنین سے سلطان نے ملتان کا قصد کیا اور سوچا کہ یہاں سے اگر سیدھے ملتان جاتا ہے تو شاید داؤد بن نصر (نصیر نہیں) کو جو ملتان کا امیر تھا خبر ہو جائے اور بچاؤ کا سامان کر لے۔ اس لئے دوسرے راستہ سے چلا، انند پال راستہ میں پڑتا تھا۔ اس سے راستہ مانگا، نہ دیا، لڑا، انند پال بھاگ کر کشمیر چلا گیا۔ سلطان ملتان پہنچا اور سات روز تک شہر کا محاصرہ کیا۔ آخر اہل شہر نے اس بات پر صلح کر لی کہ ۲۰ ہزار درم خراج ادا کیا کریں۔ سلطان واپس گیا یہ سنہ ۳۹۶ھ میں ہوا..... پھر جب سنہ ۴۰۱ھ میں آیا، غزنین سے ملتان گیا اور ملتان کا جو حصہ باقی رہ گیا تھا اس کو بھی فتح کر لیا اور قرامطہ (اسماعیلیہ) جو وہاں تھے ان میں سے اکثر کو گرفتار کر لیا۔ بعضوں کو مار ڈالا، بعضوں کے ہاتھ کاٹے اور سخت سزا دی..... اور اسی سال داؤد بن نصر کو گرفتار کر لیا اور قلعہ غور میں قید کر دیا۔[2]

عربی کی مستند تاریخوں میں اس کے متعلق بہت مختصر بیان ہے اور بعض باتوں میں کسی قدر اختلاف بھی ہے مگر پھر بھی واقعہ کے بعض اہم اجزا ان میں یکساں ہیں۔ ابن اثیر

---

[1] تاریخ فرشتہ ص ۲۵ ص ۲۷ نولکشور [2] زین الاخبار گردیزی ص ۶۷ و ۶۸ (برلن)

(سنہ ۵۵۵ھ سنہ ۶۳۰ھ) میں ہے۔

''امسال (سنہ ۳۹۶ھ) میں سلطان محمود نے ملتان پر حملہ کیا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ سلطان کو ملتان کے والی ابوالفتوح کی بداعتقادی اور الحاد (اسماعیلیت) کے الزام کی خبر معلوم ہوئی اور یہ حال بھی معلوم ہوا کہ اس نے اپنی رعایا کو بھی اس بدمذہبی کی دعوت دی اور انہوں نے قبول کر لی ہے۔ یہ سن کر سلطان نے مناسب سمجھا کہ اس پر جہاد کرے اور جس حال پر وہ ہے اس سے وہ اس کو نیچے اتار دے تو وہ غزنین سے اس کی طرف چلا تو اس کو راستہ میں دریا اور ندیاں بکثرت ملیں اور ان میں پانی بڑے زور سے بہہ رہا تھا۔ خاص کر سیحون کو عبور کرنا سخت مشکل تھا، اس لئے سلطان نے انند پال کو کہلا بھیجا کہ وہ اپنے ملک ہو کر ملتان جانے کا راستہ دے، اس نے اس کو قبول نہیں کیا تو سلطان نے پہلے اسی پر حملہ کیا .....انند پال بھاگ کر کشمیر چلا گیا اور جب ابوالفتوح نے سلطان کی آمد کا حال سنا تو اس کے مقابلہ اور اس کی نافرمانی کی قوت نہ پا کر اپنی دولت سر اندیپ میں بھجوا دی اور ملتان خالی کر دیا جب سلطان وہاں پہنچا تو وہاں کے لوگوں کو ضلالت اور گمراہی میں اندھا پایا تو ان کا محاصرہ کیا اور لڑ کر قبضہ کیا اور ان پر ۲۰ ہزار درہم جرمانہ کیا۔[1]

ابن خلدون نے بھی اپنی تاریخ میں انہیں واقعات کا اعادہ کیا ہے۔[2]

اس اقتباس سے ایک تو نام کی صحت ہوتی ہے کہ ابوالفتح کے بجائے ابوالفتوح تھا، دوسرے یہ معلوم ہوتا ہے کہ غزنین سے براہ راست ملتان کا راستہ چھوڑ کر پنجاب کے راستہ سے ملتان کا جانے کی کیا وجہ تھی، باقی ابوالفتوح کا اپنے خزانہ کو سر اندیپ منتقل کر دینا

---

[1] کامل ابن اثیر ج ۹ ص ۱۳۲ (لیڈن) [2] ابن خلدون ج ۴ ص ۳۶۶ (مصر)

بے اصل ہے۔ شاید اس زمانہ کے مؤرخ کو معلوم نہ ہو کہ ملتان اور سراندیپ میں کتنا فصل ہے، ممکن ہے کہ اصل نسخہ میں کسی اور شہر کا نام ہو اور غلطی سے سراندیپ چھپ گیا ہو۔ اسی کے بعد سنہ ۴۰۳ھ میں مصر کے فاطمی خلیفہ نے سلطان محمود سے تعلق پیدا کرنا چاہا مگر سلطان نے قبول نہ کیا اور سفیر مارا گیا جیسا کہ پہلے گذر چکا۔

اس سلسلہ میں نہایت اہم چیز دروزیوں کی مقدس کتاب کا ایک ٹکڑا ہے مصر کے اسماعیلی خلیفۃ الحاکم بامر اللہ (سنہ ۳۸۶ھ۔ سنہ ۴۱۱ھ) نے مصر و شام میں جو اپنا خاص فرقہ پیدا کیا تھا اسی کا نام دروزی ہے اور جو آج بھی شام و لبنان میں آباد ہے۔ بہر حال دروز کی اس کتاب میں ایک تحریر ہے جو سنہ ۴۲۳ھ کی ہے اس کے بعض فقرے یہ ہیں:۔[1]

''ملتان اور ہندوستان کے اہل توحید کے نام عموماً اور شیخ ابن سومر راجہ پال کے نام خصوصاً''۔

سنہ ۴۲۳ھ سلطان محمود المتوفی سنہ ۴۲۱ھ کے جانشین بیٹے سلطان مسعود کا زمانہ ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ غزنویوں کے ملتان فتح کر لینے کے بعد بھی ملتان ان لوگوں کا مرکز تھا بلکہ معلوم ہوتا ہے کہ غزنویوں کی کمزوری کے بعد ملتان پر پھر اسماعیلیوں نے قبضہ کر لیا تھا، کیوں کہ سلطان شہاب الدین غوری کے زمانہ میں ہم پھر ملتان پر اسماعیلیوں کو حکمراں پاتے ہیں۔ چنانچہ سنہ ۵۷۲ھ میں سلطان کو قرامطہ (اسماعیلیہ) کے ہاتھوں سے پھر ملتان کو نکالنا پڑا۔[2] اور آخر دہلی کی حکومت کا وہ ایک جزء ہو گیا۔

فرمانروایان ملتان کا سلسلہ

اوپر کے بیان سے فرمانروایان ملتان کے تین مختلف سلسلے ظاہر ہوتے ہیں۔

۱۔ منبہ بن اسد جو اسامہ بن لوی کے خاندان قریش میں سے تھا اور جس کے خاندان کو بنو منبہ کہتے تھے اور جس کا پتہ سنہ ۲۹۰ھ سے سنہ ۳۴۰ھ تک (ابن رستہ سے

---

[1] ضمیمہ الیٹ ج ۱ ص ۴۹۱۔ [2] فرشتہ ج ۱ ص ۵۶ و جلد دوم ص ۳۲۴ نولکشور۔

اصطخری تک) یقینی طور سے لگتا ہے۔

۲۔ جلہم بن شیبان جو بیرونی کے بیان کے مطابق وہ شخص ہے جو پہلا قرمطی یا اسماعیلی تھا جس نے ملتان پر قبضہ کیا تھا اس کا زمانہ سنہ ۳۴۰ھ بلکہ سنہ ۳۶۷ھ اور ۳۷۵ھ کے درمیان ہے یعنی اصطخری بلکہ ابن حوقل اور بشاری کے بیچ میں کیوں کہ بشاری پہلا عرب سیاح ہے جو ملتان اور مصر کے فاطمیوں کے درمیان تعلق کا ذکر کرتا ہے۔

۳۔ شیخ حمید اور اس کا بیٹا نصیر یا نصر اور اس کا بیٹا ابوالفتح یا ابوالفتوح داؤد قرمطی، شیخ حمید الپ تگین اور سبکتگین کا معاصر تھا یعنی سنہ ۳۵۱ھ سے سنہ ۳۹۰ھ تک شیخ حمید اور اس کے بیٹے نصر کا (گروہ بھی فرماں روا ہوا ہو) زمانہ قرار دیا جاسکتا ہے اور سلطان محمود کا معاصر ابوالفتح داؤد تھا، اس لیے اس کی فرماں روائی کا عہد سنہ ۳۹۰ھ سے سنہ ۳۹۶ تک (ملتان کی پہلی فتح کا سنہ) بلکہ سنہ ۴۰۱ھ (ملتان کی دوسری فتح اور داؤد کی گرفتاری) تک ہوگا۔

پہلے اور دوسرے خاندانوں سے فارسی مؤرخین واقف نہیں ہیں بہر حال وہ عرب سیاحوں کے بیان کے مطابق خالص عرب تھے۔ تیسرے سلسلہ سے سلطان محمود کے تعلق سے فارسی مؤرخین کی واقفیت ہے۔ اس سلسلہ میں یہ تصحیح کر لیجئے کہ جس کو وہ ابوالفتح کہتے ہیں۔ اس کی عربی کنیت ابوالفتوح تھی اور جس کو وہ نصیر لکھتے ہیں وہ گردیزی کی سب سے پرانی سند کے مطابق نصر تھا۔ یہ لفظی تصحیح اس لئے اہم ہے کہ فرشتہ وغیرہ نے ان کو لودھی اور پٹھانوں کے خاندان سے منسوب کیا ہے مگر یہ نام شیخ حمید، نصر، داؤد خالص عربی قسم کے نام ہیں اور نصیر کے بجائے اور زیادہ نصر خالص عربی الوضع ہے۔ اسی طرح کنیت (ابوالفتح یا ابوالفتوح) خاص عربی کی نشانی ہے اور خصوصاً ابوالفتح جمع کی صورت میں) اور اس کے بعد لفظ ''شیخ'' کا اعزازی لقب خالص عربی ہے اور اسماعیلی باطنیوں میں لفظ ''شیخ'' خاص طور سے ''امیر'' کے معنی میں استعمال ہوتا تھا کیوں کہ اس کی شان سیاسی سے زیادہ مذہبی ہوتی تھی، اسی لئے خود حسن بن صباح کو شیخ الجمال (پہاڑی علاقوں کا شیخ) کہتے تھے ان وجوہ

سے ان کو لودھی اور پٹھان بنانے کی داستان فرضی معلوم ہوتی ہے۔ اس زمانہ میں تو پٹھانوں میں اسلام کا رواج بھی بمشکل تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ اس بنا پر میری رائے یہی ہے کہ شیخ حمید، شیخ نصر اور ابوالفتوح داؤد وغیرہ نسباً عرب اور نسلاً جلم بن شیبان ہی کی اولاد ہوں گے۔ ہندوستان کے ایک مشہور مصنف [1] نے یہ بالکل بے ثبوت بات لکھ دی ہے کہ یہ ابوالفتوح داؤد وہی تھا جو سندھ کی تاریخ میں سومرہ کے نام سے مشہور ہے۔ سومرہ اس کا ہندو اور ابوالفتح اس کا اسلامی نام تھا۔ یہ غلطی اس لئے سرزد ہوئی کہ وہ سمجھے کہ ملتان اور منصورہ دونوں میں ایک ہی خاندان کی حکومت تھی اس لئے جب ملتان کے سلسلے میں اس کا نام ابوالفتح تھا اور سندھ کے سلسلہ میں سومرہ کو ہونا چاہیے تو درحقیقت یہ دونوں نام ایک ہی شخص کے ہوں گے حالاں کہ یہ قطعاً غلط ہے۔

کتاب الدروز کے خط کے ان ابتدائی فقروں سے ''ملتان اور ہندوستان کے عام سرحدوں اور خاص کر شیخ ابن سومر راجہ بل کے نام'' یہ استدلال نہیں کیا جا سکتا کہ ابن سومری ملتان کا بادشاہ تھا۔ ملتان کے سلسلہ میں سومر کا نام نہ کسی مؤرخ نے لیا ہے اور نہ اور کسی سند سے ثابت ہے۔ سومریوں کا تعلق صرف سندھ سے تھا جو مدت سے ملتان سے بالکل الگ اور مستقل ریاست تھی جیسا کہ عرب سیاحوں کے متفقہ بیان سے بلا اشتباہ ثابت ہے۔ یہ البتہ اس خط سے ثابت ہوتا ہے کہ ابوالفتح داؤد امیر ملتان اور سومر ایک ہی مذہب کے پیرو تھے اور غالباً ابوالفتح کے زوال اور قید کے بعد یہ سومر سندھ کے قرامطہ کا مذہبی شیخ و امام مقرر ہوا ہو۔

شیخ حمید وغیرہ کے پٹھان ہونے کے متعلق ایک بات یہ ہو سکتی ہے کہ اسماعیلیوں کا یہ قاعدہ رہا ہے کہ وہ اکثر قوموں میں تبلیغ کی آسانی کی خاطر یہ کرتے تھے کہ وہ اپنے کو ان

---

[1] مولوی عبدالحلیم صاحب شرر مرحوم نے اپنی تاریخ سندھ کے جلد دوم صفحہ ۹ میں اور پھر صفحہ ۲۲ میں یہ لکھا ہے۔ شاید مولانا کو الفاظ الیٹ کے (جلد اول صفحہ ۴۹۱) سے کچھ غلط فہمی ہوئی ہو۔

سے قریب کرنے کے لئے ان سے نسلی اور مذہبی قرب اختیار کر لیتے تھے۔ اس طرح شیخ حمید وغیرہ تھے پٹھانوں کو اپنے ساتھ ملانے کے لئے اپنے پٹھان مشہور کر دیا ہو مگر ہند و اصل و نسل سے ان کا ہرگز کوئی تعلق نہیں اور نہ ان کے نام کے ساتھ کبھی کوئی ہندی لفظ استعمال ہوا ہے۔

ملتان کا ہندی اسلامی تمدن

ملتان میں عربی و ہندی تمدن و معاشرت کی خوش گوار آمیزش پیدا ہو گئی تھی۔ شہر گو چھوٹا لیکن خوبصورت تھا، بازار بھی ہر پیشہ والوں کے الگ الگ تھے۔ شہر کے چاروں طرف فصیل تھی۔ ملتان سے باہر امیر کا جو فوجی معسکر تھا وہاں بھی بلند عمارتیں قائم تھیں۔ بیرونی نے بتایا ہے کہ شہر میں محمد بن قاسم کی بنوائی ہوئی جامع مسجد تھی (سنہ ۳۴۰ھ اور سنہ ۳۷۵ھ کے بیچ میں غالباً)۔ جلم بن شیبان اسماعیلی قرامطی نے اس کو بند کر دیا کہ وہ بنو امیہ کی یادگار تھی اور سورج دیوتا والے مشہور بت خانہ کو توڑ کر جامع مسجد بنوایا۔ سلطان محمود نے (سنہ ۳۹۶ھ یا سنہ ۴۰۳ھ) جب ملتان فتح کیا تو پھر پہلی جامع مسجد کو کھول دیا اور دوسری کو بے مرمت چھوڑ دیا۔ بیرونی کے زمانہ تصنیف کے وقت (سنہ ۴۲۴ھ میں) وہ گر کر میدان ہو گیا تھا جس میں مہندی کے درخت لگے تھے۔

اصطخری نے (سنہ ۳۴۰ھ) لکھا ہے کہ ملتان کا امیر ہاتھی پر سوار ہو کر جمعہ کی نماز کے لئے جامع مسجد جاتا ہے۔ یہ خالص ہندو راجاؤں کی پرشان و شکوہ سواری گویا عرب امیروں کو پسند آ چکی تھی۔ پھر کہتا ہے کہ ملتان کے لوگ پاجامہ پہنتے ہیں اور اکثر لوگ فارسی اور سندھی بھی بولتے ہیں، غرض ہندوؤں اور مسلمانوں میں لباس اور زبان کی یکسانی بھی پیدا ہو چکی تھی۔

ابن حوقل (سنہ ۳۶۷ھ) نے یہاں کے طرز لباس اور زبان کے متعلق اسی قسم کا بیان دیا ہے۔ کہتا ہے:

''یہاں مسلمانوں اور ہندوؤں کا لباس ایک ہی طرح کا ہے اور بالوں کے چھوڑنے کا بھی وہی ایک طریقہ ہے اور اسی طرح ملتان والوں کی وضع ہے۔ اور منصورہ اور ملتان اور اس کے اطراف میں عربی اور سندھی بولی جاتی ہے اور مکران والوں کی بولی فارسی اور مکرانی ہے اور کرتوں کا لباس نمایاں ہے مگر تاجر لوگ قمیص اور چادر استعمال کرتے ہیں جس طرح عراق اور فارس کے لوگ''۔[1]

سنہ ۳۷۵ھ میں بشاری آیا۔ اس نے یہاں کے اخلاق اور تمدن کا بہت کچھ اچھا نقشہ کھینچا ہے۔ کہتا ہے:

''ملتان منصورہ سے چھوٹا ہے مگر اس سے زیادہ آباد ہے پھل تو زیادہ نہیں مگر سستے ہیں اور (عراق کی بندرگاہ) سیراف کی طرح سال کی لکڑی کے کئی کئی منزل کے مکانات ہیں۔ یہاں بدکاری اور شراب خوری نہیں۔ اور جو اس جرم میں پکڑے جاتے ہیں ان کو قتل کیا جاتا ہے یا کوئی سخت سزا دی جاتی ہے۔ خرید و فروخت میں نہ جھوٹ بولتے ہیں اور نہ کم تولتے ہیں۔ مسافروں کی خاطر کرتے ہیں۔ اکثر باشندے عرب ہیں، نہر کا پانی پیتے ہیں، سرسبزی اور دولت ہے، بیوپار کی حالت بھی اچھی ہے تکلف و تنعم نمایاں ہے۔ حکومت منصفانہ ہے۔ بازار میں کوئی عورت بناؤ سنگار کیے ہوئے نہیں ملے گی، اور نہ کوئی اس سے راستہ میں علانیہ بات کرتا ہے۔ پانی اچھا، زندگی عیش و مسرت کی اور خوش دلی اور مروت ہے۔ فارسی زبان سمجھی جاتی ہے، تجارت کا نفع خاصہ ہے۔ جسم میں تندرستی ہے لیکن شہر میلا ہے۔ مکانات تنگ ہیں، ہوا خشک اور گرم ہے،

---

[1] سفرنامہ ابن حوقل ص ۲۳۲ (لیڈن)

رنگ گندم گوں اور سیاہ ہے''۔[۱]

''ملتان کا سکہ مصر کے فاطمی سکہ کے مطابق بنایا گیا ہے لیکن زیادہ تر 'قنہر یات' وہاں چلتے ہیں''۔[۲]

منصورہ

عربوں میں سندھ کا سب سے بڑا شہر برہمن آباد مشہور ہے جس کا اصلی ہندی نام جیسا کہ بیرونی نے بتایا ہے بہمنوا ہے۔ اہل ایران اس کو برہمن آباد کہتے تھے۔ یہی نام مسلمانوں میں رائج ہوا۔ اس کے بعد بعض فوجی اور سیاسی ضرورتوں سے سندھ میں عربوں کو خود اپنے شہر بسانے پڑے جن میں محفوظہ، بیضاء اور منصورہ زیادہ مشہور ہوئے۔

بنوامیہ کے اخیر زمانہ میں اہل عرب کی قوت جب کمزور ہوئی اور سندھیوں نے ان کو سواحل کی طرف ڈھکیلنا شروع کیا۔ اس وقت کے عرب والی حکم بن عوانہ کلبی نے سب عربوں کو سمیٹ کر ایک جگہ جمع کیا اور دریا پار ایک شہر بسایا جس کا نام محفوظہ رکھا۔

حکم کے ساتھ محمد بن قاسم کا لڑکا عمرو بھی تھا جو نہایت بہادر اور مدبر تھا۔ حکم کے تمام کام وہی انجام دیتا تھا۔ اس نے سمندر کے ساحل پر برہمن آباد سے دو فرسخ پر منصورہ آباد کیا۔[۳]

عباسیوں کے زمانہ میں معتصم باللہ کے عہد میں (تیسری صدی ہجری کا وسط) برمکی خاندان کا ایک رکن عمران بن موسیٰ بن یحییٰ بن خالد جب سندھ کا والی مقرر ہوا تو اس نے بیضاء نام شہر آباد کیا۔

مگر ان سب میں سے قدرت کی طرف سے شہرت اور بقا منصورہ کے حصہ میں آئی۔

---

[۱] احسن التقاسیم بشاری ص ۴۸۰ (لیڈن) [۲] احسن التقاسیم ص ۴۸۲، قنہری کوئی معمولی سکہ معلوم ہوتا ہے الیٹ نے خدا جانے اس کو قندھاریات کر کے لکھ دیا ہے کہ یہ قندھار میں مضروب ہوتے تھے مگر یہ بے ثبوت بات ہے کہ اور لفظ کی تحریف ہے۔ [۳] فتوح البلدان بلاذری ص ۴۴۲ (لیڈن)

منصورہ کا بانی

شہر منصورہ کا نام منصورہ کیوں پڑا؟ بعض لوگوں نے غلطی سے یہ سمجھا کہ یہ خلیفہ منصور عباسی کے زمانہ میں بنا۔ اس کی نسبت سے یہ منصورہ کہلاتا ہے حالاں کہ یہ قطعاً غلط ہے کیوں کہ یہ شہر تو بنوامیہ کے زمانہ ہی میں بن چکا تھا۔ اسی طرح مسعودی نے اس کو منصورہ بن جمہور کی طرف منسوب کیا ہے۔[1] جو بنوامیہ کے اختلال اور عباسیہ کے آغاز قیام کے زمانہ میں سندھ کا حکمراں بن بیٹھا تھا۔ مگر یہ بھی صحیح نہیں، اصل یہ ہے کہ نام کا دھوکا نہیں کھانا چاہئے۔ اس کا بانی جیسا کہ ہمارے قدیم ترین ماخذ بلاذری المتوفی سنہ ۲۷۹ھ کا بیان ہے محمد بن قاسم کا لڑکا عمرو تھا، اس لئے منصورہ (مدد دیا گیا) کو ایسا نام سمجھنا چاہئے جو محفوظہ کی طرح محض خوش فالی کے لئے رکھا گیا تھا۔

بنا کا زمانہ

حکم جس کے زمانہ میں عمرو نے اس شہر کو بسایا، وہ عراق کے امیر خالد بن عبداللہ قسریؒ کا فرستادہ تھا۔ خالد سنہ ۱۰۵ھ میں عراق کا امیر بنا اور سنہ ۱۱۰ھ میں معزول ہوا۔ حکم خالد کا بھیجا ہوا سندھ کا دوسرا والی تھا، اس لئے غالباً سنہ ۱۱۰ھ سے اس کا زمانہ شروع ہوا ہوگا۔ اس قیاس سے منصورہ کی بنا کی تاریخ سنہ ۱۱۰ھ سے سنہ ۱۲۰ھ تک متعین کرنی چاہئے۔

جائے وقوع

سب سے پہلے ابن خرداذبہ (سنہ ۲۵۰ھ) منصورہ کی جگہ دریائے سندھ کے کنارے بتاتا ہے۔[2] پھر بلاذری (سنہ ۲۷۹ھ) کہتا ہے کہ ''وہ دریا کے ادھر ہی بسایا گیا تھا''۔[3] ابن حوقل اور اصطخری دونوں نے لکھا ہے کہ ''یہ دریائے مہران (سندھ) کے کنارہ ایک ایسی جگہ پر آباد کیا گیا ہے کہ دریا کی ایک شاخ نے نکل کر اس کو جزیرہ کی طرح بنا دیا ہے''۔ بعض عرب جغرافیہ نویسیوں نے اس کا طول بلد مغرب سے ۹۳+ درجہ اور عرض بلد

---

[1] مروج الذہب ج ۱ ص ۳۷۹ [2] المسالک والممالک ابن خرداذبہ ص ۱۷۴ [3] ص ۴۴۴ (لیڈن)

جنوب سے ۱۲ درجہ بتایا ہے[1]۔ خوش قسمتی سے ہمارے سامنے ابن حرقل کا وہ نقشہ ہے جو اس نے اپنے زمانہ میں سندھ کا تیار کیا تھا، اس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دریائے سندھ جو پنجاب کی طرف سے چل کر آخر کار بحر ہند (سمندر) میں جا کر گر جاتا ہے۔ اس مقام سے تھوڑی دور پیچھے خشکی کی سمت میں ایک جگہ دریا کی ایک نئی شاخ نکلتی ہے اور جو فوراً ہی پھر گھوم کر اسی دریا میں مل جاتی ہے اور اس طرح بیچ میں دریا کے کنارے اس شاخ کے احاطہ سے ایک تھوڑی سی زمین جزیرہ کی صورت میں بن گئی ہے، اسی جزیرہ کی شکل میں یہ شہر آباد ہوا تھا جو ہر طرف سے پانی سے گھر کر ناگہانی حملہ آوروں میں محفوظ تھا۔ یہ اسی قسم کا مقام تھا جیسا کہ میسور میں کلوبری ندی کے گھوم جانے سے سرنگاپٹم کا مقام نکل آیا ہے اور اس قسم کا ایک دوسرا مقام ترچناپلی (احاطہ مدراس) میں بھی ہے۔ پرانے زمانہ کے فن جنگ کے لحاظ سے اس قسم کے مقامات بہت محفوظ خیال کیے جاتے تھے۔

ابوالفضل نے آئین اکبری میں تمام مشکلات حل کر دی ہیں۔ اس نے بتایا ہے کہ سندھ کے مشہور شہر بیکر کا پرانا نام منصورہ تھا۔[2] اور حقیقت یہ ہے کہ اس پر منصورہ کی پوری جغرافی تعریف صادق آتی ہے۔ ابوالفضل کہتا ہے "یہاں آ کر چھوروں دریا مل کر ایک ہو جاتے ہیں اور دو حصوں میں بٹ کر اس کے نیچے سے گذرتے ہیں۔ ایک حصہ دکھن اور ایک حصہ اتر ہو کر"۔ بیکر کا نام ہندوستانی تاریخوں میں بہت مانوس ہے اور اب بھی روشناس ہے۔

منصورہ پایہ تخت

منصورہ اپنی جائے وقوع کے لحاظ سے محفوظ بھی تھا اور ساتھ ہی دریا کے ساحل پر اور سمندر کے قریب واقع تھا اور اس لحاظ سے عراق اور ملک عرب سے آمد و رفت اور وقت پڑنے پر یہاں سے نکل جانے کے لئے بھی مناسب تھا۔ اس لئے بہت جلد سندھ میں

---

[1] معجم البلدان یاقوت لفظ منصورہ [2] آئین اکبری جلد دوم ص ۱۶۰، نولکشور۔

عربوں کا پایہ تخت بن گیا۔ تیسری صدی میں ہم اس کا نام پایہ تخت کی حیثیت سے سنتے ہیں۔ بلاذری (المتوفی سنہ ۲۷۹ھ) منصورہ کے ذکر میں کہتا ہے ''یہ وہی شہر ہے جہاں آج کل حکام جا کر ٹھہرتے ہیں''۔[۱] اس کے بعد کے تمام عرب سیاح اس کا اسی حیثیت سے نام لیتے ہیں اور آخر میں وہ ایک قریشی عرب ریاست کا دارالامارت بن جاتا ہے۔

سندھ دور خلافت عباسیہ میں

سندھ کا علاقہ خلیفہ المامون (سنہ ۲۱۸ھ) تک بغداد کے مرکز سے وابستہ رہا، بلکہ اسی کے آخر زمانہ میں عرب امراء خودمختاری کا خواب دیکھنے لگے، چنانچہ بنی سامہ کے غلام فضل بن ماہان نے سندان نام ایک شہر کو فتح کر کے براہ راست خلیفہ المامون سے اپنی امارت کی سند حاصل کی اور وہاں ایک جامع مسجد بنوائی جس میں نماز جمعہ ادا ہوتی تھی اور خلیفہ کے نام کا خطبہ پڑھا جاتا تھا۔ اس کے بعد اس کا بھائی محمد بن فضل بن ماہان حاکم ہوا اور یہ زمانہ معتصم باللہ (سنہ ۲۲۷ھ) کا تھا۔ اس نے ستر جہازوں کے بیڑے کے ساتھ مہدیوں پر حملہ کیا۔ اس کی غیر حاضری میں اس کے بھائی ماہان نے ریاست پر قبضہ کر لیا اور غالباً اسی خانہ جنگی میں ریاست مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل گئی [۲] معتصم باللہ زمانہ میں قندابیل میں محمد بن خلیل نے خودمختاری کا اعلان کر دیا تھا مگر معتصم کے عہدہ دار عمران برمکی والی سندھ نے وہاں کے سرداروں کو گرفتار کر کے قصدار (قزدار) بھیج دیا۔[۳]

عمران برمکی ہی کے زمانہ میں عربوں کے دو مشہور قبیلوں یمنی (قحطانی) اور حجازی (نزاری) میں بعینہ وہی خانہ جنگی شروع ہوئی جس خانہ جنگی نے بنوامیہ کا خاتمہ کر دیا تھا۔ عمران نے یمنیوں کی طرف داری کی۔ اس وقت حجازیوں کا سرکردہ ایک قریشی سردار عمر بن عبدالعزیز ہباری تھا۔ اس نے موقع پا کر عمران کو قتل کر دیا۔[۴]

---

[۱] فتوح البلدان بلاذری ص ۴۴۴ [۲] بلاذری ص ۴۴۶۔ [۳] ایضاً ص ۴۴۵ [۴] ایضاً ص ۴۴۶

سندھ کا ہباری قریشی خاندان

قریش کے خاندان بنو اسد میں پیغمبر اسلام کے زمانہ میں ہبار بن اسود ایک شخص تھا جو اسلام اور پیغمبر اسلام کا سخت دشمن تھا۔ آخر وہ فتح مکہ کے زمانہ میں سنہ ۸ ھ میں مسلمان ہوا۔ اس کی اولاد میں سے ایک شخص حکم بن عوانہ کلبی والی سندھ کی معیت میں سندھ وارد ہوا تھا۔ اسی شخص کا پوتا عمر بن عبدالعزیز ہباری تھا۔[۱] اس کا نسب نامہ یہ ہے: عمر بن عبدالعزیز بن منذر بن زبیر بن عبدالرحمٰن بن ہبار بن اسود۔ یہ خاندان امویوں اور عباسیوں دونوں کے عہد میں سلطنت کے کاروبار میں دخل رکھتا تھا۔[۲] اس نے حجازیوں کا سردار بن کر عمران کو قتل کیا اور اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا ہوگا کہ عمر بن عبدالعزیز ہباری کو سندھ کے حجازی عربوں کی ریاست حاصل ہوگئی ہوگی۔ سنہ ۲۴۰ ھ میں خلیفہ متوکل کے زمانہ میں سندھ کے والی ہارون بن خالد نے جب انتقال کیا تو عمر بن عبدالعزیز نے دربار خلافت میں ایک عریضہ بھیج کر درخواست کی کہ سندھ کی ولایت اس کے سپرد کی جائے۔ خلیفہ نے اس کی درخواست بہر حال منظور کی۔ یعقوبی (المتوفی سنہ ۲۷۸ ھ) جس کی تصنیف کا زمانہ سنہ ۲۵۹ ھ ہے۔ اپنی تاریخ میں لکھتا ہے ''سندھ کے والی ہارون بن خالد نے سنہ ۲۴۰ ھ میں انتقال کیا'' اور عمر بن عبدالعزیز سامی نے جو سامہ بن لوی کی طرف منسوب ہے اور جو سندھ پر قابض ہو چکا تھا، لکھا کہ وہ ملک کا بہت اچھا انتظام کر رہا ہے تو متوکل نے اس کی درخواست قبول کی اور متوکل کے پورے زمانہ خلافت میں وہ مستقل رہا۔[۳]

یعقوبی کا عمر بن عبدالعزیز کو سامہ بن لوی کی نسل سے بتانا صحیح نہیں ہے۔ عمر بن عبدالعزیز ہبار بن اسود کی اولاد سے تھا جو کعب بن لوی کی نسل سے تھا۔ (ابن خلدون ج ۲ ص ۳۲۷ مصر) غالباً یعقوبی کو ملتان کے امیروں کا دھوکا ہوا جو بنو سامہ تھے۔

بہر حال عمر بن عبدالعزیز ہباری کی امارت کے بعد بھی عباسی تعلق قائم رہا۔

---

۱ بلاذری ص ۴۴۶ ۲ ابن خلدون ج ۲ ص ۳۲۷ ۳ تاریخ یعقوبی جلد دوم ص ۵۹۹ (لیڈن)

چنانچہ معتمد کے زمانہ میں (سنہ ۲۵۶۔۲۷۹ھ) بغداد کے انتظامات ملکی میں سندھ کا نام بھی نظر آتا ہے کیوں کہ اس عہد میں خراسان کے صفاری خاندان کے بانی یعقوب بن لیث کو سنہ ۲۵۷ھ میں ترکستان، سجستان، کرمان کے ساتھ سندھ کا علاقہ بھی سپرد ہوتا ہے۔[۱] اور سنہ ۲۶۱ھ میں معتمد اپنے اولوالعزم بھائی موفق کو تمام دیگر مشرقی ممالک کے ساتھ سندھ کی ولایت بھی عطا کرتا ہے اور اسی زمانہ میں ادھر خلیج فارس کے عربی اور عراقی کناروں پر قرمطیوں (قرامطہ) کی بغاوت شروع ہوتی ہے اور ادھر مغرب میں اسماعیلی فاطمیوں کی تحریک اٹھتی ہے جو بالآخر مصر تک چھا جاتی ہے۔

غالباً یہی وہ موزوں زمانہ ہے جب سندھ کا یہ برائے نام رستہ بھی بغداد سے کٹ جاتا ہے۔ بلاذری جو سنہ ۲۷۹ میں مرا ہے وہ لکھتا ہے کہ "بنو کندہ کا آزاد کردہ غلام ابوالصمہ جو تیسری صدی کے شروع کے ایک عباسی والی عمر بن حفص بن ہزار مرد کے ساتھ سندھ گیا تھا۔ اس کا بیٹا صمہ آج کل سندھ میں زبردستی خود مختار بن بیٹھا ہے"۔[۲]

مگر معلوم ہوتا ہے کہ عمر بن عبدالعزیز ہباری کی اولاد نچلی نہیں بیٹھی، خود عمر بن عبدالعزیز ہباری سندھ کے شہر یا بنیا یا بانیہ میں رہتا تھا۔[۳] مگر اس کی اولاد نے مستقل طور سے سندھ زیرین کے علاقہ پر قبضہ کر کے منصورہ کو اپنا پایۂ تخت بنالیا۔ سنہ ۲۷۰ھ میں عمر بن عبدالعزیز ہباری کا بیٹا عبداللہ منصورہ کا فرمانروا تھا۔ اسی کے زمانہ کا واقعہ ہے کہ الرا (الور واقع سندھ) کے ہندو راجہ نے اس سے ایک ایسے مسلمان مبلغ اور عالم کی فرمایش کی تھی جو اس کو دین اسلام سے آگاہ کر سکے۔[۴] سنہ ۳۰۳ھ میں جب مسعودی آتا ہے تو وہ اس عبداللہ کے بیٹے عمر کو منصورہ کا فرمانروا پاتا ہے اور ساتھ ہی بہت سے عرب سردار وہاں اس کو ملتے ہیں، سادات اور علوی خاندان کے لوگ بھی وہاں نظر آتے ہیں۔ بادشاہ کا نام عمر بن عبداللہ

---

[۱] تاریخ ابن خلدون جلد ۲ ص ۴۴۳ (مصر) [۲] بلاذری ص ۴۴۵ [۳] ابن حرقل ذکر السند [۴] عجائب الہند، بزرگ بن شہریار ص ۳ (لیڈن)

وزیر کا نام ریاح اور قاضی ال ابی الشوارب تھے۔ مسعودی کی اصل عبارت یہ ہے: [1]

''میرے منصورہ پہنچنے کے زمانہ میں ابوالمنذر عمر بن عبداللہ بادشاہ تھا اور وہیں اس کے وزیر ریاح اور اس کے دونوں بیٹوں محمد اور علی کو دیکھا اور ایک اور عرب سردار کو جو وہاں کے بادشاہوں میں سے ایک بادشاہ تھا، جس کا نام حمزہ تھا۔ [2] اور حضرت علی بن ابی طالب کی بہت سی اولاد کرام! وہاں نظر آئی جو عمر بن علی اور محمد بن علی کی نسل سے تھی۔ منصورہ کے بادشاہوں اور وہاں کے قاضی کے خاندان ال ابی الشوارب میں قرابت تھی اور منصورہ کے یہ بادشاہ ہبار بن اسود کی اولاد ہیں جو بنو عمر بن عبدالعزیز کہلاتے ہیں''۔

مسعودی کے بعد سنہ ۳۶۷ ھ میں ابن حرقل آیا، اس وقت تک یہی خاندان یہاں حکمراں تھا اور گو خلافت عباسیہ سے کوئی سیاسی و انتظامی تعلق باقی نہیں رہا تھا مگر مذہبی رشتہ باقی تھا، چنانچہ عباسی ہی خلفاء کے نام کا وہ خطبہ پڑھتے تھے۔ اصل عبارت یہ ہے: [3]

''ملک کا بادشاہ ایک قریشی ہے جس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ وہ ہبار بن اسود کی نسل سے ہے۔ اس کے باپ دادا اس ملک پر حکمران تھے اور اب وہ ہے مگر خطبہ خلیفۂ بغداد ہی کے نام کا پڑھا جاتا ہے''۔

سنہ ۳۷۵ ھ میں مقدسی جب آیا تو اسی خاندان کو اسی طرح حکمراں پایا لیکن اس

---

[1] مروج الذہب مسعودی جلد اول ص ۳۷۷۔ [2] ڈاکٹر برڈ (Bird) جن کا حوالہ الیٹ نے دیا ہے، (ج ۱ ص ۴۸۸) انہوں نے اس فقرہ کا مطلب بالکل غلط سمجھا ہے کہ ''یہاں حمزہ سید الشہداء کی اولاد آکر بسی تھی''۔ حمزہ کے نام سے ان کو شبہ ہوا، یہ حمزہ آنحضرت ﷺ کے چچا حمزہ نہیں بلکہ کوئی حمزہ نام دوسرا عرب سردار تھا، اور مسعودی خود حمزہ کا ذکر کر رہا ہے اور اس کی اولاد کا نہیں۔ حضرت حمزہ کی کوئی اولاد نرینہ نہ تھی اور نہ ان کی نسل پھیلی۔ [3] سفرنامہ ابن حرقل ذکر السند۔

درمیان میں دیلمیوں کا شیعی خاندان جو فارس پر حکومت کر رہا تھا اس کا اثر بھی بلوچستان کے راستے سے سندھ تک پہنچ رہا تھا۔ تاہم خلیفہ بغداد کا نام بھی باقی تھا۔ بشاری کہتا ہے:-[1]

''منصورہ پر ایک سلطان کی حکومت ہے جو قریش کے خاندان سے ہے، لیکن وہ خطبہ خلیفہ عباسی کا پڑھتے ہیں اور کبھی عضدالدولہ (دیلمی) کا خطبہ پڑھتے تھے۔ جس زمانہ میں ہم شیراز میں تھے اس وقت یہاں سے ایک سفیر شیراز عضدالدولہ کے بیٹے کے پاس گیا تھا''۔

شہر منصورہ کی آبادی اور وسعت

ابن حوقل کا بیان ہے کہ منصورہ ایک میل لمبا اور ایک ہی میل چوڑا تھا، اور چاروں طرف دریا سے گھرا ہوا تھا، یہاں کے باشندے مسلمان تھے۔ بشاری کہتا ہے کہ ''منصورہ سندھ کا مرکزی شہر اور ملک کا دارالحکومت ہے۔ دمشق کی طرح ہے، مکانات لکڑی اور مٹی کے ہیں، جامع مسجد اینٹ اور پتھر سے بنی ہے اور بڑی ہے اور عمان کی جامع مسجد کی طرح حال کی لکڑی کے ستونوں پر قائم ہے.....بیچ بازار میں واقع ہے .....شہر میں چار دروازے ایک کا نام باب البحر (دریا کا دروازہ) دوسرے کا طوران دروازہ، تیسرے کا نام سندان دروازہ ہے، چوتھے کا نام ملتان دروازہ''۔[2]

مملکت منصور کی وسعت اور سرسبزی

اس عرب حکومت کی وسعت میں سندھ کے متعدد شہر تھے۔ بشاری کہتا ہے کہ سندھ کا دارالحکومت منصورہ ہے اور اس کے شہروں میں سے دیبل، زندریج، کدار، مایل بتلی ہے۔ اصطخری نے اور بعض شہر بھی اس میں گنائے ہیں، جیسے بانیہ، سدوسان، الور، سوبارہ، صیمور، مسعودی کا بیان ہے کہ ''منصورہ کے دائرہ حکومت میں جو گاؤں اور آبادیاں ہیں ان کا شمار تین لاکھ کا ہے۔ اس سے اندازہ ہوگا کہ منصورہ کی حکومت خاصی بڑی تھی''۔ پھر مسعودی

---

[1] احسن التقاسیم بشاری ص ۴۸۵ [2] احسن التقاسیم ص ۴۷۹

کہتا ہے کہ ''تمام کھیت ہیں، درخت ہیں، اور آبادیاں ملی ملی ہیں'' ۔[۱] اس سے اس کی سرسبزی اور آبادی کا قیاس ہوسکتا ہے۔

بادشاہ کی جنگی قوت

مسعودی کہتا ہے کہ:-

''منصورہ والوں کی میدیون کے ساتھ جو سندھ کی ایک قوم ہے برابر لڑائیاں رہتی ہیں۔ بادشاہ کے پاس ۸۰ جنگی ہاتھی ہیں اور قاعدہ یہ ہے کہ ایک جنگی ہاتھی کے ساتھ پانچ سو پیادہ فوج ہوتی ہے۔ ان میں سے دو ہاتھی نہایت مشہور بہادر اور لڑنے والے تھے۔ ان میں سے ایک کا نام منصر قلس اور دوسرے کا نام حیدرہ تھا، اور یہ سدھائے ہوئے تھے'' ۔[۲]

مسعودی نے گویا ہم کو منصورہ کی پوری فوجی قوت بتادی، ایک ہاتھی کے ساتھ پانچ سو آدمی ہوتے ہیں۔ تو اسی ہاتھیوں کے ساتھ چالیس ہزار فوج ہوگی۔

منصورہ کی علمی اور مذہبی حالت

اس کے متعلق سب سے بہتر بیان بشاری نے اپنے سفرنامہ میں قلم بند کیا ہے۔ کہتا ہے:-

''یہاں کے باشندے لائق اور بامروت ہیں، ان کے ہاں اسلام کو تازگی حاصل ہے، اور علم اور اہل علم یہاں بہت ہیں، ان میں ذہانت وذکاوت ہے اور نیکی اور خیرات کرتے ہیں'' ۔[۳]

''اہل ذمہ (غیر مسلم رعایا) بت پوجتے ہیں، مسلمانوں میں واعظوں کا وجود نہیں، مسلمانوں میں اکثر اہل حدیث ہیں۔ میں نے یہاں قاضی ابو محمد منصوری کو دیکھا جو داؤدی تھے اور اپنے مذہب کے امام

---

[۱] مروج الذہب ج ۱ ص ۳۷۸ [۲] ایضاً [۳] مروج الذہب ج ۱ ص ۳۷۹۔ احسن التقاسیم ص ۴۷۹

تھے، اور ان کا حلقہ درس تھا، اور ان کی تصنیفیں ہیں، ان کی بہت سی اچھی تصنیفات ہیں، ..... بڑے بڑے شہروں میں حنفی فقہا بھی پائے جاتے ہیں لیکن یہاں مالکی اور حنبلی نہیں، اور نہ معتزلی ہیں، سیدھے اور صحیح مسلک پر ہیں اور نیکی اور پاکدامنی ہے''۔[1]

اس قدیم عہد میں یہاں اہل حدیث کا ہونا بڑی حیرت انگیز بات ہے۔ داؤدی فرقہ سے مراد داؤدی بوہرے نہیں بلکہ امام داؤد ظاہری کے پیرو مراد ہیں، جو ایک قسم کے اہل حدیث ہی تھے۔

زبان

مسعودی کہتا ہے کہ ''سندھ کی زبان خاص ہے، ہندوستان سے الگ'' بشاری منصورہ کی بندرگاہ دیبل کے متعلق کہتا ہے کہ یہاں کل کے کل تاجر بستے ہیں؛ ان کی زبان سندھی اور عربی ہے''۔ اس سے یہ قیاس ہوسکتا ہے کہ یہاں کی زبان پر عربی کا کتنا گہرا اثر پڑا ہوگا جس کا ثبوت آج بھی موجود ہے، کہ ان کی سندھی زبان میں عربی کے الفاظ اسی طرح ملے ہوئے ہیں جس طرح ہماری اردو میں، اور سب سے بڑا اثر یہ ہے کہ سندھی کا خط آج بھی بعینہ عربی ہے۔

منصورہ کا خاتمہ

منصورہ کی عربی حکومت کا خاتمہ کیوں کر ہوا، اس کے متعلق کوئی تصریحی بات نہیں ملتی۔ بشاری کے زمانہ یعنی سنہ ۳۷۵ھ تک وہ یقیناً قائم تھی۔ اس کے پندرہ برس کے بعد محمود کے حملے شروع ہوتے ہیں۔ سنہ ۴۱۶ھ میں جب سلطان محمود نے سومنات پر اپنا مشہور حملہ کیا ہے تو وہاں سے واپسی میں اس نے سندھ کا راستہ اختیار کیا، گجرات سے سندھ اور سندھ سے دریائے سندھ کے کنارے کنارے ملتان اور ملتان سے غزنین۔ اس راستہ میں

---

[1] احسن التقاسیم ص ۴۸۱۔

مؤرخین نے تصریح کی ہے کہ وہ منصورہ ہو کر گذرا۔ لیکن ابن اثیر نے اپنی تاریخ کامل میں اسی سال کے واقعات کے ضمن میں ایک اہم فقرہ لکھا ہے:- [۲]

''اور سلطان نے منصورہ کا قصد کیا، یہاں کا والی اسلام سے پھر گیا تھا، تو جب اس کو سلطان کی آمد کی خبر ہوئی تو شہر سے نکل گیا، اپنے آدمیوں کو لے کر جھاڑیوں میں چھپ گیا، سلطان محمود نے اس کا تعاقب کیا، بہت سے آدمی مارے گئے اور بہت سے دریا میں ڈوب کر مر گئے۔ تھوڑے بچ گئے، وہاں سے سلطان بھاٹیہ ہو کر غزنین چلا گیا'' [۳]

سوال یہ ہے کہ ''اسلام سے پھر جانے اور مرتد ہو جانے'' کے کیا معنی؟ اگر اس حملہ کو مسلمانوں کے نزدیک بجا ثابت کرنے کے لیے والی منصورہ کو مرتد مشہور نہ کیا گیا ہو تو اس زمانہ کے محاورہ کے مطابق اس کے یہ معنی قرار دیئے جائیں گے کہ ملتان کی طرح منصورہ کا بادشاہ بھی شاید اسماعیلی قرمطی مذہب میں داخل ہو گیا ہو، ورنہ اس حملہ سے ۴۱ برس پہلے بشاری کی شہادت اہل منصورہ کے سنی بلکہ اہل حدیث ہونے کی تمام تر شہادت موجود ہے۔ بہر حال اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ منصورہ کی اس ہباری حکومت کا سنہ ۴۱۶ھ میں سلطان محمود کے ہاتھ سے خاتمہ ہوا۔ مشہور محقق ابن خلدون ایک موقع پر ہبار بن اسود کے خاندانی تذکرہ میں لکھتا ہے:-

''انہیں ہبار بن اسود کی نسل سے عمر بن عبدالعزیز تھا جو خلیفہ متوکل کے قتل کے بعد شروع ہنگامہ میں سندھ پر قابض ہو گیا تھا اس کی

---

[۱] زین الاخبار گردیزی ص ۸۷ (برلن) [۲] کامل ابن اثیر ج ۹ ص ۱۱۸ (لیڈن) [۳] الیٹ نے ابن اثیر کے حوالے سے لکھا ہے کہ ''سلطان محمود نے ایک مسلمان کو منصورہ کا بادشاہ بنایا'' (جلد اول) مگر ابن اثیر میں یہ فقرہ نہیں بلکہ وہ بیان ہے جو میں نے لکھا ہے۔ اس سے یہ غلطی شاید کسی یورپین ترجمہ پر اعتقاد کرنے سے ہوئی ہے۔

اولاد نے سندھ پر یکے بعد دیگرے حکومت کی، یہاں تک کہ غزنین کے سلطان محمود کے ہاتھوں ان کا خاتمہ ہوا۔ ان کا پایہ تخت منصورہ تھا'' [1]

کیا منصورہ والے بھی قرمطی اسماعیلی تھے؟

اوپر کی سطروں میں بشاری نے جو خود ایک فقیہ و عالم تھا جس دھوم دھام سے سنہ ۳۷۵ھ میں اہل منصورہ کے دیندار اہل سنت ہونے کی شہادت دی ہے، اس کو پیش نظر رکھتے ہوئے سنہ ۴۱۶ھ میں ان کا قرمطی ہونا مشکل معلوم ہوتا ہے۔ ابن خلدون کے بیان سے ثابت ہے کہ محمود نے ہباری امیر کے ہاتھ سے سندھ کی ریاست چھینی اور ابن اثیر کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ جس امیر کے ہاتھ سے اس نے سلطنت چھینی اس کے متعلق سلطان کو یہ معلوم ہوا کہ وہ مرتد ہو گیا ہے، جس کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ وہ قرمطی اسماعیلی ہو گیا تھا۔

جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے اہل منصورہ کے قرمطی اسماعیلی ہو جانے کی شہرت منصورہ کی اسلامی ریاست پر سلطان کے حملہ کے جواز کے لئے نہیں دی گئیں تو ابن اثیر کے بیان سے بھی سمجھ سکتے ہیں کہ سنہ ۳۷۵ھ کے بعد ہباری سنی خاندان کا خاتمہ قرمطیوں نے کیا یا ملتان کے ان کے ہاتھ سے نکل جانے کے بعد انہوں نے سندھ میں اپنی ریاست قائم کر لی اور اسی قرمطی ریاست کا سلطان محمود نے سنہ ۴۱۶ھ میں خاتمہ کیا۔

دروزی خط

جس دروزی خط کا اقتباس پہلے گذر چکا ہے اس کی حیثیت اس مسئلہ میں بھی نہایت اہم ہے۔ اس دروزی خط میں جو شام کے اسماعیلی دروزیوں کے مذہبی امام کی طرف سے بھیجا گیا ہے یہ لکھا ہے:-

''ملتان اور ہندوستان کے موحدوں کے نام عموماً اور شیخ ابن سومر راجہ بل (پال) کے نام خصوصاً''۔

---

[1] تاریخ ابن خلدون جلد ۴ ص ۳۲۷ (مصر)

اس خط میں ابن سومر راجہ بل کو جائز وارث بھوترا اور ہوُ دل ہیلا کا لکھا ہے۔ اسی خط میں اس خاندان کے اور بہت سے ارکان کے نام لکھے ہیں جن میں بعض عربی اور بعض ہندی نام ہیں، اوران کو غیرت دلا کر لکھا ہے کہ:۔

> ''اے معزز راجہ بل، اپنے خاندان کو اٹھا، موحدین کو اور داؤد اصغر (چھوٹے داؤد) کو سچے دین میں واپس لا کہ مسعود نے جو اسے حال ہی میں قید اور غلامی سے آزاد کیا ہے وہ اس وجہ سے ہے کہ تو اس فرض کو انجام دے سکے جو تجھ کو اس کے بھانجے عبداللہ اور ملتان کے تمام باشندوں کے برخلاف انجام دینے کے لئے مقرر کیا گیا ہے تاکہ تقدیس [۱] اور توحید کے ماننے والے جہالت، ضد، اور سرکشی و بغاوت والی جماعت سے ممتاز ہو جائیں'' [۲]

اس خط سے نہایت اہم تاریخ نکالے جاسکتے ہیں۔

۱۔ سومر جو سندھ کے باشندہ تھے اور جو اس کے بعد سومری خاندان کے بانی ہوئے، وہ اسماعیلی مذہب کے تھے۔

۲۔ ان کے نام ہندوانہ اور عربی قسم کے ہیں جن سے پتہ لگتا ہے کہ یہ خاندان عربی ہندی آمیز تھا۔

۳۔ ملتان کے بادشاہ ابوالفتح داؤد وغیرہ اور سندھ کے یہ سومری ایک ہی مذہب کے پیرو تھے۔

۴۔ سومر غالباً سندھ کے اسماعیلیوں کا ''شیخ'' اور امام تھا کیوں کہ شیخ خاص طور سے اسماعیلی اپنے مذہبی سردار کے لئے استعمال کرتے تھے۔

---

[۱] اسماعیلیوں کا بار بار توحید و تقدیس کا دعویٰ اس بنا پر ہے کہ وہ خدا میں صفات کا ملانا جیسا عام اہل سنت مانتے ہیں شرک سمجھتے تھے۔ وہ نفی صفات کے قائل تھے، جس کا نام ان کے ہاں توحید و تقدیس تھا، معتزلہ کا بھی یہی عقیدہ تھا، اس لئے وہ بھی اپنے کو اول عدل و توحید کہتے تھے۔ [۲] الیٹ جلد اول ص ۴۶۱

۵۔ معلوم ہوتا ہے کہ ابوالفتح داؤد کے بعد اس کا کوئی بیٹا تھا جو چھوٹے داؤد کے نام سے مشہور تھا اور جس کو سلطان مسعود نے اسماعیلی مذہب سے توبہ کر لینے پر قید سے آزاد کر دیا تھا۔

۶۔ عبداللہ ابوالفتح داؤد اکبر کا نواسہ اور داؤد اصغر کا بھانجہ تھا جس کو ملتان کے لوگ اپنا امیر بنالینا چاہتے تھے۔

۷۔ اس خط کا منشا یہ ہے کہ ابن سومر راجہ بل کو سلطان مسعود اور عبداللہ اور اہل ملتان کے خلاف اپنے قبیلہ کو جنگ کے لئے ابھارے اور قرمطی اسماعیلیوں کی جو طاقت زائل ہوگئی تھی، اس کو پھر واپس لائے، چنانچہ ملتان میں یہ کوشش بار بار کی گئی اور ناکام و کامیاب ہوتی رہی۔

۸۔ اور آخری اہم بات اس خط سے سومر کی شخصیت کے متعلق معلوم ہوتی ہے کہ یہ کوئی طاقت ور اور پرزور شخص تھا۔ سومر کا بیٹا جب سلطان مسعود کا معاصر تھا تو کہنا چاہئے کہ سومر سلطان محمود (المتوفی سنہ ۴۲۱ھ) کا معاصر تھا۔

۹۔ یہی سومری ہیں جو اس خط کی تاریخ کے بیس برس بعد سلطان عبدالرشید بن محمود غزنوی (المتوفی سنہ ۴۴۴ھ) کی کمزور حکومت کے زمانہ میں غزنویوں کے بجائے سندھ کے مالک ہوگئے۔

ہباری خاندان کی ایک زندہ جاوید یادگار

ہباری سلاطین کی گو ظاہری یادگار ہمیشہ کے لئے مٹ گئی مگر اس کی ایک روحانی یادگار ہمیشہ کے لئے باقی رہ گئی اور وہ ان کا وہ خاندان ہے جو غزنویوں کے زیر سایہ یہاں سے ملتان جا کر آباد ہوا۔ شیخ الاسلام زکریا ملتانی سنہ ۵۷۸ھ میں پیدا ہوئے اور بقول فرشتہ سنہ ۶۶۶ھ میں اور بقول اخبار الاخیار سنہ ۶۶۱ھ میں وفات پائی۔ شیخ عبدالحق دہلوی نے آپ کو ''اسدی'' لکھا ہے، [1] جو معلوم ہو چکا ہے کہ حضرت ہبار کا قبیلہ تھا۔ شیخ عین الدین

[1] اخبار الاخیار ص ۲۶ مطبع ہاشمی میرٹھ۔

بیجاپوری نے ان کا نسب حضرت (ہبار) بن اسود بن مطلب بن اسد تک پہنچایا ہے، پیرزادہ محمد حسین صاحب نے ابن بطوطہ کے اپنے اردو ترجمہ (جلد دوم ص ۸) میں شیخ کے موجودہ خاندان کے ذخیرہ میں سے ایک پرانی کتاب خلاصۃ العارفین کا ایک عربی اقتباس نقل کیا ہے جو ملفوظات سید جلال بخاری سے منقول ہے۔ اس میں جو نسب نامہ لکھا ہے اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے۔ اس طرح شیخ الاسلام کے خاندان کے ہندوستان آنے کی جو دو تاریخیں ملتی ہیں یعنی ایک یہ کہ وہ پہلی صدی ہجری میں عرب فاتحین ہند کے ساتھ آیا جیسا کہ ابن بطوطہ میں ہے اور دوسری یہ کہ وہ گویا پانچویں صدی ہجری میں عرب سے آئے، یہ دونوں مل جاتی ہیں اور وہ اس طرح کہ سندھ میں اس خاندان کا ورود پہلی تاریخ کے مطابق ہوا یعنی دوسری صدی ہجری میں اور ملتان میں منصورہ کی تباہی کے بعد پانچویں صدی میں غزنوی سلطنت کے زیر سایہ آکر آباد ہوئے۔ البتہ خوارزم ہوکر یہاں آنے کا بیان صحیح نہ ہوگا جیسا کہ تاریخ فرشتہ میں ہے۔ لیکن اس سے زیادہ اہم بیان تاریخ ظاہری کے مصنف کا ہے جس نے تفصیل کے ساتھ یہ بتایا ہے کہ شیخ بہاؤالدین سندھی تھے اور سمہ قوم نے پہلے محمد نور کے تباہ ہونے کے بعد سکور (موجودہ سکھر) کے پرگنہ میں جو محمد نور نے آباد کیا تھا وہ وہیں کے رہنے والے تھے۔[1]

سندھ غزنویوں اور غوریوں اور سلاطین دہلی کے ہاتھ میں

سندھ کا غزنویوں کے ہاتھوں میں سنہ ۴۴۴ھ تک رہنا اس سے ثابت ہے کہ سلطان عبدالرشید غزنوی (سنہ ۴۴۴ھ) تک سندھ سے خراج کا آنا ثابت ہوتا ہے۔ ان کے بعد ہی غزنوی سلطنت میں انتشار پیدا ہوگیا گو برائے نام آخر تک (سنہ ۵۷۸ھ) وہ پنجاب اور سندھ کے مالک کہلاتے رہے۔ سنہ ۵۷۸ھ میں غزنویوں کے بجائے غوریوں کا عمل دخل شروع ہوگیا اور شہاب الدین کے ایک سپہ سالار ناصرالدین قباچہ نے سندھ پر اور ایلتمش نے دہلی پر قبضہ کرلیا اور بالآخر ایلتمش نے قباچہ کو شکست دے کر سندھ سے اس کو

---

[1] تاریخ ظاہری الیٹ ص ۲۵۶۔

نکال دیا۔ اس وقت سے وہ گو دہلی سے برائے نام وابستہ رہا لیکن درحقیقت وہ خود مختار ہی رہا۔ محمد شاہ تغلق کے زمانہ میں (سنہ ۷۵۲ھ میں) سندھ ایک مقامی حکمراں خاندان سے نکل کر دوسرے مقامی حکمراں کے ہاتھ میں گیا۔ سلطان فیروز شاہ نے سنہ ۷۶۲ھ میں اس پر مصالحانہ قبضہ کیا اور آخر انہیں مقامی حکمرانوں کے سپرد کیا جن کے ہاتھ میں وہ سنہ ۹۲۷ھ تک رہا۔ ان سے ایک تاتاری امیر ارغون نے اس کو فتح کیا اور آخر سنہ ۱۰۰۰ھ کے خاتمہ پر وہ اکبری مقبوضات میں داخل ہو گیا۔

سومری

اوپر کی پوری تاریخ سے ہم کو کوئی بحث نہیں ہے۔ ہم کو گذشتہ تاریخ کے صرف دو خود مختار قبیلوں کی اصلیت پر غور کرنا ہے جن میں سے ایک سومری اور دوسرے سما کہلاتے ہیں۔ غزنویوں کی کمزوری کے عہد میں جس مقامی قبیلہ نے سندھ پر قبضہ کیا وہ سومری کہلاتے ہیں۔ پھر محمد شاہ تغلق کے عہد میں سنہ ۷۵۲ھ میں جو دوسرا مقامی قبیلہ برسر حکومت آیا اور جو سنہ ۹۲۷ھ (۱۵۲۱ء) تک قائم رہا وہ سمہ کہلاتا ہے۔ ان دونوں قبیلوں کی اصلیت کے متعلق مؤرخین میں سخت اختلاف ہے اور خصوصاً سومری خاندان کی قومیت بہت کچھ بحث طلب ہے اور اسی طرح ان کا مذہب بھی۔

اوپر جس دروزی خط کا حوالہ گذرا ہے اس سے صاف ثابت ہے کہ سنہ ۴۲۲ھ (سلطان مسعود کے زمانہ میں) شیخ ابن سومر راجہ بل موجود تھا اور وہ اسماعیلی مذہب تھا اور اس کو دروزیوں کے امام نے ملتان اور سندھ نے اسماعیلیوں کی دوبارہ حکومت قائم کرنے کے لئے بڑی غیرت دلائی تھی۔ اس لئے عجب نہیں کہ غزنویوں کے زور ٹوٹنے پر سلطان عبدالرشید (سنہ ۴۴۴ھ) کے زمانہ میں سومریوں نے سندھ میں اپنی سلطنت قائم کر لی۔

ان کی یہ سلطنت سنہ ۴۴۴ھ سے لے کر سنہ ۷۳۴ھ کے چند سال بعد تک کسی نہ کسی طرح قائم تھی۔ چنانچہ اس سلسلہ میں ابن بطوطہ کی شہادت سب سے زیادہ اہم ہے، وہ

ہندوستان میں سندھ کے راستہ سے سنہ ۷۳۴ھ میں اس وقت ہندوستان آیا تھا جب سومری قوم سلاطین دہلی کے ماتحت حکمراں تھی اور ابن بطوطہ نے ان کو دیکھا تھا۔ وہ کہتا ہے:-

۱۔ اس کے بعد ہم جنانی [۱] پہنچے جو دریائے سندھ کے کنارے ایک خوبصورت اور بڑا شہر ہے اور جس میں خوش نما بازار ہیں۔ یہاں کے باشندے وہ لوگ ہیں جن کو سامرہ کہتے ہیں جو یہاں اس وقت بسے اور ان کے بزرگ یہاں آباد ہوئے جب حجاج کے زمانہ میں سندھ فتح ہوا جیسا کہ مؤرخین نے لکھا ہے ..... یہ لوگ جو سامرہ کہلاتے ہیں یہ کسی کے ساتھ کھاتے نہیں اور نہ کھاتے وقت ان کو کوئی دیکھ سکتا ہے، اور نہ وہ اوروں سے اور نہ اور لوگ ان سے شادی بیاہ کرتے ہیں، اس زمانہ میں جوان کا امیر ہے اس کا نام ونار ہے جس کا ذکر ہم آگے کریں گے۔

چنانچہ آگے چل کر وہ سیوستان (سیہوان) کے ذکر میں کہتا ہے۔ (سیوان اب کراچی کے ضلع میں ہے)

۲۔ اسی شہر میں سامری امیر ونار جس کا ذکر اوپر گذرا اور امیر قیصر رومی رہتے ہیں اور یہ دونوں سلطان (دہلی) کی ماتحتی میں ہیں اور ان دونوں کے ساتھ اٹھارہ سو سوار تھے، اور یہاں ایک ہندو رہتا تھا جس کا نام رتن تھا جو حساب و کتاب میں بڑا ماہر تھا۔ وہ بعض امراء کے ساتھ سلطان کے دربار میں گیا، سلطان نے اس کو پسند کیا اور اس کو ''سندھ کا راجہ'' خطاب اور راجگی کے ماہی مراتب دے کر سیوستان بھیجا اور اس کو وہ جاگیر میں دے دیا۔ جب وہاں پہنچا تو ونار اور قیصر کو یہ برا معلوم ہوا کہ ایک کافر کو ان پر فوقیت دی جائے تو باہم مشورہ کر کے اس کو

---

[۱] یہ شہر بے نشان ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ دریا برد ہو گیا۔ ابوالفضل نے بھی اس کا ذکر نہیں کیا ہے۔

قتل کر دیا.....اور خزانہ لوٹ لیا اور سب نے مل کر ونار کو ملک فیروز کا خطاب دے کر اپنا بادشاہ بنا لیا.....پھر ونار یہ سمجھ کر کہ وہ اس وقت اپنے قبیلہ سے دور ہے ڈرا اور اپنے قبیلہ میں چلا گیا.....لشکریوں نے قیصری کو امیر بنا لیا.....جب ملتان کے نائب کو خبر لگی تو اس نے اس کی سزا کے لئے فوج بھیجی اور سخت سزا دی [1] (باختصار)۔

ابن بطوطہ اسی وقت پہنچا تھا ایک مدرسہ میں ٹھہرا تھا۔ لاشوں کی بدبو سے اس کو نیند نہیں آتی تھی۔ ان دونوں اقتباسوں سے کئی باتیں ثابت ہوتی ہیں۔

۱۔ سامری لوگ اپنے بزرگوں کی آبادی کو حجاج بن یوسف ثقفی کی آمد سے متعلق کرتے تھے۔

۲۔ وہ مذہباً ہندو نہ تھے اور نہ ہندوؤں کی ماتحتی پسند کرتے تھے۔ ساتھ ہی ان میں بعض باتیں ایسی بھی پائی جاتی تھیں جو عام مسلمانوں سے ان کو الگ کرتی تھیں۔

۳۔ اس وقت سندھ سلطان دہلی کے ماتحت اس طرح تھا کہ سلطان کی طرف سے ایک امیر یا ریزیڈنٹ سومریوں کے ساتھ رہتا تھا۔

۴۔ سندھ انتظام ملکی میں ملتان کے ماتحت ہو کر دہلی کا ماتحت تھا۔

سومرہ کا مذہب

دروز والے خط سے سومرہ کا اسماعیلی ہونا تو ثابت ہی ہو چکا ہے مگر چند مزید باتیں ابن بطوطہ سے بھی معلوم ہوتی ہیں ابن بطوطہ کے اس بیان سے واضح ہوتا ہے کہ سومری لوگ عرب فاتحین ہند کے ساتھ آ کر بسے تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ راجپوت نہیں ہو سکتے لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی ظاہر ہے کہ کھانے اور پینے اور شادی بیاہ کے بعض خاص غیر اسلامی مراسم بھی ان میں تھے۔ مگر باایں ہمہ وہ اپنے کو ہندو یا کافر نہیں بلکہ موحد اور مسلمان ہی سمجھتے تھے اور اسلامی لقب ملک فیروز

[1] سفرنامہ ابن بطوطہ جلد دوم ص ۴ و ۶ (مصر)

اختیار کرتے تھے اور کافر کی اطاعت کو اپنے لئے تحقیر کا باعث سمجھتے تھے۔ اس لئے وہ ہندو قطعاً نہیں تھے۔ ایسا مخلوط مذہب قرمطیوں اور اسماعیلیوں ہی کا تھا جو اسلام کے ساتھ کچھ ہر جگہ کے ملکی مراسم اور اعتقادات کو شامل کر لیتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے ہندوستان میں حضرت علیؓ کو وشنو کا اوتار بنایا تھا اور اسی قسم کی باتیں وہ مخلوط کر لیتے تھے۔ اس سے ان کو ہر ملک میں مذہب کی تبلیغ میں آسانی ہوتی تھی اور پرانے زمانہ میں اسماعیلیوں کے قلعہ الموت سے سندھ میں مبلغین کا آنا تاریخوں سے ثابت ہے۔[1] اور یہ عقائد کے اخذ کا مسلک بھی انہیں میں تھا۔ وہ نام بھی ہندوؤں کے اختیار کر لیتے تھے جیسا کہ آج بھی بمبئی کے خوجہ قوم میں ان باتوں کی مثالیں مل سکتی ہیں۔ اس سلسلہ میں ایک عجیب واقعہ شیخ الاسلام زکریا ملتانی کے مرید در مرید مخدوم جہانیاں سید جلال الدین بخاری (سنہ ۷۰۷۔۸۰۰ھ) کے حالات کے ضمن میں ملتا ہے۔ یہ ان کا ذکر آگے کسی موقع پر آئے گا۔ یہ سندھ کے شہر اوچ میں سکونت پذیر اور مرجع خلائق تھے۔ لکھا ہے کہ اوچ کا والی ''سومرہ'' ان کی ندمت میں ایک دفعہ آیا، درویشوں کا ہجوم تھا۔ سومرہ نے ان میں سے کسی کو حضرت کی اجازت کے بغیر ''مسجد'' سے باہر نکال دیا۔ اس وقت مخدوم کی زبان سے نکلا کہ ''سومرہ مگر دیوانہ شدہ'' اسی وقت وہ پاگل ہو گیا۔ شہر میں غل ہو گیا، آخر اس کی ماں نے آکر بڑی منت کی، قصور معاف ہوا، وہ ہوش میں آیا اور ''مسجد'' میں آکر پاؤں چومے، مرید ہوا اور مقبول بارگاہ ہوا۔[2] کیا اس واقعہ سے یہ سمجھا جائے کہ وہ اسماعیلیت سے تائب ہو کر سنی ہو گیا؟

اسماعیلی مذہب کی مصر والی فاطمی سلطنت کا خاتمہ سنہ ۵۶۷ھ میں سلطان صلاح الدین کے ہاتھوں سے ہو گیا۔ اس کے بعد حسن بن صباح والی اسماعیلی نزاری سلطنت قلعہ الموت کی قائم رہی جو سنہ ۴۸۳ھ (۱۰۹۱ء) سے شروع ہو کر سنہ ۶۵۴ھ (۱۲۵۶ء) میں ہلاکو کی تلوار سے برباد ہوئی۔ ظاہر ہے کہ سندھ کی اسماعیلی جماعت پر اصل مرکز کی بربادی کا کیا اثر پڑا ہوگا۔

---

[1] دعوت اسلام (پریچنگ آف اسلام) ڈاکٹر آرنلڈ ص ۲۹۳ [2] فرشتہ جلد ۲ ص ۴۱۶ (نولکشور)

اس لئے ان سومریوں کا یا ان مین سے بعض کا سید جلال بخاری کے ہاتھ پر سنی ہو جانا بالکل ممکن ہے۔

سومرہ کی قومیت

سومرہ لوگوں کی قومیت کے مسئلہ کے حل کرنے کے لئے سب سے پہلے ہم کو اپنے پرانے مؤرخوں کے بیانات سننے چاہئیں۔ ابن بطوطہ کا سب سے پہلا بیان سن چکے کہ یہ اپنے اسلاف کا سندھ میں حجاج بن یوسف کے زمانہ فتح سندھ میں آباد ہونا بیان کرتے تھے۔ اس کے بعد تاریخ معصومی کے مصنف میر محمد معصوم کا بیان ہے۔ وہ اپنی تاریخ کے دوسرے باب میں کہتا ہے کہ:

> ''سلطان محمود نے ملتان اور سندھ فتح کر لیا۔ سلطان عبدالرشید بن محمود کے زمانہ میں (سنہ ۴۴۱۔۴۴۴ھ) جب سلطنت اس کی عیاشی اور آرام طلبی کے سبب سے کمزور ہوئی تو انہوں نے غزنویوں کا جوا اپنے کندھے سے اتار دیا اور سومرہ کے قبیلہ نے تہری کے مقام میں جمع ہو کر سومرہ نام ایک شخص کو تخت پر بیٹھایا۔ انہیں اطراف میں سعد نام ایک طاقت ور زمیندار تھا، سومرہ نے اس سے تعلق پیدا کیا اور اس کی لڑکی سے شادی کر لی۔ اس سے ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام بھونگور کھا۔ اور باپ کے مرنے پر وہی بادشاہ ہوا''۔[1]

(اس کے بعد میر معصوم نے اس کی اولاد در اولاد کے حالات لکھے ہیں جن میں سے بعض کے عربی نام جیسے خفیف اور عمر اور بعضوں کے ہندی جیسے دودا لکھے ہیں)۔

تاریخ طاہری کے مصنف نے زیادہ تر افسانے اور قصے لکھے ہیں جن کا آغاز اس نے ''عمر سومرہ'' اور ایک ہندو خاتون کے عشق و محبت سے کیا ہے۔ اسی کے ضمن میں وہ کہتا

---

[1] تاریخ معصومی از الیٹ جلد اول ص ۲۱۵۔

ہے کہ'' یہ قبیلہ ہندو تھا اور ہندو مذہب کا پابند تھا، سنہ ۷۰۰ھ سے سنہ ۸۴۳ھ تک سلطنت کی الور کے قریب ان کا مقام تھا اور محمد نوران کا دار السلطنت تھا''۔[۱]

بیگ قرنامہ میں صرف اسی قدر ہے کہ سندھ کی اسلامی فتح کے بعد عرب قبیلہ تمیم نے حکومت کی، تھوڑے دنوں کے بعد سومرہ لوگوں نے قبضہ کیا، پانچ سو برس قابض رہے، ان کے پایۂ تخت کا نام مہاتم نور تھا۔

کس قدر عجیب بات ہے کہ ان کے اشخاص کے عربی ہندی ناموں کی طرح ان کے پایۂ تخت کا نام بھی عربی ہندی ہے یعنی وہی کبھی محمد نور ہے اور کبھی مہاتم نور۔ کہا جاتا ہے کہ مہاتم محمد ہی کی تحریف ہے، ممکن ہے کہ ایسا ہی ہو۔ یہ دیرگ کے پرگنہ میں جو موجودہ پرگنہ چاچ گم اور بادین کی جگہ تھا جو پارکر اور لنکا بازار کے بیچ میں ہے۔

تحفۃ الکرام کے مصنف نے منتخب التواریخ (بدایونی نہیں) سے جو محمد یوسف کی تصنیف ہے یہ اقتباس نقل کیا ہے:-

> ''جب سلطان عبدالرشید بن سلطان محمود غزنوی کی حکومت ہوئی تو سندھ کے لوگوں نے اس کو کمزور پایا۔ سنہ ۴۴۵ھ (سنہ ۱۰۵۳ء) میں سومرہ قبیلہ والوں نے ٹھری میں جمع ہو کر سومرہ نام ایک شخص کو بادشاہ بنایا اور اس کے ایک لڑکا بھنگر نام ایک زمیندار سعد نام کی لڑکی کے بطن سے پیدا ہوا۔ بھنگر نے ۵ برس حکومت کر کے سنہ ۴۶۱ھ میں وفات پائی۔[۲] (خلاصہ)

خود تحفۃ الکرام کا مصنف لکھتا ہے کہ

> ''سومرہ قوم سامرہ کے عربوں سے نکلی ہے جو سندھ میں دوسری صدی ہجری میں قبیلہ تمیم کے ساتھ آئی۔ تمیم عباسیہ کے زمانہ سندھ

---

[۱] تاریخ طاہری (الیٹ) ص ۲۶۰ و ۴۸۴ [۲] تحفۃ الکرام الیٹ جلد اول ص ۳۴۴۔

کے گورنر مقرر ہوئے تھے''۔

پھر وہ کہتا ہے کہ

''سندھ میں دلورائے راجہ تھا، اس نے اپنے بھائی چھوٹا امرانی پر ظلم کیا، وہ خلیفہ بغداد کے پاس گیا، خلیفہ نے سامرہ کیسو عرب اور سادات اس کے ساتھ کر دیئے۔ سید نے آ کر سندھ میں سکونت اختیار کر لی اور دلورائے نے اپنی لڑکی اس سے بیاہ دی۔[1]

تاریخ طاہری کے مصنف نے دلورائے اور چھوٹا امرانی دونوں بھائیوں کے درمیان اختلاف کی ایک وجہ یہ لکھی ہے کہ چھوٹا بچپن سے اسلام کی طرف مائل تھا، اس نے قرآن پڑھا تھا اور دل میں مسلمان ہو گیا تھا۔ وہ چھپ کر حج کے لئے چلا، راستہ میں ایک عجیب طریقہ سے فاطمہ نام ایک لڑکی سے شادی کی، حج سے لوٹ کر جب وہ سندھ کے مقام سیرستان میں پہنچا، اس کا انتقال ہو گیا اور وہیں دفن ہوا اور اس کا مزار مرجع خلائق ہے۔[2]

عربی ہندی مخلوط تھے

الغرض یہ تمام اقتباسات بھی بتاتے ہیں کہ یہ قبائچہ عربی اور ہندی مخلوط نسل تھا۔ جن لوگوں نے اس کو عرب بتایا ہے وہ اس کی ایک حیثیت کا اور جو ہندو بتاتے ہیں وہ دوسری حیثیت کا ذکر کرتے ہیں۔ سومر نام جیسا کہ دروز کے خط سے ظاہر اور فارسی تاریخوں میں مذکور ہے، اس حکومت کا بانی تھا۔ اس لئے ان لوگوں کو سومری، سامرہ وغیرہ کہنے لگے۔ عراق کے شہر سامرہ سے کوئی تعلق نہیں۔ شہر سامرہ کا اصلی نام سرمن والی تھا۔ جو استعمال کی کثرت سے عوام کی زبان میں سامرہ ہو گیا، اس کو خلیفہ معتصم باللہ عباسی (سنہ ۲۲۷ھ) نے بسایا تھا۔

خالص راجپوت نہ تھے

یورپین مؤرخوں نے اس قبیلہ کو ''نومسلم راجپوت'' بتایا ہے جیسا کہ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا

---

[1] تحفۃ الکرام الیٹ جلد اول ص ۳۴۳۔ [2] تاریخ طاہری الیٹ ص ۲۵۸

کے مضمون نگار سندھ نے بھی یہی لکھا ہے [۱] الیٹ صاحب بھی یہی ثابت کرنا چاہتے ہیں، مگر ان میں سے کوئی صاحب کوئی دلیل نہیں پیش کرتے۔ فارسی مؤرخین کے ملے جلے بیانوں سے یہ تو ظاہر ہی ہوتا ہے کہ وہ خالص ہندی بھی نہ تھے تو خالص راجپوت کیوں کر ہوں گے۔

یہودی نہ تھے

مولوی عبدالحلیم صاحب شرر مرحوم نے ایک عجیب بات لکھی ہے کہ یہ لوگ ''نومسلم یہودی'' تھے۔ مولوی صاحب کو شاید اس لئے اشتباہ ہوا کہ یہودیوں کے ایک فرقہ کا نام سامری تھا جو شام کے کوہ شمرون کی طرف منسوب تھے۔ اس اشتباہ کی دوسری وجہ بشاری مقدسی کی ایک عبارت ہے جس کو مرحوم نے عجیب طریقہ سے اپنے مدعا کے مطابق کیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ بشاری نے اپنے مقدمہ میں جن قوموں اور فرقوں کا ذکر کیا ہے ان میں چار عدد کی خصوصیت دکھائی ہے اور لکھا ہے کہ ''اہل ذمہ بھی جن سے جزیہ لیا جاسکتا ہے چار ہیں، یہود، نصاریٰ، مجوس اور صابئ، پھر اعتراض کیا ہے کہ ''سامرہ'' بھی تو اہل ذمہ ہیں۔ اس طرح چار کے بجائے پانچ قومیں ہو جاتی ہیں۔ اس کا جواب دیا ہے کہ ''سامرہ دراصل یہود کی ایک قسم ہیں۔ دیکھو وہ بھی موسیٰ علیہ السلام ہی کو پیغمبر مانتے ہیں''۔ یہ تو اصل نسخہ کی عبارت ہے۔ حاشیہ میں ایڈیٹر نے ایک اور نسخہ کی عبارت بھی نقل کی ہے جس میں اس اعتراض کا جواب دیا ہے کہ ''سندھ کے بت پرست بھی تو اسلامی ملک میں رہتے ہیں۔ پھر اہل ذمہ چار سے زیادہ ہو جاتے ہیں''۔ بشاری اس کے جواب میں کہتا ہے کہ ''سندھ کے بت پرست اہل ذمہ نہیں ہیں کیوں کہ وہ جزیہ نہیں ادا کرتے [۲]۔ اس لئے بالآخر اہل ذمہ وہی چار رہے''۔

مرحوم نے ''سامرہ'' اور ''سندھ'' کو اور نیچے دیکھ کر باہم مربوط کر کے ایک دعویٰ

---

[۱] گیارہواں ایڈیشن جلد ۲۵ ص ۱۴۳ [۲] احسن التقاسیم بشاری ص ۴۲ (لیڈن)

پیدا کرلیا ہے جو سراسر بے بنیاد ہے۔ بشاری کی احسن التقاسیم موجود ہے جس کو دیکھ کر ہر شخص واقعہ کی حقیقت کو جان سکتا ہے۔

سومری بادشاہ

تحفۃ الکرام میں سومرہ کے حسب ذیل بادشاہوں کے نام اور سلطنت کے ایام لکھے ہیں:-

۱۔	سومرہ	زمانہ دراز تک
۲۔	بھونگر بن سومرہ اول	۱۵ رسال سنہ ۴۶۱ھ میں مرا۔
۳۔	دودا اول بن بھونگر	۲۴ رسال سنہ ۴۸۵ھ میں مرا۔
۴۔	سنگھر	۱۵ رسال
۵۔	حفیف یا (خفیف)	۳۳ رسال
۶۔	عمرا[1]	۴۰ رسال
۷۔	دودا دوم	۱۴ رسال
۸۔	پاتھو	۳۳ رسال
۹۔	گنہرا اول	۱۶ رسال
۱۰۔	محمد نور (؟)	۱۵ رسال
۱۱۔	گنہرا دوم	چند سال
۱۲۔	دودا سوم	۱۴ رسال
۱۳۔	تائی	۱۵ رسال
۱۴۔	چنیسر	۱۸ رسال
۱۵۔	بھونگر دوم	۱۵ رسال

[1] یہ عمر نام شیعہ اسماعیلیوں میں عجیب معلوم ہوتا ہے۔ یہ شاید اصل میں اثر ہو جیسا کہ سراج عفیف میں ہے اور جس کا دوسرا تلفظ اوتار یا دنار یا اُنار ہے جیسا کہ ابن بطوطہ اور سندھ کی بعض فارسی تاریخوں میں ہے۔

۱۶۔	حفیف (یا خفیف) دوم	۱۸ر سال
۱۷۔	دودا چہارم	۲۵ر سال
۱۸۔	عمر سومرا	۳۵ر سال
۱۹۔	بھونگر سوم	۱۰ر سال
۲۰۔	ہمبر (امبر)	آخری بادشاہ
		۳۶۱

گیارہویں بادشاہ کے چند مبہم سال اور آخری بادشاہ کا زمانہ اس میں شامل نہیں۔ اگر چند سال یہ بھی بڑھا لئے جائیں تو کم از کم ان کا زمانہ ۳۷۵ سال ہوتا ہے اور اگر ان کا آغاز سلطان عبدالرشید کے بعد سے یعنی سنہ ۴۴۴ ھ سے کیا جائے تو ان کے خاتمہ کا سال سنہ ۸۱۹ ھ ہوتا ہے۔ لیکن گذر چکا ہے کہ ان کا خاتمہ محمد شاہ تغلق کے زمانہ میں سنہ ۷۵۲ ھ میں ہوا، اس لئے سرسٹھ برس کا زمانہ ان بادشاہوں کی بیان کردہ مدت سلطنت میں زیادہ معلوم ہوتا ہے۔

سومروں کا خاتمہ

محمد شاہ تغلق کے زمانے میں سلطان دہلی اور سومریوں کی باہمی آویزش شروع ہوتی ہے۔ محمد شاہ تغلق کے آخر زمانہ میں طغی نام ایک مغل گجرات میں باغی ہوتا ہے اور بادشاہ کے گجرات پہنچنے پر وہ بھاگ کر ٹھٹھ (سندھ) کے سومریوں کے پاس پناہ لیتا ہے۔ بادشاہ اس کے تعاقب میں ٹھٹھ جاتا ہے اور مغلوں اور سومریوں سے متحدہ مقابلہ پیش آتا ہے لیکن یکا یک بادشاہ کا مزاج منحرف ہو جاتا ہے اور وہیں وفات پا جاتا ہے۔ بے بادشاہ کی فوج مغلوں اور سومریوں کے ہاتھوں سے سخت تکلیف اٹھاتی ہے اور آخر فیروز شاہ تغلق کو اپنا بادشاہ بنا کر اس دوطرفہ مشکل سے نجات پاتی ہے اور دلی واپس آتی ہے۔ یہ سنہ ۷۵۲ ھ کا واقعہ ہے۔[1]

---

[1] فیروز شاہی ضیائے برنی ص ۵۲۳۔۵۲۵ (کلکتہ)

لیکن چند سال کے بعد جب فیروز شاہ سنہ ۷۶۲ھ میں یہاں آتا ہے تو جاموں کی سلطنت یہاں ملتی ہے۔ جام انرا اور اس کا بھتیجا بانمینہ حکمراں ہوتے ہیں۔ یہ جام کا لقب سمہ کے بادشاہوں کا تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہی زمانہ سومرہ کے خاتمہ اور سمہ لوگوں کے آغاز کا ہے۔ تحفۃ الکرام میں سنہ ۷۵۲ھ میں سمہ قوم کا آغاز لکھا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسی محمد شاہ تغلق کے حملہ کے بعد ہی یہ انقلاب پیش آیا اور بقول فرشتہ اس انقلاب میں مسلمانوں کی کوششوں کو سب سے زیادہ دخل تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اسماعیلی یا ہندو نما سومریوں کی بغاوت کے بعد عام مسلمانوں نے یہی مناسب سمجھا کہ سومریوں کو یہیں کی ایک نومسلم دیسی قوم کے ذریعہ سے مٹا دیا جائے۔ چنانچہ سمہ قوم کے ایک سردار اونر نام نے سومریوں کے آخری بادشاہ ہمیر (امیر) کو جس کی دوسری لفظی تحریف ارمائیل ہے قتل کر کے اپنی سلطنت قائم کر لی۔

نئی تحقیقات کی ضرورت

سومری بادشاہوں کی فہرست اور ان کے زمانے کی عین تنقیدی نظر سے بہت کچھ محتاج تحقیق ہے اور اس پر ہمارے ہندوستانی مؤرخین کو تھوڑی محنت کرنی ہے، مثلاً سنہ ۶۲۰ھ سے ایک دو سال پہلے جب سلطان جلال الدین خوارزم شاہ تاتاریوں سے بھاگ کر سندھ یا اور ٹھٹھ پہنچا تو جلسی نام سومری بادشاہ نے بھاگ کر کشتیوں میں اپنے ساز و سامان کو لاد کر کسی جزیرہ میں پناہ لی۔[1] یہ جلسی نام فہرست میں نہیں نولکشوری نسخہ پر اعتماد نہیں۔ ممکن ہے کہ یہ جلسی نام چنیسر کی خرابی ہو جو ہماری فہرست میں پندرہویں نمبر پر ہے۔ اسی طرح سنہ ۷۳۴ھ میں ابن بطوطہ کے دورہ سندھ کے زمانہ میں اونار بادشاہ تھا۔ یہ نام بھی اس فہرست میں نہیں مگر ممکن ہے کہ یہ وہی ہو جس کا نام عمر کی صورت میں اٹھارہویں نمبر پر ملتا ہے۔

---

[1] فرشتہ جلد دوم ص ۳۱۶ (نولکشور)

سمہ

سومریوں کے بعد سمہ قبیلہ کے جو لوگ سندھ پر قابض ہوئے ان کی راجدھانی ٹھاٹھ تھی جس کو عرب جبل کہتے ہیں۔

سمہ کو فارسی مؤرخین جمع کی صورت میں سمنان لکھتے ہیں جس طرح انگریز مصنفین s کے ساتھ جمع بنا کر سماس (Sammas) لکھتے ہیں۔ اس سے دھوکا کھا کر بعض لوگوں نے ان کا نام سماس لکھا ہے۔ یہ مذہباً مسلمان تھے گو اس میں اختلاف ہے کہ یہ شروع ہی سے مسلمان تھے یا بعد کو مسلمان ہو گئے۔ ان کا صدر مقام ٹھٹھ تھا۔ سرکاری لقب جام تھا اور نام ہندی عربی ملا کر ہوتا تھا مثلاً مشہور سمہ بادشاہ کا نام جام نندا نظام الدین تھا۔ یہ لوگ اس قدر طاقتور تھے کہ مدت تک یہ سلاطین دہلی کا پرزور مقابلہ کرتے رہے۔ سنہ ۷۵۲ھ (سنہ ۱۳۵۱ء) سے سنہ ۹۲۷ھ تک یعنی ایک سو پچھتر (۱۷۵) برس سندھ پر فرمانروائی کرتے رہے۔

اس قبیلہ کی اصلیت کی نسبت بھی مؤرخین میں سخت اختلاف ہے۔ سندھ کے بعض مؤرخوں نے ان کو عربی النسل تسلیم کیا ہے۔ ان کو ابوجہل کی اولاد کہا ہے۔ بعد کے فارسی مؤرخین فرشتہ اور ابوالفضل (آئین اکبری) نے ان کو ''جام'' کے لقب کی وجہ سے ایرانی بادشاہ جمشید کی اولاد کہا ہے جس کی بنیاد صرف لفظ ''جم'' اور جام کے تشابہ پر ہے جو سراسر غلط ہے۔ یورپین مؤرخین الیٹ [۱] اور انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا [۲] اور انسائیکلو پیڈیا آف اسلام [۳] کے مضمون نگاران کو نومسلم راجپوت کہتے ہیں مگر اخیر کے سوا کسی نے کوئی دلیل پیش کرنے کی زحمت نہیں گوارا کی ہے۔ آخر الذکر کی دلیل کا خلاصہ اسی قدر ہے کہ ''جام'' کچھ اور نوانگر کے راجپوت راجاؤں کا لقب ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ بعض پرانے مؤرخین کے بیان سے بھی اس خیال کی تائید ہوتی ہے۔ چنانچہ تاریخ معصومی میں ہے کہ سمہ لوگ

---

[۱] تاریخ ہند جلد اول ص ۴۹۷ ۔ [۲] مضمون سندھ جلد ۲۵ ص ۱۴۳ (طبع ۱۱) [۳] مضمون سمہ (Samma) انگریزی ایڈیشن۔

کچھ سے سندھ آئے تھے۔ [۱] چچ نامہ کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ سمہ قبیلہ لوگ سندھ میں محمد قاسم کے زمانہ (سنہ ۹۶ھ) سے پہلے ہی آباد تھے۔ چنانچہ جب محمد قاسم ان کی آبادی میں پہنچا تو ان لوگوں نے راگ اور باجے سے اس کا استقبال کیا اور بہت خوش ہوئے۔ محمد قاسم نے ایک عرب سردار کو جس کا نام خریم (؟) اور اس کے باپ کا نام ''عمر'' بتایا گیا ہے کہ ان کا سردار مقرر کیا [۲] تاریخ طاہری کا بیان ہے کہ ''اس طرح وہ ملک جو سمندر کے کنارے ہے سمہ قوم کے ماتحت ہو گیا جہاں اس کی نسل اب تک آباد ہے۔ رائے بہارا اور جام سہتا اور چھوٹے اور کچھ کے راجہ اسی قوم سے ہیں۔[۳]

لیکن تاریخ بلاذری میں جو سنہ ۲۹۷ھ کی تصنیف ہے مجھے ایک فقرہ ملتا ہے جس کا ترجمہ یہ ہے:

> ''پھر سندھ کا والی داؤد بن یزید بن حاتم مقرر ہوا۔ اسی کے ساتھ صمہ کا باپ (ابوالصمہ المغلب الیوم) گیا تھا جو آج کل سندھ پر قابض ہے وہ قبیلہ کندہ کا آزاد کردہ غلام ہے''۔[۴]

کیا یہ سمجھا جائے کہ اسی ''صمہ'' کی اولاد تھی جو بعد کو قبیلہ ''سمہ'' کے نام سے موسوم ہوئی اور جو ممکن ہے کہ کچھ میں جا رہی ہو اور پھر وہاں سے سنہ ۷۵۲ھ میں آ کر اس نے سومرہ لوگوں سے سندھ چھین لیا ہو۔

سمہ بادشاہ

سمہ لوگوں کا زمانہ بہت بعد کا ہے یعنی جب دلی میں مسلمانوں کی مضبوط حکومت قائم تھی۔ اس لئے سمہ بادشاہوں کے نام اور لقب اور زمانہ زیادہ احتیاط سے محفوظ ہیں۔ فرشتہ کے بیان کے مطابق ان بادشاہوں کی تفصیل یہ ہے:-

---

[۱] معصومی (الیٹ) ص ۲۶۳۔ [۲] چچ نامہ (الیٹ) ص ۱۹۱ [۳] طاہری الیٹ ص ۲۶۸

[۴] بلاذری ص ۴۲۵ (لیڈن)

"شاہ محمد تغلق کے عہد میں مسلمانوں کی کوششوں سے سومریوں کے ہاتھوں سے نکل کر سندھ کی حکومت سمہ لوگوں کے ہاتھوں میں آئی۔ اس قبیلہ کے اکثر سردار اسلام کی دولت سے بہرہ مند تھے اور اکثر اوقات یہ بادشاہ دہلی کے مطیع اور باج گذار رہے۔ البتہ کبھی کبھی بغاوت اور سرکشی بھی کر بیٹھتے تھے۔ اسلام کے زمانہ میں سب سے پہلا شخص جوان کا بادشاہ بنا وہ جام افزا (انار یا ونار) تھا۔[1] وہ بہت عقل مند تھا اس نے ساڑھے تین سال حکومت کی۔ اس کے بعد اس کا بھائی جام جونا بادشاہ ہوا جو بہت انصاف پسند تھا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا جام مانی ہوا جس نے سلطان دہلی سے مخالفت کی اور سنہ ۷۶۲ھ میں سلطان فیروز شاہ نے اس پر چڑھائی کی۔ پہلے ناکام رہا۔ پھر گجرات سے واپس آ کر سلطان نے اس کا مقابلہ کیا۔ آخر جام مانی نے صلح کر لی۔"[2]

اس لڑائی اور صلح کا حال فیروز شاہ کے عہد کے چشم دید مؤرخ سراج عفیف نے پوری تفصیل سے لکھا ہے۔ لیکن اس زمانہ کے جام کا نام اس نے اونر لکھا ہے اور اس کے ساتھ اس کے بھتیجے کو جس کا نام بانبہنہ بتایا ہے شریک کیا ہے۔ سمہ لوگوں کی طاقت کا اندازہ اس سے ہوگا کہ جام نے چالیس ہزار پیادہ اور بیس ہزار سوار فوج سے فیروز شاہ سلطان دہلی کا مقابلہ کیا۔ رسد اور گھاس کی قلت کے سبب سے سلطان کو کامیابی نہ ہوئی اور وہ سندھ چھوڑ کر گجرات چلا گیا۔ دوسرے ہی سال وہاں سے واپس آ کر اس نے پھر حملہ کیا۔ جام ناچار صلح پر آمادہ ہوا۔ یہ سنہ ۷۶۲ھ (سنہ ۱۳۶۱ء) کا واقعہ ہے۔

---

[1] فرشتہ کے مطبوعہ نولکشور نسخہ میں اس جام کا نام افزا لکھا ہے مگر یہ کاتب یا نسخہ کی غلطی ہے۔ اصل لفظ انار یا ونار یا اونر ہے جیسا کہ ابن بطوطہ اور سراج عفیف میں ہے۔ [2] تاریخ فرشتہ جلد دوم ص ۳۱۷ نولکشور۔

یہ صلح کس طرح ہوئی؟

سید جلال الدین حسین بخاری جو اس عہد کے مشہور باخدا بزرگ تھے اور جن کا نام سومرہ کے مذہبی باب میں آچکا ہے وہ اوچ میں مقیم تھے۔ جام نے مشورہ کر کے ان کی خدمت میں اپنے قاصد بھیجے کہ وہ یہاں تشریف لا کر سلطان سے میرا قصور معاف کرا دیں۔ سید جلال الدین بخاری تشریف لائے اور بادشاہ نے پوری عقیدت کے ساتھ خیر مقدم کیا۔ سید علیہ الرحمہ نے فریقین کو دلاسا دیا، جام اور جام کے شریک حکومت بانہبنہ کو خود لے جا کر فیروز شاہ سے ملایا اور صلح کے شرائط طے ہو گئے۔ [1]

سمہ بادشاہوں کے نام

میر معصوم اور فرشتہ نے سمہ بادشاہوں کے نام اور زمانے لکھے ہیں۔ شروع کے بعض ناموں میں ان دونوں میں کچھ اختلاف ہے، مثلاً خیر الدین کا نام فرشتہ میں نہیں اس کی جگہ جام مانی لکھا ہے۔ ممکن ہے کہ مانی اور خیر الدین ایک ہی شخص ہو۔ آخر کے ناموں میں بھی کچھ اختلاف ہے۔

۱۔ جام اونار یا ونار یا اونر	۳؍سال ۶ مہینے
۲۔ جام جونا برادر جام	۱۴؍سال معاصر علاؤالدین خلجی
۳۔ جام تماجی	۱۵؍سال ایضاً
۴۔ جام خیر الدین	۱۶؍سال ایضاً
۵۔ جام بانہبنہ	.....
۶۔ جام تماجی	.....
۷۔ جام صلاح الدین	۱۱؍سال
۸۔ جام نظام الدین بن صلاح الدین	۲؍سال چند مہینے

---

[1] تفصیل کیلئے دیکھو فیروز شاہی شہر سراج عفیف ص ۲۴۰ و ۲۴۱ (کلکتہ)

۹۔ جام علی شیر بن نظام الدین	۶/سال چند مہینے
۱۰۔ جام کرن بن جام تماجی	ڈیڑھ دن

جام اونر کا خاندان ختم ہو کر اسی سمہ قبیلہ کا ایک اور خاندان تخت پر بیٹھا، اس کے پہلے بادشاہ کا نام فتح خاں تھا۔

۱۱۔ فتح خاں بن سکندر	۱۵/سال
۱۲۔ جام تغلق بن سکندر برادر فتح خاں	۲۸/سال
۱۳۔ جام مبارک (جام تغلق کا ایک عزیز قریب)	۳روز
۱۴۔ جام سکندر بن جام فتح خاں بن جام سکندر	ا/سال ۶ مہینے
۱۵۔ جام رائے ورن (مسلمان تھا)	سنہ ۸۵۸ھ میں کچھ سے آیا
۱۶۔ جام سنجر (سمہ قوم کا ایک سردار)	۸/برس چند مہینے
۱۷۔ جام نندا نظام الدین	۶۲/برس
۱۸۔ جام فیروز بن جام نندا	آخری بادشاہ

جام نندا کے زمانہ میں سنہ ۸۹۰ھ میں شاہ بیگ ارغون نے قندھار سے آکر سندھ پر حملہ کیا مگر ناکام رہا۔ جام نندا کے بعد اس کے بیٹے جام فیروز اور اس کے ایک مدعی عزیز جام صلاح الدین میں باہم حصول تخت کے لئے لڑائی ہوئی۔ جام صلاح الدین گجرات کے سلطان مظفر کی بیگم کا چچازاد بھائی تھا۔ اس لئے جام صلاح الدین کی مدد کے لئے سلطان مظفر گجراتی اٹھا۔ یہ دیکھ کر جام فیروز نے شاہ بیگ ارغون قندھاری سے مدد مانگی۔ شاہ بیگ ارغون نے اس موقع کو غنیمت سمجھ کر سنہ ۹۲۷ھ میں سندھ پر قبضہ کر لیا اور سمہ قوم کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔[1]

---

[1] فرشتہ جلد دوم ص ۳۲۰ نولکشور۔

اوپر بادشاہوں کے جو ایام حکومت لکھے ہیں ان کا مجموعہ ۱۹۲ ہوتا ہے۔ حالانکہ سنہ ۷۵۲ھ سے سنہ ۹۲۷ھ تک کل ایک سو پچھتر برس ہوتے ہیں۔ غالباً جام نندا کا زمانہ زیادہ بتایا گیا ہے۔ ناموں کے بڑھنے کی ایک وجہ یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ خاندان کے دو دو شخص ایک ساتھ حکومت کرتے تھے جیسا کہ سراج عفیف سے معلوم ہوتا ہے۔[1]

سمہ قوم کا مذہب

سمہ قوم مسلمان تو تھی مگر یہ کہ وہ کب مسلمان ہوئی اور مسلمانوں کے کس فرقہ سے اس کا تعلق تھا۔ اب تک تاریخ کا ایک راز ہے جس کے چہرہ سے تاریکی کا نقاب اٹھانے کی اب تک کوشش نہیں کی گئی ہے۔ مؤرخوں نے ان کے ہندی اور عربی ناموں کے ذریعہ سے ان کے مذہبی انقلاب کی تاریخ مقرر کی ہے۔ مثلاً فرشتہ نے انہیں ناموں کے قیاس سے چار پہلے بادشاہوں کو جن کے نام بترتیب جام اونر، جام جونا، جام مانی اور جام تماجی لکھے ہیں، ہندو سمجھا ہے اور پانچویں بادشاہ جام صلاح الدین سے مسلمان بادشاہوں کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ چنانچہ لکھتا ہے:-

''واز نام جماعت مذکور خصوص از نام تماجی جنین ظاہری شود کہ انہا زنار دار بودند''۔ (ج ۲ ص ۳۱۸ نولکشور)

لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس قوم کے ناموں کی طرز و وضع سے دھوکا نہ کھانا چاہئے۔ سب سے پہلا ہی نام جو جام اونر ہے ابن بطوطہ کے بیان سے معلوم ہو چکا ہے کہ اونار (اونر) جس سامری کا نام اس کے زمانہ میں تھا وہ ہندو نہ تھا وہ اپنے کو مسلمان سمجھتا تھا اور ہندو کی ماتحتی سے اس قدر بے زار ہوا تھا کہ سلطان دہلی کے خلاف اس نے بغاوت کر دی تھی اور ملک فیروز اپنا بادشاہی لقب اختیار کر لیا تھا۔ تاریخ طاہری میں جس جام کا زمانہ اسلام کی اشاعت کے لئے خاص طور سے سراہا گیا ہے اس کا نام جام نندا اور اس کے باپ کا

[1] فیروز شاہی ص ۱۹۹ و ۲۴۷ (کلکتہ)

شیخ الاسلام بہاء الدین زکریا اور سید جلال الدین بخاری

اوپر گذر چکا ہے کہ سندھ پر جو ہباری خاندان حکمراں تھا اس کی سلطنت کے مٹنے کے بعد اس خاندان کے بعض لوگ ملتان چلے گئے۔ ان میں وہ زندہ جاوید شخصیت بھی تھی جو شیخ الاسلام بہاء الدین زکریا ملتانی کے نام سے مشہور ہے۔ ان کا زمانہ سنہ ۵۷۸ھ سے لے کر سنہ ۶۶۶ھ تک ہے۔ تمام بڑے بڑے اسلامی ملکوں کا انہوں نے سفر کیا تھا اور ان کی ذات سے ملتان علم و تصوف کا مرکز بن گیا تھا۔ سید جلال الدین بخاری جو تصوف و سیادت کی ایک مشہور ہستی ہیں انہوں نے بخارا سے ملتان آ کر انہیں شیخ بہاء الدین سے بیعت کی تھی۔ ان سید جلال بخاری کے پوتے مخدوم جہانیاں سید جلال الدین حسین بخاری تھے جن کا نام دو بار اس سے پہلے گذر چکا ہے۔ (ولادت سنہ ۷۰۷ھ وفات سنہ ۸۰۰ھ) اس زمانہ کے بڑے بڑے صوفیہ کا دستور تھا کہ وہ اپنے با استعداد مریدوں کو تربیت کر کے دور دراز علاقوں میں لوگوں کی رہنمائی اور خدمت کے لئے مقرر کرتے تھے۔ شیخ الاسلام زکریا ملتانی نے اسی طور سے سید جلال بخاری اول کو سندھ کے شہر اوچ میں لوگوں کی ہدایت کے لئے بھیجا۔ اس وقت سندھ میں سومرہ قوم کی حکومت کا آخری زمانہ تھا اور سن چکے ہو کہ سومرہ والی اوچ کس طرح سید موصوف کا معتقد اور مرید بنا۔

تاریخ طاہری سے ظاہر ہوتا ہے کہ شیخ الاسلام مخدوم زکریا ملتانی کو نہ صرف سندھ سے بلکہ سمہ قوم (طاہری نے سمہ کے بجائے سومرہ لکھا ہے مگر جو زمانہ بتایا ہے اس کے لحاظ سے سومرہ کے بجائے سمہ چاہیے) سے بہت کچھ تعلقات تھے اور غالباً ان کے اپنے ایک سب سے بڑے مرید کو اس علاقہ میں متعین کرنے کا یہی راز تھا۔ تاریخ طاہری کی عبارت کا لفظی خلاصہ یہ ہے:-

"سنہ ۷۰۰ھ (سنہ ۱۳۰۰ء) سے سنہ ۸۴۳ھ (سنہ ۱۴۳۹ء)
تک ۱۴۳ رسال سومرہ (سمہ) نام ایک ہندو قبیلہ سندھ پر حکومت کرتا

شیخ الاسلام بہاء الدین زکریا اور سید جلال الدین بخاری

اوپر گذر چکا ہے کہ سندھ پر جو ہباری خاندان حکمراں تھا اس کی سلطنت کے مٹنے کے بعد اس خاندان کے بعض لوگ ملتان چلے گئے۔ ان میں وہ زندہ جاوید شخصیت بھی تھی جو شیخ الاسلام بہاء الدین زکریا ملتانی کے نام سے مشہور ہے۔ ان کا زمانہ سنہ ۵۷۸ھ سے لے کر سنہ ۶۶۶ھ تک ہے۔ تمام بڑے بڑے اسلامی ملکوں کا انہوں نے سفر کیا تھا اور ان کی ذات سے ملتان علم و تصوف کا مرکز بن گیا تھا۔ سید جلال الدین بخاری جو تصوف و سیادت کی ایک مشہور ہستی ہیں انہوں نے بخارا سے ملتان آ کر انہیں شیخ بہاء الدین سے بیعت کی تھی۔ ان سید جلال بخاری کے پوتے مخدوم جہانیاں سید جلال الدین حسین بخاری تھے جن کا نام دو بار اس سے پہلے گذر چکا ہے۔ (ولادت سنہ ۷۰۷ھ وفات سنہ ۸۰۰ھ) اس زمانہ کے بڑے بڑے صوفیہ کا دستور تھا کہ وہ اپنے با استعداد مریدوں کو تربیت کر کے دور دراز علاقوں میں لوگوں کی رہنمائی اور خدمت کے لئے مقرر کرتے تھے۔ شیخ الاسلام زکریا ملتانی نے اسی طور سے سید جلال بخاری اول کو سندھ کے شہر اوچ میں لوگوں کی ہدایت کے لئے بھیجا۔ اس وقت سندھ میں سومرہ قوم کی حکومت کا آخری زمانہ تھا اور سن چکے ہو کہ سومرہ والی اوچ کس طرح سید موصوف کا معتقد اور مرید بنا۔

تاریخ طاہری سے ظاہر ہوتا ہے کہ شیخ الاسلام مخدوم زکریا ملتانی کو نہ صرف سندھ سے بلکہ سمہ قوم (طاہری نے سمہ کے بجائے سومرہ لکھا ہے مگر جو زمانہ بتایا ہے اس کے لحاظ سے سومرہ کے بجائے سمہ چاہیے) سے بہت کچھ تعلقات تھے اور غالباً ان کے اپنے ایک سب سے بڑے مرید کو اس علاقہ میں متعین کرنے کا یہی راز تھا۔ تاریخ طاہری کی عبارت کا لفظی خلاصہ یہ ہے:-

"سنہ ۷۰۰ھ (سنہ ۱۳۰۰ء) سے سنہ ۸۴۳ھ (سنہ ۱۴۳۹ء)
تک ۱۴۳ رسال سومرہ (سمہ) نام ایک ہندو قبیلہ سندھ پر حکومت کرتا

رہا، اس کا پایہ تخت محمد نور تھا، اس کا ویرانہ نہ صرف میں نے بلکہ بہت سے
لوگوں نے ویرک کے پرگنہ میں دیکھا ہے۔ اس کی ویرانی کے بعد وہاں کے
بہت سے باشندے سکورا (سکھر؟) کے پرگنہ میں آ کر بسے جو سمہ کے جام
کے زمانہ میں آباد ہوا تھا اور یہیں انہوں نے ایک گاؤں بسایا تھا۔ اس کا
بھی نام وہی محمد نور رکھا۔ اس گاؤں میں شیخ الشیوخ مخدوم بہاء الدین
(زکریا) ملا خلیفہ سندھی جو ہندوستان میں بہت مشہور ہیں بہت بڑے
بڑے لوگ اور زمیندار جوان کے مرید تھے وہ یہیں رہتے تھے'' ۔[۱]

دوسرا واقعہ پہلے گذر چکا ہے کہ مخدوم شیخ بہاء الدین کے مرید سید جلال بخاری جن کو مخدوم نے سندھ کی ولایت مرحمت فرمائی تھی، ان کے پوتے سید جلال الدین حسین بخاری جن کا زمانہ سنہ ۷۰۷ھ سے سنہ ۸۰۰ھ تک ہے اور جو اوچ (سندھ) میں قیام پذیر تھے ان کے ہاتھ پر اوچ کے سومرہ والی نے بیعت کی اور بقول فرشتہ:-

'' بمسجد رفت وپائے سید بوسیدہ از درویشاں معذرت
خواست و مرید گشتہ از مقبولان گردید''۔[۲]

سید بخاری اوچ میں ہمیشہ وعظ وتذکیر فرمایا کرتے تھے جس کو سن کر بڑے بڑے لوگ متاثر ہوتے تھے۔[۳]

سید رحمۃ اللہ علیہ کے سوانح کے قرینہ سے معلوم ہوتا ہے کہ سومری والی کے مرید ہونے کا واقعہ سنہ ۷۵۰ھ کے گرد وپیش کا ہے جس کے تقریباً چند سال بعد سومرہ کی جگہ سمہ قوم برسر حکومت آئی۔ اس لئے قرین قیاس ہے کہ بعد کی حکمراں قوم (سمہ) بھی سید موصوف سے خاص عقیدت رکھتی ہوگی۔

سمہ قوم کے دارالسلطنت ٹھٹھ پر پہلے سنہ ۷۵۲ھ میں محمد شاہ تغلق نے جب حملہ کیا تو

---

[۱] تاریخ طاہری ایلیٹ ص ۲۵۷۔ [۲] فرشتہ ج ۲ ص ۴۱۶ نولکشور۔ [۳] ایضاً

اس کو وہیں ناگہانی موت آ گئی اور جب سنہ ۷۶۲ھ میں فیروز شاہ تغلق نے پہلی دفعہ حملہ کیا تو ناکام رہا اور وہاں سے گجرات چلا گیا۔ اس واقعہ کو یہ لوگ ''شیخ'' کی کرامت سمجھتے تھے اور اپنی زبان میں سندھی فقرہ بنایا۔

''برکت شیخ تھیا، ایک موا، ایک تبا''[1]

یعنی یہ شیخ کی برکت ہے ایک مر گیا اور ایک ناکام بھاگا۔ اس فقرہ میں شیخ سے مراد شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی کی ذات ہے یا سید جلال بخاری کی۔

دوسرے سال جب فیروز شاہ نے گجرات سے واپس آ کر دوبارہ ٹھٹھ پر حملہ کیا تو جام اونر اور بانبھنہ نے سوا اس کے اور کوئی تدبیر نہ دیکھی کہ ایک قاصد کو سید جلال الدین حسین بخاری کے پاس اوچ بھیجیں اور ان کو تکلیف دیں کہ وہ آ کر سلطان سے مصالحت کرا دیں۔ چنانچہ سید رحمۃ اللہ علیہ تشریف لائے اور فریقین میں مناسب شرائط پر صلح کرا دی اور سلطان سے فرمایا کہ (سمہ لوگوں کے پایہ تخت) ٹھٹھ میں ایک ولیہ خاتون تھی اسی کی دعا کی برکت سے یہ شہر فتح نہیں ہوتا تھا۔ پرسوں اس کا انتقال ہو گیا۔ [2]

یہ واقعات پوری طرح ظاہر کرتے ہیں کہ سمہ کے جاموں کو شیخ بہاء الدین زکریا اور سید جلال الدین حسین بخاری سے کتنی گہری عقیدت تھی۔ ان واقعات سے ان جاموں کا نہ صرف مسلمان ہونا بلکہ اہل سنت ہونا ظاہر ہوتا ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ ملتان کا یہی سہروردی خانوادہ ان کی ہدایت کا باعث ہوا ہے۔

ان واقعات کا تعلق سمہ قوم کے آخری زمانہ سے نہیں بلکہ بالکل ابتدائی زمانہ سے ہے۔ اس سے میری اس دعوے کی شہادت ملتی ہے کہ سمہ قوم بعد کو نہیں بلکہ شروع ہی سے مسلمان تھی۔ خصوصاً جب اس صورت حال کو اس واقعہ کے ساتھ ملا کر دیکھا جائے کہ سمہ قوم کو برسر حکومت لانے میں سب سے زیادہ مسلمانوں کا ہاتھ تھا۔ فرشتہ کے الفاظ ہیں:-

---

[1] فیروز شاہی شمس سراج عفیف ص ۲۳۱ (کلکتہ) [2] فیروز شاہی ص ۲۴۱ (کلکتہ)

''در آخر عہد شاہ محمد تغلق شاہ بسعی و امداد مسلمانان دولت از خاندان طبقہ سومرگان بفرقۂ سمگان منتقل شد و اکثر حکام ایشان بدولت اسلام اختصاص داشتند ۔[۱]

ظاہر ہے کہ اگر یہ سمہ شروع ہی سے مسلمان نہ ہوتے تو مسلمانوں کو ان سے کیا ہمدردی ہو سکتی تھی؟

سندھ اور اطراف سندھ کے دوسرے شہر

ملتان اور منصورہ کے علاوہ سندھ میں اور اس کے اطراف میں عربوں کی اور چھوٹی چھوٹی ریاستیں اور نو آبادیاں بھی تھیں جن کا سراغ چوتھی صدی کے آخر میں محمود غزنوی سے پہلے تک ملتا ہے۔ جن میں سے بعض کو سلطان کے باپ سبکتگین نے اور اکثر کو خود سلطان نے فتح کر کے اپنی سلطنت میں داخل کر لیا۔ ان شہروں میں حسب ذیل مقامات کے نام خصوصیت کے ساتھ چوتھی صدی کے عرب سیاحوں کے بیانات میں ملتے ہیں:-

دیبل یا ٹھٹھ

یہ مشہور بندرگاہ تھی اور جیسا کہ ہم نے پہلے کہا ہے عرب اس کو دیبل اور فارسی مؤرخین ٹھٹھ کہتے ہیں ۔[۲] یہی وہ شہر تھا جو سمہ لوگوں کا یا یہ تخت تھا اور جس پر فیروز شاہ سلطان دہلی نے حملہ کیا مگر ناکام رہا۔ آخر حضرت شیخ الاسلام زکریا ملتانی کے مرید کے جانشین حضرت شیخ جلال الدین کی وساطت سے فریقین نے صلح کر لی ۔[۳] دیبل میں بڑے علما اور محدثین گذرے ہیں جن کا ذکر علامہ سمعانی المتوفی سنہ ۵۶۲ھ نے کتاب الانساب میں کیا ہے ۔[۴] یہ بندرگاہ ہونے کی وجہ سے عرب تاجروں کا مرکز تھا۔ اس کی آبادی کا اندازہ اس سے لگانا چاہیے کہ سنہ ۲۸۰ھ میں خلیفہ معتمد عباسی کے زمانہ میں یہاں ایک زلزلہ آیا تھا جس

---

[۱] فرشتہ دوم صفحہ ۳۱۷ (نولکشور) [۲] آئین اکبری (سندھ) [۳] تاریخ فیروز شاہی شمس سراج عفیف (کلکتہ) ص ۲۴۱ [۴] کتاب الانساب طبع فوٹو گراف لفظ ''دیبلی''۔

میں بہت سی عمارتیں گر گئی تھیں۔ اس سانحہ میں جو آدمی مکانات کے نیچے دب کر مر گئے، ان کی تعداد ڈیڑھ لاکھ تھی۔[۱] بشاری (سنہ ۳۷۵ھ) نے لکھا ہے کہ ''اس کے آس پاس ایک سو گاؤں ہیں۔ تعداد زیادہ ہندوؤں کی ہے۔ سب لوگ بیوپاری اور سوداگر ہیں، ان کی زبان سندھی اور عربی ہے۔ یہاں کی آمدنی بہت ہے''۔

عسیفان

بلاذری نے اس کا مقام ملتان کشمیر اور کابل کے بیچ میں بتایا ہے جو شاید زیادہ صحیح نہ ہو، البتہ سندھ میں اس کے مماثل نام ملتے ہیں۔

ڈاکٹر آرنلڈ کو بھی دعوت اسلام لکھتے وقت اس کا پتہ نہ مل سکا۔[۲] اور مولانا شبلی مرحوم کے ذریعہ سے اس کی تحقیقات بھی کی۔[۳] لیکن میرا قیاس ہے کہ اس نام کی اصلیت، ''اسیوان'' ہے جس کو سیوان بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس نام کے شہر دہلی اور سندھ کے بیچ میں ہے فارسی تاریخوں میں بھی یہ نام آیا ہے۔[۴] سیہوان کا ذکر ابن بطوطہ نے بھی کیا ہے اور اب یہ کراچی کے ضلع میں ہے۔ بعضوں نے سیوستان اور سیوان کو ایک قرار دیا ہے۔ بہر حال تیسری صدی ہجری کے شروع میں (معتصم المتوفی سنہ ۲۲۷ھ کے عہد میں) یہاں مسلمان سوداگروں کی آبادی تھی۔[۵]

تنبلی

تنبلی نام بھی سندھ میں ایک مقام تھا، سنہ ۳۷۵ھ میں یہاں بھی کچھ مسلمان آباد تھے۔[۶]

بوقان

بلاذری نے سندھ کے ایک مقام بوقان (یا بوکن) کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ ہمارے زمانہ میں یہاں کے باشندے سب مسلمان ہیں۔[۷] اس کا زمانہ تیسری صدی ہجری کا اخیر ہے۔

---

۱ تاریخ الحفاظ سیوطی مطبوعہ کلکتہ صفحہ ۳۸۰۔ ۲ دعوت اسلام ص ۲۹۱ ۳ مکاتیب شبلی جلد دوم ص ۱۷
۴ خزائن الفتوح امیر خسرو۔ ۵ بلاذری ص ۴۴۶ ۶ بشاری ص ۴۸۰۔ ۷ بلاذری ص ۴۴۵

قصدار

بعض لوگوں نے اس کا نام قزدار بھی لکھا ہے۔ سبکتگین غزنوی کے فتوحات میں اس شہر کا نام ملتان ہے۔[۱] یہ ہندوستانی افغانی سرحد کے پاس واقع تھا، یہاں خارجی مسلمانوں کی آبادی تھی اور انہیں کی ریاست بھی تھی۔ شاید چوتھی صدی کے وسط میں ایک معتزلی متکلم اور مناظر ابوالحسن علی بن لطیف جب یہاں پہنچے تو اس کو خارجیوں کی آبادی اور ریاست پایا۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ یہاں اس قدر امن وامان ہے کہ چوری کا نام ونشان بھی نہیں ہے۔ لوگ گھروں میں قفل بھی نہیں لگاتے۔ مسجد میں کوئی مسافر یوں ہی اپنا اسباب چھوڑ دے تو کوئی اس کا چھونے والا نہیں۔ یہاں ان کی ملاقات ایک مسلمان درزی سے ہوئی۔ شہر میں مسجد بھی تھی۔[۲] بشاری نے اس کا موقع یہ بتایا ہے کہ وہ بلوچستان کی بندرگاہ تیز سے ساحل پر مکران کی لمبائی میں ۱۲ منزل پر واقع ہے۔[۳] ایک اور عرب جغرافیہ نویس کہتا ہے کہ ''وہ ملتان سے تقریباً ۲۰ منزل ہے''۔[۴]

ابن حوقل (سنہ ۳۶۸ھ) کہتا ہے کہ قزدار ایک شہر ہے جس کے ساتھ چند قصبے اور دیہات ہیں اور یہاں کے حاکم کا نام معین بن احمد ہے لیکن خطبہ خلیفہ (بغداد) کے نام کا پڑھا جاتا ہے اور اس کا محل بالکزنان میں واقع تھا۔ بشاری مقدسی جو سنہ ۳۷۵ھ میں ادھر آیا تھا کہتا ہے:-

> ''قزدار طوران کا پایہ تخت ہے۔ یہ ایک صحرا میں واقع ہے۔
> اس کے دو حصے ہیں، دونوں کے بیچ میں ایک ترائی ہے جس میں پل نہیں۔
> ایک میں سلطان کا محل ہے اور اسی میں قلعہ ہے۔ دوسرے حصہ کا نام

---

[۱] طبقات ناصری ص ۷ (کلکتہ) [۲] معجم البلدان یاقوت رمی ج ۷ ص ۸۷ (مصر) [۳] احسن التقاسیم ص ۴۸۵ [۴] تقویم البلدان ابوالفدا ص ۳۴۹۔

بودین ہے ۔ اس میں سوداگروں کے مکانات ہیں اور یہ حصہ نہایت صاف ستھرا ہے، شہر چھوٹا ہے مگر فائدہ مند ہے ۔ خراسان، فارس، کرمان اور ادھر سے ہندوستان کے شہروں سے لوگ یہاں آیا کرتے ہیں ۔ لیکن یہاں کا پانی اچھا نہیں..... پانی نہر سے پیا جاتا ہے'' ۔[1]

غرض یہ ایک چھوٹی سی اسلامی ریاست تھی ۔ سلطان محمود کے باپ امیر سبکتگین نے ہندوستان سے پہلے سرحدی ریاستوں کو مٹانا ضروری سمجھا، چنانچہ سنہ ۳۷۵ھ اور سنہ ۳۸۷ھ (جو سبکتگین کی تاریخ وفات ہے) کے بیچ کے کسی سنہ میں اس شہر پر قبضہ کیا اور وہاں کے مسلمان حاکم کو اپنا باجگذار بنایا ۔[2]

طوران

ابن حرقل کے زمانہ میں (سنہ ۳۶۳ھ) یہ ایک مستقل ریاست تھی، چنانچہ وہ کہتا ہے کہ مغربی سندھ میں طوران ہے جس پر بصرہ کا ایک باشندہ ابوالقاسم حکمراں ہے جو خود ہی حاکم قاضی سپہ سالار سب کچھ ہے حالاں کہ وہ تین اور دس میں فرق نہیں جانتا۔

ویہند

یہ ہندوستان کا مشہور پرانا شہر ہے ۔ غزنوی فتوحات کے سلسلہ میں اس کا بھی نام آتا ہے ۔ سنہ ۳۹۳ھ میں پشاور کے بعد محمود نے اس پر قبضہ کیا ۔[3] اس شہر میں بھی محمود سے پہلے ہی مسلمانوں کی آبادی تھی ۔ بیرونی نے قانون مسعودی میں اس کے ذکر میں لکھا ہے کہ ''یہ قندھار کا پایہ تخت ہے اور یہ وادی سندھ میں واقع ہے'' ۔[4] ونسنٹ اے اسمتھ صاحب ''دی ارلی ہسٹری آف انڈیا'' میں اوہند نام دارالسلطنت کو دریائے سندھ پر جگہ دیتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ مسلمانوں کے سنہ ۲۵۶ھ میں کابل فتح کر لینے کے بعد وہاں کا دارالسلطنت

---

[1] بشاری کی احسن التقاسیم ص ۴۷۸ (لیڈن) [2] تاریخ فرشتہ نولکشور جلد ا ص ۱۹۔۳ زین الاخبار گردیزی (مطبوعہ برلن) ص ۶۶ [3] تقویم البلدان ابوالفدا ص ۳۵۷ (پیرس سنہ ۱۸۴۰ء)۔

اوہند کو منتقل ہو گیا جو دریائے سندھ پر واقع تھا اور ہندو شاہیہ خاندان کا پایہ تخت تھا۔[۱]

چوتھی صدی کے آخر میں (سنہ ۳۷۵ھ یعنی محمود کے حملہ کے پندرہ سولہ برس پہلے) بشاری مقدسی بیان کرتا ہے کہ ''میں نے ابوالہیثم نیشاپوری کے شاگردوں میں سے ایک سے اور شیراز کے ایک عالم سے جو اس ملک کی اچھی طرح سیاحت کر چکے تھے تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ ویہند و پایہ تخت کا نام ہے اور اس کے ماتحت شہر ودھان، بتیر، نوج نوار، اور سمان کوج وغیرہ ہیں''۔[۲]

ویہند کے علاقہ میں بھی مسلمانوں کی آبادی خاصی تھی یہاں تک کہ ان کی ریاست قائم تھی۔ ہندوؤں کا راجہ الگ تھا اور مسلمانوں کا امور الگ۔ باشندوں کی غالب تعداد ہندو تھی۔[۳]

قنوج

ہندوستان کے مشہور قنوج کو چھوڑ کر سندھ اور پنجاب کی سرحد کے پاس بھی اس نام سے ایک علاقہ آباد تھا جس کا عرب سیاحوں نے بکثرت ذکر کیا ہے۔ یہاں بھی مسلمانوں کی آبادی تھی۔ سنہ ۳۰۰ھ کے بعد یہ شہر مسلمانوں کے قبضہ میں آ گیا تھا۔ چنانچہ مسعودی نے (سنہ ۳۰۳ھ میں) جب اس کو دیکھا ہے تو وہ ملتان سے ملحق تھا اور اسلامی حکومت میں داخل تھا۔[۴] بشاری اس کے ستر پچہتر برس کے بعد آیا ہے۔ اس وقت اس کی حیثیت خود مختار ریاست کی تھی، کہتا ہے کہ یہ بڑا شہر ہے، اس کی چاروں طرف فصیل ہے۔ یہاں گوشت کثرت سے بکتا ہے، باغ بہت ہیں، پانی اچھا ہے، تجارت وسیع ہے، لوگ حسین ہیں، شہر پناہ کے اندر جامع مسجد ہے، مسلمانوں کی غذا گیہوں ہے، یہاں بڑے بڑے معززین اور علماء رہتے ہیں۔[۵] آگے چل کر کہتا ہے کہ یہاں کے باشندوں کی گو غالب تعداد ہندو ہے لیکن مسلمانوں کا

---

[۱] The Early History of India, Vol I p. 845 [۲] احسن التقاسیم ص ۴۷۷۔

[۳] ایضاً ص ۴۸۵ مع حاشیہ [۴] مسعودی جلد ۱ ص ۳۷۲ (پیرس) [۵] احسن التقاسیم بشاری ص ۴۸۰۔

سلطان الگ ہے۔[1]

اودھ کے قنوج سے بھی عرب کے سیاح اور جغرافیہ نویس واقف تھے۔ مصر کا وزیر مہلبی (تقریباً سنہ ۳۸۶ھ) اپنے جغرافیہ کی کتاب عزیزی میں بیان کرتا ہے کہ ''قنوج ہندوستان کے دور ترین شہروں میں ہے، ملتان کے پورب ہے، ملتان اور قنوج کے بیچ میں دوسو بیاسی فرسنگ کی مسافت ہے اور وہ ہندوستان کا پایہ تخت اور سب سے بڑا شہر ہے۔ لوگوں نے اس کا حال بیان کرنے میں بہت مبالغہ سے کام لیا ہے۔ کہتے ہیں اس میں صرف جوہریوں کے تین سو بازار ہیں اور اس کے راجہ کے قبضہ میں ڈھائی ہزار ہاتھی ہیں۔ اس میں سونے کی کانیں بھی ہیں''۔

ادریسی جس نے سسلی (اٹلی) میں بیٹھ کر سنہ ۵۴۸ھ میں اپنا جغرافیہ لکھا ہے کہتا ہے کہ ''یہ بہت خوبصورت شہر ہے، تجارت کی منڈی ہے۔ اسی شہر کے نام سے یہاں کے راجہ کو بھی قنوج کہتے ہیں''۔ ادریسی نے قنوج کی وسعت پنجاب بلکہ کشمیر تک بتائی ہے۔ مراکو کا جغرافیہ نویس ابن سعید مغربی (سنہ ۵۸۵ھ) لکھتا ہے ''یہ شہر گنگا کے دونوں بازووں پر واقع ہے''۔[2]

نیرون

سندھ کے ساحلی شہروں میں ایک شہر نیرون نام تھا، بعضوں نے غلطی سے اس کو بیرون پڑھا ہے اور ابوریحان بیرونی کو یہیں کا رہنے والا بتایا ہے۔[3] یہ دیبل اور منصورہ کے بیچ میں تھا اور منصورہ سے ۱۵ فرسنگ دور تھا۔ مصر کا وزیر مہلبی چوتھی صدی میں اپنے جغرافیہ میں لکھتا ہے کہ ''یہاں کے باشندے مسلمان ہیں''۔[4] الفنسٹن صاحب نے تاریخ ہند میں بتایا ہے کہ موجودہ شہر حیدرآباد (سندھ) ہی کا پرانا نام نیرون ہے۔[5]

---

[1] بشاری ج ا ص ۲۸۵ [2] تقویم البلدان ابوالفدا صفحہ ۳۶۰ (پیرس) [3] ایضاً ص ۳۴۹ بحوالہ ابن سعید مغربی و تاریخ الاطبا ابن ابی اصیبعہ جلد ۲ ص ۲۰ (مصر) [4] ایضاً ص ۳۴۹ [5] تاریخ ہند الفنسٹن جلد دوم ص ۴۹۳ سنہ ۱۸۶۷ء (علی گڑھ)

مکران

یہ سندھ کی سرحد پر واقع ہے۔ابن حرقل کے زمانہ میں یہاں کا عرب حاکم عیسیٰ بن معدان تھا،اس کی دارالامارۃ کا نام کنیر تھا جس کی وسعت ملتان سے آدھی تھی۔

مشکی

اس کے قریب ایک اور عرب ریاست تھی جس کا نام مشکی تھا اور جہاں کا حاکم ابن حرقل کے زمانہ میں مظاہر بن رجاء نام تھا۔ یہ ریاست اتنی بڑی تھی کہ تین دن میں اس کی مسافت طے ہوتی تھی اور یہاں خطبہ میں خلیفہ بغداد کا نام لیا جاتا تھا۔

سندھ کے ریگستانوں میں چلتے چلتے ہم اور آپ دونوں گھبرا گئے۔تھوڑی دیر آیئے ملک ''جنت نظیر'' کی سیر کریں کہ دماغ تر و تازہ ہو۔

کشمیر

یہ وہ ملک ہے جس کی نسبت یہ کہنا بجا ہے کہ اس کو مسلمان بادشاہوں کی تلواروں اور تدبیروں نے نہیں بلکہ مسلمان عالموں اور درویشوں کی تاثیروں نے فتح کیا۔عرب جغرافیہ نویس اور سیاح اس کے پاس تک آئے مگر اس کے اندر نہیں گئے۔انہوں نے اس کے راستہ کی دشواریوں کا ذکر کیا ہے، وہ سمندر سے لے کر کشمیر کے سلسلہ کوہستان تک سب کو سندھ ہی کہتے تھے۔عربوں کے بعد سلطان محمود نے بھی اس کی چٹانوں سے سر ٹکرایا مگر کامیابی نہیں ہوئی۔لیکن اسی زمانہ میں ہم یہاں مسلمان سوداگروں اور تاجروں کو آتے جاتے دیکھتے ہیں۔سلطان محمود کی وفات کے تین سال بعد سنہ ۴۲۴ھ میں سلطان محمود غزنوی نے اس پر حملہ کیا اور اہل شہر قلعہ بند ہو گئے تو اس وقت جو مسلمان تاجر وہاں تھے وہ بھی قلعہ میں مقید تھے۔[1]

تاریخ ہند کی اس مختصر خیالی سیر و سیاحت کے بعد ہم ناظرین سے رخصت ہوتے ہیں۔

---

[1] فرشتہ جلد اول ص ۴ (نولکشور)

خلاصہ

ان گذشتہ اوراق میں کوشش کی ہے کہ ہم اپنے ہم سفروں کو عرب و ہند اور اسلام و ہندوستان کے باہمی تعلقات کے وہ مناظر دکھائیں جو خیبر سے آنے والے مسلمان فاتحین سے پہلے یہاں جلوہ گر تھے۔ ان سے اندازہ ہوگا کہ ان فتوحات سے پہلے بھی اس ملک میں کہاں کہاں مسلمان آباد تھے اور ان کے تعلقات ہندوؤں کے ساتھ کیسے چند در چند اور گہرے تھے اور اسلام کا تعلق ہندوستان سے کتنا پرانا اور قدیم ہے۔

ما قصہ سکندر و دارا نہ خواندہ ایم
از ما بجز '' حکایت مہر و وفا '' میرس

ضمیمہ

کتاب کے ختم ہونے کے بعد بعض اور مفید باتیں ملیں جن کا اضافہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

۱۔ سوپارہ

گجرات کے ایک مشہور پرانے شہر کا نام عربوں نے سوبارہ لکھا ہے۔ اصطخری (سنہ ۳۴۰ھ) ہندوستان کے مشہور شہروں میں اس کا بھی ذکر کیا ہے اور اس کے بعد بیت المقدس کے سیاح بشاری (سنہ ۳۷۰ھ) نے چوتھی صدی ہجری کے آخر (دسویں صدی عیسوی کے آخر) میں اس کا نام لیا ہے اور اس کی جگہ کھنبایت کے قریب بتائی ہے اور دونوں میں چار مرحلوں کا فصل بتایا ہے اور کہتا ہے کہ ''سوپارہ سمندر سے ایک فرسنگ (۸ میل) کی دوری پر ہے۔'' (احسن التقاسیم بشاری ص ۴۷۷ و ۴۸۶ لیڈن)

پچھلے سالوں میں گجرات میں جو پرانی یادگاروں کی تحقیقات ہوئی ہے ان میں ایک سوپارہ نام کے شہر کا بھی پتہ چلتا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ وہی شہر ہے جس کا عرب سیاحوں نے اپنے زمانہ میں ذکر کیا ہے۔

۲ر فروری سنہ ۱۹۳۰ء کے سنڈے بمبئی کرانیکل میں (ص ۳۱ و ۳۲) سوپارہ کی اثری تحقیق پر ایک مضمون نکلا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے:-

''آثار قدیمہ کی تحقیقات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس شہر کا پتہ مگدھ دیش (بہار) کے مشہور راجہ اشوک کے زمانہ سے چلتا ہے۔ یہاں راجہ اشوک کا ایک یادگاری پتھر سنہ ۱۸۸۱ء میں ہمارے انہی محققوں کو ملا ہے۔ سیپارہ اب بھی بی بی سی آئی ریلوے ایک غیر

معروف اسٹیشن کا نام ہے جو اپنے قریب کے اسی نام کے ایک گاؤں کے سبب سے رکھا گیا ہے۔ پنڈت بھگوان لال اندر جی (آنجہانی) نے یہاں اشوک کے سنگی کتبہ کا پتہ لگایا تھا۔ اب یہ مقام بمبئی کے علاقہ میں بسین سے جو سمندر ہی کے کنارے ہے تین چار میل اُتر اور خاص شہر بمبئی سے تیس میل ہے۔

سنہ ۲۵۰ ق م میں یہ مقام ہندوستان کے مشہور و پر رونق شہروں سے تھا جس کے سبب سے یہ ان چند خوش قسمت شہروں میں منتخب ہوا جہاں راجہ اشوک نے اپنے یادگاری پتھر لگائے۔ سوپارہ والا پتھر یہاں سے اٹھ کر پرنس آف ویلز میوزیم (مغربی ہند) میں رکھا گیا ہے۔ اس میں دس سطریں ہیں۔ پہلی چار سطریں مٹ گئی ہیں، اس کا خط وہ خط ہے جو دیوناگری اور دوسرے ہندی حروف کی اصل ہے اور جس کے متعلق یوروپین محقق بوشلر کی رائے ہے کہ یہ تجارتی آمد و رفت کی راہ ہے۔ مسیح سے سات آٹھ سو برس پیشتر عراق سے ہندوستان آیا تھا۔ (دیکھو کتاب میں)

ڈاکٹر بھنڈارکر کہتے ہیں کہ بمبئی میں ٹھاٹھ کے ضلع میں سوپارہ مشہور بندرگاہ تھا، جس کا نام مہابھارت میں سورپارکا ہے اور بطلیموس نے اپنے جغرافیہ میں اس کا نام سوپارہ لکھا ہے۔ یہ ایک مقدس مقام اور اپارنتا کا دارالحکومت تھا۔

موجودہ سوپارہ گاؤں اسی نام کے قدیم مشہور شہر کے موقع پر آباد ہے۔ یہ ایک خلیج کے بائیں کنارہ پر واقع ہے جو خلیج بسین کے ریلوے پل اور دریائے وٹرنا کے درمیان گھومتی نظر آتی ہے۔ پرانے سوپارہ میں اب بھی پرانے عمارات اور مکانات کے نشانات باقی ہیں۔ یہاں ایک رام کنڈ بھی ہے جو اس کے تیرتھ ہونے کی دلیل ہے۔

سنہ ۱۸۸۱ء میں جب سوپارہ کے یادگاری پتھر کا پتہ لگا ہے اسی گاؤں میں بمشکل چھ سو گھر تھے۔ جن میں تقریباً دو ہزار آدمی رہتے تھے۔ ان میں برہمن، ہندوستانی عیسائی اور مسلمان باشندے ہیں۔ مسلمانوں میں عرب اور ایرانی ہیں جو سات صدی پیشتر سے تجارتی

تعلق سے یہاں آباد ہوئے۔

اسی خلاصہ سے معلوم ہوگا کہ گجرات کے دوسرے ساحلی تجارتی شہروں کی طرح یہاں بھی مسلمان آباد تھے اور اگر راجہ اشوک کے سنگی کتبہ اور بطلیموس کے جغرافیہ سے اس آبادی کا مسیح سے ڈھائی سو برس پہلے نشان ملتا ہے تو مسلمان عرب سیاحوں کے بیان سے اس کا مسیح سے ایک ہزار برس بعد بھی پتہ چلتا ہے۔

۲۔ جاٹ طبیب عرب میں

اصل کتاب میں صحابہ کے زمانہ میں یعنی پہلی صدی ہجری اور ساتویں صدی عیسوی میں جاٹوں کے عراق اور عرب میں آباد ہونے کا ذکر آیا ہے (ص ۱۱) مگر اس مقام پر ان کے سپاہیانہ اوصاف لکھے گئے ہیں۔ مگر ایک نہایت مستند ذریعہ سے اسی زمانہ میں ان کے ایک علمی کارنامہ کا بھی نشان ملتا ہے۔ امام بخاری (المتوفی سنہ ۲۵۶ھ نے اپنی کتاب الادب المفرد میں صحابہ کے زمانہ کا ایک واقعہ لکھا ہے کہ ایک دفعہ ام المومنین حضرت عائشہؓ بیمار پڑیں تو ان کے بھتیجوں نے ایک جاٹ طبیب کو ان کے علاج کے لئے بلایا۔[۱]

۳۔ سندھ کے شاہانہ جوتے

کتاب کے ص ۷۷ میں کھمبایت کے جوتوں کا ذکر ہے جو منصورہ (سندھ) سے عراق کے عباسی پایۂ تخت بغداد میں جاتے تھے۔ ابھی حال میں امام احمد بن حنبل (المتوفی سنہ ۲۴۱ھ) کی ایک مختصر کتاب الورع ایک سات سو برس کے قلمی نسخہ سے جو الجزائر (الجزیریا) میں ملا ہے۔ سندھ ۱۳۴۰ھ میں مصر میں چھپا ہے، یہ ثابت ہوتا ہے کہ سندھ کے جوتے اس قدر خوشنما اور بھڑکدار ہوتے تھے کہ ثقہ اور سنجیدہ لوگ ان کو پہننا پسند نہیں کرتے تھے اور وہ صرف شہزادوں کے پہننے کے قابل سمجھے جاتے تھے۔[۲]

---

[۱] الادب المفرد امام بخاری، باب بیع الخادم، ص ۳۵، مصر [۲] کتاب الورع ابن حنبل، باب لیس النعال السندیہ ص ۱۰۱، مطبع سعادت، مصر۔

www.KitaboSunnat.com

Arab-o-Hind Ke Taalluqat

Maulana Syed Sulaiman Nadvi

Darul Musannefin Shibli Academy
Azamgarh, U.P.

ISBN : 978-93-80104-50-8